DECEMBER 2011

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

کہنی سُننی مدیر 14
کرن کرن روشنی ادارہ 15
ہمارے نام نادرہ خاتون 270

آپ سے

بادشاہت کی تلاش میں [illegible] 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے امت الصبور 266

[illegible] سے ملیے

باتیں زرکمالی سے شاہین رشید 24

انٹرویو

عائزہ خان شاہین رشید 28

ناول

چراغ آخرِ شب رفعت ناہید 36
میرے خواب لوٹادو نگہت عبداللہ 126

مکمل ناول

جو بچے ہیں فرحت اشتیاق 170
اب محبت کرنی ہے راشدہ رفعت 84

ناولٹ

سفال گر بشریٰ سعید 146
میزان نیم آمنہ 208

افسانے

فیس بک فاخرہ جبیں 58
چاہ اور وہ کا پھندا شاہین ملک 64
دو کوڑی کی سمیرا حمید 74
عام سی لڑکی قرۃ العین چیما 204
احساس نعیمہ ناز 53

نظمیں غزلیں

غزل فیض احمد فیض 260
نظم فیض احمد فیض 260
غزل ظریف احسن 261
غزل حمیدہ شاہین 261

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

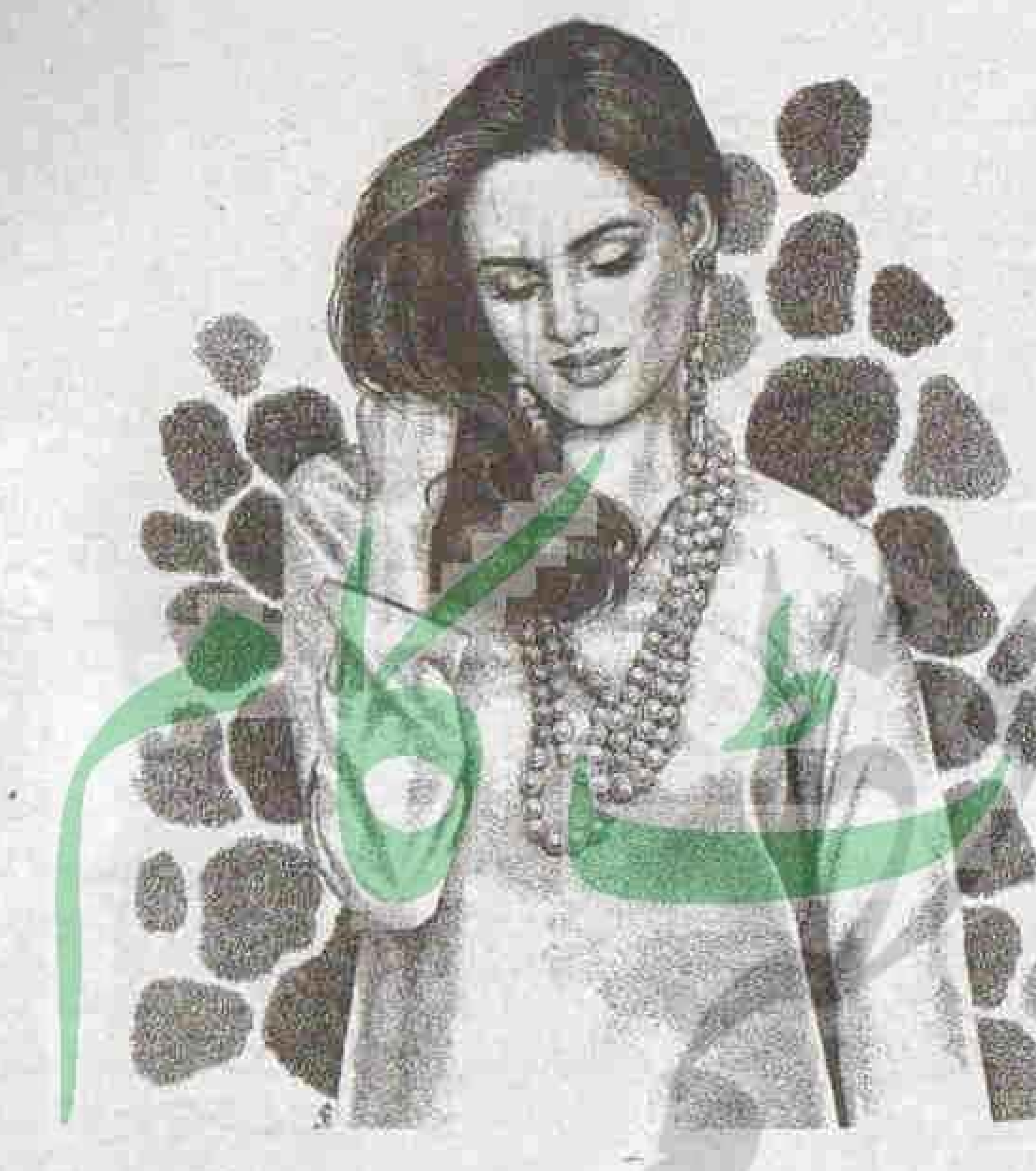

رنگا رنگ پھول

رنگا رنگ سلسلہ شگفتہ جاہ 262
خبریں وبریں تعبیر نشاط 285
روشن حرف روشن ہاشم 279

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے خالدہ جیلانی 268

پکوان

آپ کا باورچی خانہ مہرِ خشاں حلیم 280
موسم کے پکوان خالدہ جیلانی 282

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان 288

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور 290

دسمبر 2011
جلد 39 شمارہ 8
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وقت کا تند و تیز دھارا ہر شے کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ ابھی سال کا آغاز ہوا تھا کہ اختتام آ پہنچا۔ پلک جھپکتے سال بیت گیا۔ وقت کو جیسے پر لگ گئے۔ اس تیزی سے گزرتا یہ وقت ہی انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے اور حیرت کی بات ہے کہ انسان اسی قیمتی شے سے ہی سب سے زیادہ غافل ہے جبکہ اس کے لیے جواب دہ ہونا ہوگا کہ وقت کن کاموں میں صرف کیا۔

نئے اسلامی سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ محرم الحرام اسلامی تاریخ کا پہلا مہینہ ہے۔ دس محرم وہ تاریخ ہے جب نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ دولت اور اقتدار کی جنگ نہیں تھی، حکومت کی طلب نہ تھی۔ امام عالی مقام نے حکومت وقت کا بگاڑ اور خلافت کو ملوکیت میں بدلتے دیکھ کر اس کے خلاف آواز بلند کی۔ حق کے لیے اپنی اور اپنے اہل خاندان کی قربانی دے کر نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ میں ہمیشہ کے لیے یہ حقیقت رقم کر دی کہ کثرت حق کی دلیل نہیں ہے۔

رواں سال کی آخری ساعتوں میں اللہ کے حضور پاکستان کی سلامتی کے لیے دعا کیجیے۔ آنے والا سال ہمارے ملک کے لیے بہتری لے کر آئے۔ آمین۔

سالِ نو نمبر

جنوری کا شمارہ حسب روایت سالِ نو نمبر ہوگا۔ سالِ نو نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے سروے بھی شامل ہے۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ کچھ لوگ زندگی کے نشیب و فراز کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت سے دوسروں کو حوصلہ ملتا ہے۔ کوئی ایسی شخصیت یا کردار جس نے آپ کو متاثر کیا۔ یا ان کی کسی اچھی بات یا نصیحت نے آپ کی رہنمائی کی؟
2۔ اس سال آپ نے اپنا فارغ وقت کس طرح گزارا؟ مطالعہ، ٹی وی، دوست احباب سے گپ شپ یا گھومنا پھرنا؟
3۔ فارغ اوقات میں آپ کی بہترین تفریح یا مشغلہ؟ کون سی چیز سب سے زیادہ خوشی دیتی ہے؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں پچیس دسمبر تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول ۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
- راشدہ رفعت کا مکمل ناول ۔ اب محبت کرنی ہے،
- نایاب جیلانی کا مکمل ناول ۔ بادلوں کے پیچھے،
- بشریٰ سعید اور نسیم آمنہ کے ناولٹ،
- فاخرہ جبیں، شاہین ملک، قرۃ العین حنا، نعیمہ ناز اور سمیرا حمید کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ عائزہ خان سے ملاقات،
- باتیں رنگ کالی سے،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کا پرچا ہے۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ خط لکھ کر یا بذریعہ ای میل اپنی رائے سے نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

جس شخص کو اہمیت نہیں دی جاتی

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا میں تجھے جنت کے بادشاہ نہ بتاؤں؟ (ہر) ضعیف آدمی، کمزور سمجھا جانے والا (لوگ اسے کمزور سمجھیں اور اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔) دو پرانے کپڑوں میں ملبوس۔ (لیکن اللہ کے ہاں اتنا بلند مقام ہے کہ) اگر اللہ کے نام سے قسم کھا لے تو وہ اس کی قسم پوری کر دیتا ہے۔“

حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا میں تمہیں جنت والے نہ بتاؤں؟ ہر ضعیف آدمی، کمزور سمجھا جانے والا (جنتی ہے) کیا میں تمہیں جہنم والے نہ بتاؤں؟ ہر درشت خو، زر پرست، متکبر (جہنمی ہے۔)“

فوائد و مسائل : ○ ”کمزور سمجھا جانے والا“ سے مراد شریف النفس آدمی ہے، جو کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی زیادتی کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ لوگ اسے کمزور سمجھتے ہیں، اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے اور نہ اس کے شر وغیرہ ہی کا کوئی خوف ہوتا ہے۔

○ انفرادی معاملات میں نرمی اور درگزر کا چلن عام ہو جائے تو معاشرہ امن کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ فساد ہمیشہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی اپنی مالی، جسمانی یا خاندانی اور افرادی طاقت پر گھمنڈ کر کے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ اگر وہ کسی پر زیادتی نہ کرے، خواہ اسے کمزور سمجھا جائے تو یہ اعلا اخلاق کا نمونہ ہے جس کا ثواب جنت ہے۔

○ درشت خو سے مراد بات چیت کے انداز میں اور برتاؤ میں سختی اختیار کرنے والا ہے۔ اس قسم کے

بداخلاق آدمی سے ہر کسی کا جھگڑا ہوتا ہے جس سے فساد جنم لیتا اور بڑھتا ہے۔

○ جواظ کا مطلب الجموع المنوع بیان کیا گیا ہے، یعنی ایسا حریص آدمی جو مال جمع کرتا رہتا ہے لیکن بخیل بھی ہے خرچ نہیں کرتا۔ مومن میں حرص اور بخل کی عادتیں نہیں ہوتیں بلکہ یہ منافقوں اور کافروں میں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

○ تکبر سے مراد دوسرے کو حقیر سمجھنا اور حق واضح ہو جانے کے باوجود تسلیم نہ کرنا ہے۔ یہ برتری کا احساس بہت سی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے۔

قابل رشک مومن

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل رشک وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا (کم آمدنی والا) ہو، اسے نماز سے وافر حصہ ملا ہو (نفلی نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گمنام ہو، اس کی پروا نہ کی جاتی ہو، اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو (اتنا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے (مزید کا لالچ نہ کرے) اسے جلدی موت آجائے، اس کا ترکہ تھوڑا ہو، اور اسے رونے والیاں بھی کم ہوں۔"

حضرت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سادگی ایمان میں سے ہے۔"

راوی نے کہا "سادگی سے مراد معمولی لباس وغذا پر اکتفا کرنا ہے۔"

فوائد و مسائل :

○ مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ سنن ابی داؤد کی تحقیق میں اسے حسن قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں شیخ البانی رحمتہ اللہ نے اس حدیث پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اسے حسن قرار دیا ہے۔ بنابریں تحسین حدیث والی رائے ہی درست معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے فاضل محقق نے اسے ایک جگہ حسن قرار دیا ہے۔

○ **تکلفات** سے پرہیز ایمان کا جز ہے، لہٰذا سادہ عادات کا حامل عام نعمت پر بھی اللہ کا شکر کرتا ہے جب کہ زیب و زینت کا عادی بعض اوقات ایک بڑی نعمت کو بھی اپنے معیار سے کم تر سمجھتا ہے اور شکر کے بجائے شکوہ کرنے لگتا ہے۔

○ سادگی میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، **مثلاً** "پیوند لگا کپڑا پہن لینا، زمین پر بیٹھ جانا، مفلس اور غریب کی بات سننے اور حتی الوسع مدد کرنے کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھنا، غریب کی معمولی دعوت قبول کر لینا اور اس کا پیش کیا ہوا سادہ کھانا کھا کر احسان مندی کا اظہار کرنا۔ ملازموں سے تحقیر آمیز رویہ رکھنے سے اجتناب کرنا، اپنے سے کم تر درجے کے لوگوں کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا وغیرہ۔

بہترین افراد

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپؐ فرما رہے تھے۔

"کیا میں تمہیں تمہارے بہترین افراد کی نشان دہی نہ کروں؟"

صحابہؓ نے عرض کیا۔

"کیوں نہیں اللہ کے رسول!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تمہارے بہترین افراد وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔"

تنگ دستی کی فضیلت

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ ہم تو (اپنی معلومات کے مطابق) یہ کہتے ہیں یہ شخص معزز (دولت مند) افراد میں سے ہے۔ اس کے بارے میں یہی توقع ہے کہ اگر (کسی گھرانے میں) نکاح کا پیغام دے تو اس کا پیغام قبول کیا جائے، اگر (کسی کی) سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات سنی جائے (اور اسے اہمیت دی جائے۔)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ (پھر) ایک اور آدمی گزرا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

انہوں نے کہا۔ "اللہ کے رسول! قسم ہے اللہ کی! ہم تو کہتے ہیں کہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں توقع ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اسے رشتہ نہ دیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے۔ اگر بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ (غریب مسلمان) اس (پہلے) شخص جیسے زمین بھر آدمیوں سے بہتر ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ غریب مسلمان اگرچہ گمنام ہو، دنیا والوں کی نظروں میں اس کا کوئی مقام نہ ہو لیکن اللہ کے ہاں ایسا ایک آدمی بھی دنیا بھر کے ان انسانوں سے بہتر ہے جو ایمان و تقویٰ سے محروم ہوں۔

○ اللہ کے ہاں اصل اہمیت اور قدر و منزلت ایمان و تقویٰ کی ہے، نہ کہ مال و دولت، شان و شوکت، ذات برادری اور نام و نسب کی۔

○ نکاح کے لیے نیک مردوں اور نیک عورتوں کا انتخاب کرنا چاہیے، خواہ وہ غریب ہی ہوں۔ غریب نیک آدمی امیر نیک آدمی کا ہم پلہ ہے لیکن بد عقیدہ یا بری عادتوں والا دولت مند شخص نیک آدمی کا ہم پلہ نہیں۔

اللہ کی محبت

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ اپنے مومن، تنگ دست، سوال سے بچنے والے، بال بچوں والے بندے سے محبت فرماتا ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نادار مومن دولت مندوں سے آدھا دن یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔"

فوائد و مسائل :

○ اللہ کے ہاں ہزار سال کی مدت ایک دن کے برابر ہے۔ اس لیے دولت مندوں سے آدھا دن پہلے جنت میں جانے کا مطلب دنیا کے حساب سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہونا ہے۔

○ پہلے جنت میں جانا ان کے بلند درجات کو ظاہر کرتا ہے، اور انہیں محشر کی مشکلات بھی کم برداشت کرنی پڑیں گی۔

○ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دولت مندوں کو اپنی زیادہ دولت کی آمد و خرچ کا حساب دینا پڑے گا جس میں کافی وقت صرف ہو گا جب کہ غریب لوگ اپنی تھوڑی کمائی کے حساب سے تھوڑی دیر میں فارغ ہو جائیں گے۔

○ دنیا میں دولت کم ملنا یا نہ ملنا بھی اللہ کی ایک نعمت ہے لیکن اس کے ساتھ صبر ضروری ہے جس طرح زیادہ دولت کے ساتھ شکر ضروری ہے۔

زیادہ مال رکھنے والوں کا بیان

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زیادہ مال رکھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے مگر جس نے مال کو اس طرح، اس طرح، اس طرح اور اس طرح (خرچ) کیا۔"

یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر طرف ایک بار) اشارہ فرمایا۔

فوائد و مسائل :

○ مال حرص اور بخل کے ذریعے سے جمع ہوتا ہے اور یہ دونوں مذموم خصلتیں ہیں۔

○ جائز طریقے سے کمایا ہوا مال بھی اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ضروری ہے، اپنی ذاتی آسائشات اور تعیشات پر مال صرف کرنا درست نہیں۔

○ سخاوت کرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مال اس کے لیے نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جس قدر زیادہ خرچ کرے گا، اتنا ہی جنت میں بلند درجات کا مستحق ہو گا۔

فائدہ : سخاوت سے اس شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے جس کی کمائی حلال ہو، لہٰذا حرام کمائی سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

زیادہ مال

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تیسری رات آئے اور (اس وقت بھی) اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو، مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال رکھوں۔"

فوائد و مسائل :

○ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا بیان اور امت کے لیے ترغیب ہے۔

○ احد ایک بڑا پہاڑ ہے، اتنا سونا دو تین دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ اگر اتنا مال بھی ہو تو وہ بھی دو تین دن میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا جائے۔

○ قرض کی ادائیگی قرض خواہ کا حق ہے، اس کی ادائیگی سخاوت سے اہم ہے۔

○ قرض لینا دینا جائز ہے لیکن قرض لیتے وقت یہ نیت ہونی چاہیے کہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے گا۔

○ سنبھال رکھنے کی ضرورت تب پیش آ سکتی ہے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آنے میں کچھ وقفہ باقی ہو تاکہ جب قرض خواہ مطالبہ کرے تو ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر نہ ہو جائے۔

○ اگر قرض خواہ قریب موجود ہو تو مقررہ وقت سے پہلے خود جا کر ادائیگی کر دینا افضل ہے لیکن اگر اس سے رابطہ مشکل ہو تو رقم سنبھال کر رکھنا مناسب ہے تاکہ ادائیگی جلد از جلد کی جا سکے۔

خوبی

حضرت نقادہ (بن عبداللہ) اسدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی۔ اس شخص نے (اونٹنی دینے سے) انکار کر دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک اور آدمی کی طرف بھیجا۔ اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا۔

"یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجنے والے کو بھی۔"

حضرت نقادہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے کہا "جو اسے لے کر آیا اس کے لیے بھی برکت کی دعا فرمائیں۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اور جو اسے لے کر آیا (اللہ اسے بھی برکت دے۔)"

پھر آپ کے حکم سے اسے دوہا گیا، اس نے بہت دودھ دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلے شخص کے بارے میں جس نے انکار کر دیا تھا، فرمایا۔

"یا اللہ! فلاں کا مال زیادہ فرما۔"

اور جس نے اونٹنی بھیجی تھی، اس کے حق میں فرمایا "یا اللہ! اس کو روز کا رزق روز دے۔"

ہلاکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہلاک ہو جائے (تباہ ہو جائے) دینار کا بندہ، درہم کا بندہ، کمبل کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے، اگر نہ دیا جائے تو (بیعت والا) وعدہ پورا نہیں کرتا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہلاک ہو جائے دینار کا بندہ، درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ ہلاک ہو جائے، اوندھا ہو جائے، اسے کانٹا لگے تو نکالا نہ جا سکے۔"

فوائد و مسائل :

○ دنیا کا لالچ مذموم ہے۔

○ جب محبت و نفرت کی بنیاد محض دنیوی مفاد پر ہو جائے تو خلوص باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں خلیفۃ المسلمین یا اس کے نائب سے بیعت بھی اللہ کی رضا کے لیے اور اسلامی سلطنت کی حفاظت اور خدمت کے لیے نہیں ہوتی، اس طرح یہ عظیم نیکی بھی تمام برکات سے محروم ہو کر برائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

○ دینی جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق، اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے ہونا چاہیے۔ اسی نیت سے عہدہ اور ذمہ داری قبول کی جائے۔ اگر محسوس ہو کہ محنت کرنے کے باوجود جماعت میں اہمیت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اکابر سے ناراض ہو کر جماعت سے الگ نہ ہو جائے۔ ہاں، اگر یہ محسوس کیا جائے کہ جماعت یا تنظیم کے عہدے دار صحیح انداز سے کام نہیں کر رہے اور توجہ دلانے کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہیں تو خاموشی کے ساتھ تنظیم سے الگ ہو جائے۔

○ درہم و دینار کے بندے سے مراد وہ شخص ہے، جو دنیا کے مال و دولت کی اتنی خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا محور، حصول دولت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دولت سے خدمت لینے کے بجائے دولت جمع کرنے اور سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے گویا دولت اس کا آقا یا معبود ہے اور وہ غلام یا پجاری۔

○ دولت کے پجاری کے لیے بددعا کی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو جائے۔ منہ کے بل گرنے اور سر کے بل اوندھا ہو جانے سے یہی مراد ہے۔ کانٹا نہ نکالے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشکلات میں پھنسا رہے، اور اس کی مدد اور نجات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

قناعت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "امارت سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔"

فوائد و مسائل :

○ انسان دولت اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس کے کام چلتے رہیں لیکن جب دولت خود مقصود بن جائے تو پھر مال و دولت کی کثرت کے باوجود وہ سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔

○ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود رزق کو کافی سمجھے اور اپنی ضروریات کو اس حد تک محدود کر لے کہ حلال روزی میں گزارہ ہو جائے۔

○ دولت مند وہ ہے جس کا دل دولت مند ہے۔ اور دل دولت مند تب ہوتا ہے جب اس میں حرص اور بخل نہ ہو۔ ایسا آدمی تھوڑے سے مال سے اتنی خوشی حاصل کر لیتا ہے جو حریص آدمی کو بہت زیادہ مال سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

* * *

بادشاہت کی تلاش میں

انشاء جی

فی زمانہ حکومتوں کے بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں۔ ایک بیلٹ یعنی الیکشن کا' دوسرا بلٹ یعنی گولی کا۔ ویسے اب دونوں میں چنداں فرق نہیں رہا کیونکہ الیکشن میں بھی بیلٹ کے ساتھ ساتھ بلکہ بیلٹ سے زیادہ بلٹ کا استعمال ہونے لگا ہے اور زیادہ مؤثر اور کامیاب پایا گیا ہے۔ ہم ذاتی طور پر الیکشن کے حق میں نہیں۔ یہ خون خرابے کی چیز ہے جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کیا ہے۔ ہمارے بہترین بادشاہوں میں سے جن کا نام زریں حروف سے لکھتے لکھتے ہماری دواتیں خشک ہو گئی ہیں اور ملک کے سونے کے ذخائر میں معتدبہ کمی واقع ہو گئی ہے۔ اکبر' جہانگیر' شاہجہاں وغیرہ۔ ان میں سے کون الیکشنوں کے ذریعہ برسر اقتدار آیا؟ عوام کی اکثریت کی رائے کی کوئی سند بھی نہیں۔

لوگوں کا بس چلتا تو بادشاہ غازی حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے مقابلے میں وہ ووٹ دارا شکوہ کو دیتے' حالانکہ ہم آپ جانتے ہیں کہ وہ بڑا بدعقیدہ آدمی تھا۔ ہمارے ممدوح کے مقابلے میں جو متدین ایثار پیشہ' درویش اور اپنے بھائیوں پر جان چھڑکنے والے تھے۔ اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ ایک بڑا عیب یہ تھا کہ کتابیں لکھتا تھا۔ اکبر اعظم تو الیکشن کا فارم بھی خود نہ پُر کر سکتے تھے۔ ان کے نامزدگی کے کاغذات ابوالفضل کو پُر کرنے پڑتے۔ بادشاہ بس نشان انگشت ثبت کرتا۔ محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی سے بھی یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ اس کھٹ راگ سے گزرتے۔

امیر تیمور کو ہم قائل کر لیتے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری بات نہ ٹالتے' لیکن یہ بھی گمان ہے کہ کچھ اس قسم کا عذر کر کے کہ "آج میری ٹانگ میں درد ہے' کل الیکشن کی تاریخ کا اعلان کروں گا۔" راتوں رات گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر لشکر لے کر "علی علی" کرتے خوارزم کی طرف نکل جاتے' بلکہ ان کا ایک اور گھوڑا جاتے جاتے ہماری پھوس کی کلی کو لات مار جاتا کہ اور دو مشورے صاحب قراں کو۔ اصولاً "تو انگریزوں کو بھی حکومت سنبھالنے سے پہلے ہندوستان میں الیکشن یا استصواب رائے وغیرہ کرانا چاہیے تھا لیکن خیر! دوسرا طریقہ بھی حکومت بدلنے کا اتنا ہی مقبول اور مشہور ہے بلکہ ہمارے ہاں جمہوریت تو مدت سے کافور ہے' اسی کا زیادہ دستور ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دو گھسے پٹے طریقوں کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے جو پُرامن بھی ہو۔ افسوس کہ ٹیلیویژن اور ریڈیو کی بدعت رائج ہونے کے باعث لوگوں میں پرانے کلاسیکی ادب کا ذوق اٹھ گیا ہے۔ ہائے کیا زمانہ تھا کہ لوگ شب و روز داستانیں کہتے سنتے رہتے تھے۔ خوش جمال بادشاہوں اور ماہ پارہ شہزادیوں کی اور تین آنکھوں والے نابکار دیوؤں کی اور اڑتے قالینوں کی۔ داستانوں میں اس انہماک کا ایک ضمنی فائدہ یہ تھا کہ ملک میں انفلیشن (افراط زر) بھی پیدا نہ ہونے پاتی تھی۔

ان قصوں کہانیوں کے بموجب ایک بادشاہ کے لاولد مرنے پر لوگ صبح دم شہر کے دروازے میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مسافر کے سر پر تاج رکھ کر شادیانے بجا دیتے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے شاہ مرحوم کا کانا وزیر اس پہلے آدمی کو پہلے ہی بغلی دروازے سے یا فصیل کے برج سے رسی لٹکا کر شہر کے دروازے کے پاس اتار دیتا تھا اور وہ تڑکے تک سردی سے ٹھٹھرتا اپنے کو بادشاہی کے خوابوں سے گرماتا وہاں دبکا پڑا رہتا تھا۔ لیکن ہم اسے محض بدگمانی سمجھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں ولی عہد پیدا کرنے کے معقول انتظام ہوتے تھے۔ خاصے گنجان حرم بیگموں کے بھی' کنیزوں کے بھی' امراء' وزرا کی بہو بیٹیاں اس پر مستزاد اور اولاد نرینہ کی بشارتیں اور دعائیں دینے والے اہل اللہ بھی شہر کے باہر ڈیرے جمائے بیٹھے رہتے تھے۔ شہر سے باہر لیکن اتنی دور بھی نہیں کہ لوگوں کو نذر و نیاز کے ٹوکرے وہاں تک لے جانے میں دقت ہو۔

علاوہ ازیں ان دعاؤں کو مستجاب بنانے اور اس معاملہ میں قدرت کاملہ کو ظہور میں لانے کے لیے محل کے اندر حبشی غلام بھی رہتے تھے جن کے سرکاری فرائض تو دن میں ختم ہو جاتے تھے لیکن اپنے آقا کی بیگمات کی فرمائش پر اوور ٹائم بھی خوشی خوشی کر لیتے تھے۔ خواجہ سراؤں کی موجودگی اس میں مانع نہ ہوتی تھی۔ تاہم داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہوں کی لاولدی اور صبح دم مسافروں کو بیٹھے بٹھائے پکی پکائی بادشاہی ملنے کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔

* * *

ہم بادشاہت کے تہ دل سے قائل ہیں۔ اس وقت بالخصوص مسلمان ملکوں میں جو بادشاہ ہیں' وہ ہماری آنکھ کا تارا ہیں۔ ہم نے کئی بار لکھا کہ اب جو ہمیں خدا نے یہ ملک دیا ہے تو اس میں ہمیشہ بادشاہت لا کر کسی کو بادشاہ یا خلیفہ بنانا چاہیے تاکہ یہ آئین دستور' پیپلز پارٹی' پی این اے وغیرہ کے جھگڑے نہ اٹھیں۔ یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ ہمیں بادشاہ بنایا جاتا۔ کسی اور کو بھی بنایا جا سکتا تھا' کیونکہ فی زمانہ اہلیت اور لیاقت کو کون دیکھتا ہے' تاہم ہماری شنوائی نہ ہوئی۔

انگلستان ہم اس لیے بھی آئے تھے کہ یہاں بادشاہت ہے۔ یہاں کبھی نہ کبھی کوئی تو لاولد مرے گا کیا عجب یہاں صبح دم دروازۂ شہر میں داخل ہونے والوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں' لیکن یہاں آ کر پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس شہر میں نہ فصیل ہے' نہ کوئی دروازہ ہے' یہاں ہم کمبل لے کر پڑ جاتے اور ہر روز اخبار ٹائمز خرید کر سیاہ حاشیے کی خبروں کا مطالعہ کرتے ایک صورت یہ بھی تو تھی کہ لوگ دربدر تلاش کرتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا بصرے یا کاشغر کا نوجوان تاجر ملے جس کا تعلق کسی پرانے شاہی خاندان سے ہو اور جو حسن صورت' لیاقت اور فطانت میں یکتائے زمانہ ہو۔ ہم نے اسی خیال سے اپنی ڈگریاں اس ڈگری کے علاوہ جو کو آپریٹو قرضہ کی نادہندگی کے سلسلے میں ہم پر ایک دیوانی عدالت نے دی تھی (کوئی باہوش عدالت ایسا نہیں کر سکتی تھی) فریم کرا کے اپنے ڈرائنگ روم میں لٹکا دیں جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسے بھی جن کی پارلیمنٹ اور بکنگھم پیلس تک پہنچ ہے اور خود عمل تسخیر شروع کر دیا۔ قباحت یہ ہوئی کہ کسی نے ملکہ عالیہ کو بروقت فیملی پلاننگ کا لٹریچر نہ بھیجا تھا جس سے چند قباحتیں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں بلکہ قباحت در قباحت بھی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شہزادی این کے ہاں اس عزیزہ کے پیدا ہونے کی ہمیں خوشی نہیں۔ جب اور سب ہی کو ہے تو ہمیں بھی ہے۔ تاہم یہ ہوا کہ بادشاہت کی کیو میں ان کا نمبر لگ گیا۔ پانچواں

؎ ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

پھر بھی اگر پہلے چار امیدواروں کو کچھ ہو جائے اور ان میں جو اولاد نرینہ ہے' وہ فاترالعقل نکل جائے یعنی سب کے سب امریکی منکوحہ عورتوں سے شادی کر کے وزیراعظم وقت کو ناراض کر لیں' یا رومن کیتھولک' مسلمان یا کبیر پنتھی ہو جائیں اور یہ نومولود بچی تاج پہننے سے انکار کر دے کہ چبھتا ہے یا میرا ہیئر ڈو اس سے خراب ہوتا ہے تو سلطنت دست بدست ہم تک آ سکتی ہے۔ لیکن آج یہ خبر آئی کہ اس گھرانے میں ایک اور شہزادی نے جنم لیا ہے۔ یہ ڈچس آف گلوسسٹر کی صاحبزادی ہیں۔ ان کا بادشاہت کی قطار میں بارہواں نمبر ہے۔

ہم نے ایک ہمدرد سے ذکر کیا اور کہا کہ "گلوسسٹر پلیس میں رہنے کی وجہ سے ہم بھی ایک طرح کے ڈیوک آف گلوسسٹر ہیں کہ نہیں"' تو کہنے لگے۔

"صاحب من! اگر ملکہ الزبتھ ثانی کو ملکہ وکٹوریہ کی عمر ارزانی ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ ایک سو بارہواں امیدوار بھی پیدا ہو جائے۔ بس سیدھے اپنے وطن واپس جاؤ' اپنا وقت مت ضائع کرو۔ امیگریشن کے

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

رجسٹر کے مطابق تمہارا نمبر وراثت کے معاملے میں چھ کروڑ اٹھتر لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو پینتیسواں ہے۔ پھر تم کالے بھی ہو اور پرانی داستانوں میں بھی شاہی خون کی شرط ہوا کرتی تھی۔“

ہم نے بتایا کہ ”کالے تو ہم بیماری کی وجہ سے ہوگئے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو اپنے ملک سے گورا کرنے والی کریم منگالیں گے' جس کے استعمال سے حبشی تک گورے ہو سکتے ہیں۔ اور رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ تک کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ اب رہی شاہی خاندان کی بات' ہم نے ایک پرانی کتاب میں دیکھا ہے کہ پراچین زمانے میں ہمارے جد امجد لاہور کے قریب ایک ریاست کے ایک طرح سے راجا تھے۔ وہ یوں کہ بظاہر راجہ ان کے چھوٹے بھائی تھے لیکن وہ بڑے بھائی یعنی ہمارے جد امجد کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کی کھڑاؤں تخت پر تو نہیں' تخت پر جگہ ہی کہاں ہوتی ہے' تخت کے نیچے رکھتے تھے۔“

ہمارے ان مہربان نے فرمایا۔ ”یہ انگلستان ہے' یہاں انگریزی خون یعنی سفید خون کی شرط ہے۔ کالنجر کا حوالہ نہیں چلے گا۔“

ہم نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔ ”اچھا تو اور ملکوں کے نام بتاؤ جہاں بادشاہت ہو اور جہاں جوہر قابل کی قدر ہوتی ہو۔ اسلامی ملک ہو تو اور اچھا ہے' کیونکہ ہمیں اسلام کا بول بالا کرنے کا بھی شوق ہے۔“

ہمارے ان دوست نے چند ملکوں کے نام بتائے لیکن یہ بھی کہا کہ ”آج کل وہاں ویزا کی پابندی ہے اور پاکستانیوں کو تو بالکل نہیں ملتا۔“

اس کے بعد جیب سے پی آئی اے کا ٹائم ٹیبل نکال کر کہنے لگے۔

”بتاؤں لندن سے کون کون سی فلائٹیں سیدھی کراچی جاتی ہیں؟“

ہم نے منغض ہو کر کہا۔ ”رہنے دو' ہم خود دیکھ لیں گے' آدمی گڑ نہ دے' گڑ کی سی بات تو کرے۔“

* * *

ہم بادشاہ ہوتے تو کیا کرتے۔ اس باب میں ہم نے ایک منشور چھاپ رکھا ہے جسے خرچا ڈاک کے لیے دس روپے بھیج کر ہم سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ملک سے ساری بری باتوں کا قلع قمع کرتے پہلے قلع پھر قمع۔ جمعے کی چھٹی کرتے' لیکن افسوس وہ پہلے ہی ہونے لگی ہے۔ خیر' جمعے کی دو چھٹیاں کر دیں گے۔ ہمارے عہد معدلت عہد میں ہفتے میں دو جمعے ہوا کریں گے تاکہ لوگ دل جمعی سے عبادت کرتے رہیں۔ جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ کے شیطانی وسوسے ان کے دل میں پیدا نہ ہوں۔ شراب کی ممانعت کرنے کا نکتہ بھی ہمارے منشور میں تھا' وہ بھی ہو چکی' لیکن ہرج نہیں' ہم مزید ممانعت کر دیں گے تاکہ جو لوگ نہیں پیتے وہ مزید نہ پئیں۔ یہاں تفصیل کیا دیں' آزمائش شرط ہے۔ ”مشک آنست کہ خود ببوید“

* * *

تاریخ انگلستان ہم نے اس خیال سے لکھنی شروع کی تھی کہ آخر میں اپنے عہد کا حال اپنے قلم سے لکھ جائیں تاکہ آنے والے مؤرخ غلطیاں نہ کریں' لیکن قارئین کرام شاعر کہہ گیا ہے۔

”حب وطن از ملک سلیماں خوشتر“

اب ہم فرنگستان کے راج پاٹ پر لات مار کر وطن واپس آنے اور ایک رحم دل اور بیدار مغز تاجدار کے طور پر اپنے ملک اور رعایا کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ جونہی امراء اور عمائد کا کوئی وفد ہمیں لینے کے لیے آئے گا' ہم لندن کے در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے' اس کالم کی کٹنگ سنبھال کر رکھیں۔ اپنے سب قارئین کو ہم خلعت و انعام دیں گے اور لوگوں کا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔ خصوصاً“ ان کا جو نکتہ چینی کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔

(ستر کی دہائی میں لکھا گیا)

*

معروف فنکارہ

باتیں رضوانہ کمالی سے

شاہین رشید

1 ”اصلی نام؟“
”رضوانہ کمالی۔“

2 ”پیار کا نام؟“
”گھر میں ابو ”انو“ کہتے ہیں اور بھائی ”اصول“۔“

3 ”تاریخ پیدائش / شہر؟“
”25 نومبر / ابو ظہبی۔“

4 ”ستارہ / تعلیمی قابلیت؟“
”A / Aquarius لیول اور اسٹوڈیو آرٹ سے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کیا ہے۔“

5 ”بہن بھائی / آپ کا نمبر؟“
”میں اور ایک بھائی / دوسرا نمبر۔“

6 ”شادی کب کرنی ہے؟“
”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہو سکتا ہے اس سال ہو جائے۔ ہو سکتا ہے ایک سال بعد ہو۔“

7 ”شوبز میں متعارف کرانے کا سہرا؟“
”کسی کے سر نہیں۔ بس اتفاق سے آگئی۔“

8 ”پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟“
”پہلا سیریل ”پہلا چاند“ جیو سے ہوا تھا / اور شہرت سب نے دی۔“

9 ”پہلی کمائی کیا تھی / کیا کیا تھا؟“
”پہلا چاند کے 85 ہزار ملے تھے اور خرچ کر دیے تھے کہ مجھے خرچ کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔“

10 ”صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“
”پہلے فریش ہوتی ہوں۔ پھر شوٹ کے لیے نکل جاتی ہوں اور گاڑی میں ہی ناشتا کرتی ہوں۔“

11 ”اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟“
”میرے ہونٹوں کے نیچے جو تل ہے، وہ پسند ہے۔“

12 ”گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“
”اپنے کمرے میں، اپنے بیڈ پہ۔“

13 ”شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟“
”مجھے بھوک کنٹرول کرنا آتی ہے۔ میں بے قابو نہیں ہوتی۔“

14 ”اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟“
”کسی سے بھی نہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں خود ہی اپنے مسائل حل کر لوں اور اگر بہت زیادہ پرابلمز ہوں تو پھر ممی سے ڈسکس کر لیتی ہوں۔“

15 ”کوئی گہری نیند سے بیدار کر دے تو؟“
”ممی ہی کرتی ہیں۔ تھوڑی چڑچڑی ہو جاتی ہوں، لیکن اٹھ جاتی ہوں۔“

16 ”پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟“
”لڑکیاں ہوں تو ہاتھوں اور پیروں پر خود بخود نظر پڑ جاتی ہے اور حضرات ہوں تو بات چیت کا طریقہ دیکھتی ہوں۔“

17 ”آئینہ دیکھ کر کیا خیالات آتے ہیں؟“
”اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔“

18 ”اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟“
”جب میں بہت کچھ کروں کسی کے لیے اور کوئی میری فیلنگ کو سمجھ نہ سکے۔“

19 ”زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟“
”اپنے آپ کے لیے۔“

20 ”آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟“
”کہنے کو تو بہت لوگ کہتے ہیں، لیکن میرا نہیں خیال کہ کوئی دے سکتا ہے۔“

21 ”اگر دعا سے کوئی مل سکتا تو کسے مانگتیں؟“
”میرے خیال میں میرے پاس سب کچھ ہے، ماں باپ بھائی، عزت شہرت سب کچھ۔“

22 ”کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟“
”نہیں، کوئی خاص نہیں۔ مجھے جس کی جو بات اچھی لگتی ہے، اس کو میں گرہ سے باندھ لیتی ہوں۔“

23 ”جب پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟“
”اپنے سائن کرتی ہوں۔“

24 ”کوئی غلطی جس کو سوچ کر پشیمانی ہوتی ہو؟“
”ہاں، ایسی بہت سی غلطیاں ہیں جو ہر انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں اور میری اچھی عادت یہ ہے کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔“

25 ”کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟“
”[illegible]..... جب مجھے غصہ آتا ہے تو پہلا کام ہی یہی کرتی ہوں اور دو دو دن کھانا نہیں کھاتی۔“

26 ”کبھی سوچا کہ کچھ عرصے بعد آپ کہاں ہوں گی؟“
”نہیں کبھی نہیں، میں تو اپنے اگلے لمحے کا نہیں سوچتی کہ میرا خیال ہے کہ سب پری پلان ہوتا ہے۔“

27 ”کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟“
”ممی کے ہاتھ کا۔“

28 ”پسندیدہ ناشتا؟“
”کوئی نخرہ نہیں ہے، جو بھی ناشتا ہو، کھانا ہو، بس ذائقے دار ہو۔“

29 ”موڈ کب خراب ہوتا ہے؟“
”اچانک ہی خراب ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی بہت ہی معمولی بات پہ بھی ہو جاتا ہے۔“

30 ”جب ٹی وی آن کرتی ہیں تو پہلا چینل کون سا دیکھتی ہیں؟“
”اگر میرے کسی پروگرام کا وقت ہو تو وہ چینل لگا لیتی ہوں اور اگر ویسے ہی کچھ دیکھنے کا موڈ ہے تو مووی چینل یا میوزک چینل لگا لیتی ہوں۔“

31 ”بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے؛ لڑکیاں یا لڑکے؟“
”کوئی بھی ہو سکتا ہے، لیکن اگر بھروسا صرف اپنے آپ پر کریں تو زیادہ بہتر ہے۔“

32 ”کیا دعا سے قسمت بدل جاتی ہے؟“
”بالکل، کیونکہ دعا میں بہت اثر ہوتا ہے۔ قسمت بدلتے ہم نے دیکھا ہے۔“

33 ”اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟“
”دوسروں پر جلدی بھروسا کر لیتی ہوں۔ اسے بدلنا چاہتی ہوں اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال کرتی ہوں اور نقصان اٹھاتی ہوں۔“

34 ”گھر آ کر پہلی خواہش؟“
”واش روم جانے کی اور فریش ہونے کی۔“

35 ”موت سے ڈر لگتا ہے؟“
”ہرگز نہیں۔“

36 ”کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟“

”جہاں بلاوجہ ہنسنا پڑے۔ میں پارٹی میں جانا پسند نہیں کرتی۔“

37 ”سائنس کی بہترین ایجاد؟“

”موبائل فون جس کے ذریعے ہم بات کر رہے ہیں۔“

38 ”جھوٹ کب بولتی ہیں؟“

”جب مصلحتاً بولنا پڑے۔“

39 ”تہوار جو شوق سے مناتی ہیں؟“

”عید۔“

40 ”شوبز کی سب سے بڑی برائی؟“

”منافق بہت ہوتے ہیں۔ مطلبی بہت ہوتے ہیں۔ مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔“

41 ”چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟“

”سو کر، بستر کی صفائی کر کے، کوکنگ کر کے۔ مجھے کوکنگ کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔“

42 ”شہرت، رحمت یا زحمت؟“

”رحمت ہے لیکن اگر عزت کے ساتھ ملے تو۔“

43 ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“

”جب آپ کچھ کرنا چاہیں اور نہ کر پائیں تو یہی سوچ آتی ہے کہ کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔“

44 ”ایک سوال جو برا لگتا ہے؟“

”آئندہ پانچ دس سال بعد آپ کہاں ہوں گی۔“

45 ”کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟“

”اس کی اپنی مرضی ہے، گھورتا ہے تو گھورتا رہے۔“

46 ”سارے دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟“

”جب میں گھر آتی ہوں اور فریش ہوتی ہوں۔ وہ وقت اور جب میں ٹی وی دیکھ رہی ہوتی ہوں۔“

47 ”ایک عادت جو شوبز کے لوگوں کو بھی معلوم ہے؟“

”ہاتھوں پیروں میں لوشن لگانے کی، سیٹ پہ جوس پینے کی عادت۔“

48 ”کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟“

”برے سینس میں تو چیخنے چلانے سے اپنی انرجی ویسٹ ہوتی ہے۔ جب کوئی میری بات نہیں سمجھ رہا ہوتا تو میں خاموش ہو جاتی ہوں۔“

49 ”کس لمحے نے زندگی بدل دی؟“

”کسی لمحے سے نہیں بدلتی بلکہ زندگی تو ہر موڑ پر بدلتی ہے۔ اچھے برے احساسات کا نام زندگی ہے۔“

50 ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“

”اگر کوئی سچے دل سے کر رہا ہے اور اپنا قیمتی وقت آپ کو دے رہا ہے تو مجھے برا نہیں لگتا۔“

51 ”ایک رشتہ جس نے دکھ دیا؟“

”نہیں ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

52 ”غصہ کب آتا ہے؟“

”جب کوئی میری بات سمجھ نہیں رہا ہوتا۔“

53 ”فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟“

”جتنا اس وقت میرے پاس ہو۔ فقیر کو دیکھ کر اس کی مدد کرتی ہوں، ہٹے کٹوں کی نہیں۔“

54 ”کن باتوں پہ کنٹرول نہیں؟“

”میں کسی سے ناراض نہیں رہ سکتی۔“

55 ”کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟“

”زندگی میں آپ کو ایک سے زیادہ افراد بھی متاثر کر سکتے ہیں۔ عشق، محبت اور پیار میں فرق ہوتا ہے۔“

56 ”آپ کی محبت کا پیمانہ؟“

”اگر آپ لڑکی اور لڑکے والی محبت کی بات کر رہی ہیں تو مجھے محبت اس سے ہو گی جو میرا شریک سفر بن کے میری زندگی میں آئے گا۔“

57 ”پسندیدہ صحافی؟“

”ہر بندہ، ہر صحافی اپنے شعبے میں اچھا کام کر رہا ہوتا ہے۔ کسی کا نام نہیں لوں گی۔“

58 ”کبھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا؟“

”ہاں جی! کئی بار۔ بہت صاف دلی کے ساتھ۔“

59 ”ایک انوکھی خواہش؟“

”کوئی انوکھی خواہش نہیں کرتا۔ ہر کوئی وہی خواہش کرتا ہے جو پوری ہونے کی امید ہو۔ میری خواہش ہے کہ میں ایک ”لمبے ٹور“ پہ جاؤں۔“

60 ”ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی ہوتی ہے؟“

”کہتے ہیں کہ پہلا پیار بڑا سچا ہوتا ہے جو کبھی نہیں بھولتا۔“

61 ”گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟“

”اگر میں کبھی دیر سے آؤں تو ممی کا موڈ آف ہو جاتا ہے تو میرا بھی موڈ آف ہو جاتا ہے کہ کیا میں اپنے لیے ٹائم نہیں نکال سکتی۔“

62 ”کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہیں؟“

”کپڑوں پہ، جوتوں پہ، بیگز پہ۔“

63 ”فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟“

”لوگوں کو دیکھتی ہوں اور نظریں خود بخود مختلف چیزوں کا جائزہ لے رہی ہوتی ہیں۔“

64 ”کس چیز کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟“

”فریش جوسز۔“

65 ”کس شخصیت کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟“

”بہت سے لوگ زندگی میں اہم ہوتے ہیں، لیکن زندگی کا کام چلتے رہنا ہے۔ کسی کے آنے جانے سے زندگی نہیں رکتی۔“

66 ”کس بات سے خوفزدہ رہتی ہیں؟“

”کہ میری وجہ سے کسی کا دل نہ دکھے۔“

67 ”اپنی کوئی اچھی اور بری عادت؟“

”اچھی تو یہ کہ سب سے فرینک ہوتی ہوں اور کمیونیکیشن گیپ نہیں رکھتی اور بری عادت یہ کہ بہت جلد کوئی بات دل کو بری لگ جاتی ہے اور میرا منہ بن جاتا ہے۔“

68 ”آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟“

”کروٹ لیتی ہوں۔ سونے کی کوشش کرتی ہوں یا Net پہ بیٹھ جاتی ہوں، یا ٹی وی آن کر لیتی ہوں۔“

69 ”ایک شام جو اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں؟“

”ایسی تو کوئی شخصیت نہیں ہے۔ جو بھی وقت گزاروں گی اپنی فیملی کے ساتھ گزاروں گی۔“

70 ”کس ملک کے لیے کہتی ہیں کاش یہ ہمارا ہوتا؟“

”کسی کے لیے نہیں، صرف اپنا ملک ہی سب کچھ ہے۔“

71 ”اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ؟“

”ممی!“

72 ”بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟“

”جب بہت نیند آرہی ہو تو بستر پر لیٹتے ہی سو جاتی ہوں۔“

73 ”انسان کا بہترین روپ مرد یا عورت؟“

”عورت، کیونکہ ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔“

74 ”کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ، چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟“

”کمپنی پر منحصر ہے۔“

75 ”کون سے الفاظ یا محاورے زیادہ استعمال کرتی ہیں؟“

”ڈیل، آئی مین۔“

76 ”مرد کب برے لگتے ہیں؟“

”جب بلاوجہ اپنے مرد ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔“

77 ”پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟“

”گولڈ کی شکل میں۔“

78 ”اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟“

”کسی کو نہیں، کیونکہ میں تو لال بیگ کو نہیں مار سکتی۔“

79 ”بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟“

”ڈرائی فروٹ، لوشن، روز واٹر بوتل، لیمپ اور موبائل فون۔“

80 ”آپ کی ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟“

”شاید، میرا ایک دم ناراض ہو جانا اور جلدی غصے میں آجانا۔“

81 ”اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟“

”محبت دے کر محبت لی ہے۔“

82 ”کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟“

”اپنا والٹ، موبائل فون اور سب سے بڑھ کر ماں کی دعائیں۔“

”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟“

”ہر چیز کو زوال ہے۔ یہ تو ایک نیچرل پروسس ہے۔“

✡

ٹوٹے ہوئے پر کی فنکارہ

عائزہ خان سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ ڈراموں کے کردار ایسے ہوتے ہیں جو فنکار کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیتے ہیں۔ تب فنکاروں کے نخرے قابل دید ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پانچ، چھ سال سے وہ شہرت کو پانے کی جدوجہد میں مصروف عمل تھے اور آج جب انہیں کچھ مل گیا ہے تو بجائے ان میں انکساری آنے کے وہ اتنے مغرور ہو گئے ہیں کہ کسی سے بات کرنا گوارا نہیں کرتے... اور ایسا کوئی ایک فنکارہ یا فنکار نہیں کرتا، بلکہ آج کل کی نسل میں بیشتر فنکار ایسے ہیں جو انٹرویو دینے کے لیے بلاوجہ بہانے بناتے ہیں۔ وقت کی کمی ان کا خاص بہانہ ہوتا ہے اور... چلیں جانے دیں۔ اللہ انہیں اور ترقی دے۔

عائزہ خان نئی نسل کی نمائندہ فنکار ہیں۔ "ٹوٹے ہوئے پر" نے انہیں راتوں رات مشہور کر دیا اور ناظرین نے ان کی پرفارمنس کو بے حد سراہا۔ اصل میں کسی بھی کردار کی مقبولیت میں فنکار کی محنت تو ہوتی ہے، لیکن زیادہ سراہنے کے قابل وہ رائٹر ہے جو اتنا مضبوط کردار تخلیق کرتا ہے کہ فنکار کو پرفارم کرنے میں زیادہ مشکل بھی پیش نہیں آتی اور وہ انجوائے بھی کرتا ہے۔

"کیسی ہو... بہت مصروف رہتی ہو کہ بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ٹھاک ہوں اور ایسی بات نہیں کہ بات کرنے کی فرصت نہیں... بات تو میں کر لیتی ہوں، مگر انٹرویو کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے اور واقعی میں بہت مصروف رہتی ہوں مگر آج ٹائم ہے آپ کے لیے۔"

"شکریہ... کیا کیا پروجیکٹ ہیں آج کل؟"

"یہ مت پوچھیں... بس یہ سمجھ لیں کہ کافی کام ہے، اور سب انڈر پروڈکشن ہیں اور کب کون سا سیریل یا سوپ آن ایئر آجائے کچھ کہہ نہیں سکتے، ویسے "ٹوٹے ہوئے پر" کی ریکارڈنگز بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔"

"اداکاری میں سینیئرز فنکاروں نے مدد کی یا ڈائریکٹر نے؟"

"سینیئرز فنکار بہت اچھے ہیں، لیکن مجھے اگر کچھ سکھایا ہے تو محسن مرزا اور بابر جاوید نے اور ان ہی کی وجہ سے مجھے یہ کردار کرنے میں آسانی ہوئی۔"

"آج کل تو گھر سے نکلنا مشکل ہوتا ہو گا، ناظرین پہچان لیتے ہوں گے؟"

"جی بالکل پہچان لیتے ہیں۔ اور بہت پیار سے ملتے ہیں۔ میرے کردار پر تبصرہ کرتے ہیں۔ مثلاً "جو لوگ "ٹوٹے ہوئے پر" شوق سے دیکھتے ہیں وہ شروع شروع میں کہتے تھے کہ ہمیں اجیہ بہت اچھی لگتی ہے، مگر لڑکی کو اتنا بولڈ نہیں ہونا چاہیے پھر میرا اس سیریل میں سنجیدہ رول شروع ہوا تو ملنے والوں نے کہا کہ نہیں ہمیں تو پہلے والی اجیہ ہی اچھی لگتی تھی۔ آپ کے چہرے پر سنجیدگی سوٹ نہیں کر رہی اور دلچسپ بات بتاؤں لڑکوں کو شوخ و چنچل اجیہ اچھی لگتی تھی اور لڑکیوں کو سنجیدہ اجیہ۔"

"آئندہ کس قسم کے کردار لینے ہیں؟"

"ایسے کردار جو پاور فل ہوں، جن کو کرتے وقت تھوڑی محنت کرنی پڑے، تھوڑا مشاہدہ کرنا پڑے، خواہ وہ نیگیٹو ہوں یا پوزیٹو، بس ہوں پاور فل۔"

"نیگیٹو رول سے تو تمہاری شخصیت پر برا اثر پڑے گا اور ابھی تو تمہیں بہت آگے جانا ہے، ماڈرن رول نہیں کرو گی کیا؟"

"ایسے نیگیٹو رول نہیں کروں گی کہ جس سے امیج خراب ہو، اتنی تو میں احتیاط کروں گی۔ ہاں ایسے ماڈرن رول یا بولڈ رول جن کو دیکھ کر لوگ دانتوں میں انگلیاں دیں، ہرگز ہرگز نہیں کروں گی۔ کیونکہ اگر مجھے اس فیلڈ میں آنے کی اجازت ملی ہے تو کچھ شرائط کے ساتھ، اور ویسے بھی ٹی وی فیملی کے سب لوگ دیکھتے ہیں۔ انسان کو اتنا تو خیال رکھنا چاہیے کہ شرمندگی نہ ہو اپنے بزرگوں کے آگے۔"

"تم نے کہا کہ گھر والوں کی کچھ شرائط کے ساتھ اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ تو گھر والے راضی نہیں تھے کیا؟"

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

”جی ہاں۔ گھر والوں کی اجازت نہیں تھی اور بنیادی طور پر میں خود بھی کوئی بہت بولڈ قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔ بس اتفاقیہ اس فیلڈ میں آگئی.... تو اچھا لگا' گھر والوں نے شروع میں تو اجازت نہیں دی' نہ ہی کسی قسم کی پسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن جب آصف رضا میر انکل نے ڈرامے میں کام کرنے کی پیش کش کی تو گھر والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔“

”آپ خوش ہیں گھر والے تمہارے؟“

”جی خوش ہیں.... اور اس فیلڈ میں اچھا خاصا کام کرنے کے باوجود شوٹ کے لیے اکیلے آنے جانے سے ڈرتی ہوں، اس لیے کوئی نہ کوئی فیملی ممبر میرے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔“

”تم نے کہا کہ اتفاقیہ آگئی اس فیلڈ میں.... تو یہ اتفاق کیسے ہوا؟ اور کتنے سال ہوگئے اس فیلڈ کو جوائن کیے ہوئے؟“

”اتفاقیہ یوں کہ جب میں پندرہ یا شاید سولہ سال کی تھی تو کالج کے کسی مقابلے میں' میں نے حصہ لیا' وہاں کچھ ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ میری پرفارمنس دیکھ کر ایک ایجنسی سے کال آگئی' کمرشل کرنے کے لیے۔ بس میں نے ہامی بھرلی' اگرچہ گھر والے تھوڑے ناراض بھی ہوئے، مگر کمرشلز اچھے تھے تو میں نے کرلیے۔ ان ہی کمرشلز کو دیکھ کر پھر آصف رضا میر انکل نے مجھے اپنے ڈرامے کے لیے کال کی اور یوں میں ڈرامہ آرٹسٹ بن گئی۔ اس فیلڈ میں آئے ہوئے چار پانچ سال ہوگئے ہیں۔“

”کبھی سوچا تھا اس فیلڈ میں آنے کا؟ اور کیسا لگتا ہے اس فیلڈ میں آکر؟“

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا اس فیلڈ میں آنے کا۔ کیونکہ میری اس طرح کی کوئی پلاننگ نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے اور پندرہ' سولہ سال کی عمر میں تو صرف دھیان پڑھائی کی طرف ہی ہوتا ہے۔ بس وہ اچانک ہی سب کچھ ہوگیا اور رہی یہ بات کہ فیلڈ میں آکر کیسا لگتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس فیلڈ میں آکر میں نے غلطی کی ہے.... کیونکہ یہاں کا ماحول میری سوچ سے بہت مختلف ہے۔“

”کیا ماحول خراب ہے؟“

”نہیں۔ خراب تو نہیں کہہ سکتی' ہر انسان کے سوچنے سمجھنے کا ایک انداز ہے' میری تربیت اس انداز کی ہے کہ میں آزادانہ ماحول میں اپنے آپ کو مس فٹ سمجھتی ہوں۔ اور یہاں سب لوگ دوسروں کو اپنی سوچ کے مطابق لیتے ہیں۔ مثلاً“ میں جیسی ہوں' میرا خیال ہوتا ہے کہ سب ایسے ہی ہوں گے، مگر ایسا نہیں ہے' لوگوں کی اکثریت میری سوچ سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے کبھی لگتا ہے کہ میں نے اس فیلڈ میں آکر غلطی کی ہے۔“

”پھر تو نئے پروجیکٹ کو سائن کرتے وقت بھی بہت مشکل پیش آتی ہوگی تمہیں؟“

”ہاں آتی تو ہے' اس لیے بہت احتیاط سے پروجیکٹ سائن کرتی ہوں' تو جن لوگوں کو میں جانتی ہوں اور جن کی شہرت اچھی ہوتی ہے اور جن کے ساتھ کام کرنے پر گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا' ان کے ساتھ کام کو ترجیح دیتی ہوں' جن کو نہیں جانتی' ان کو انکار کردیتی ہوں۔“

”گویا کبھی فیلڈ کو چھوڑنا پڑے تو تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

”بالکل بھی مشکل نہیں ہوگی، کیونکہ مجھے اپنی پڑھائی بھی مکمل کرنی ہے اور پڑھائی اگر ڈسٹرب ہوئی تو فیلڈ کو چھوڑ دوں گی، کیونکہ مجھے اپنی تعلیم کے ذریعے ہی آگے بڑھنا ہے۔ مارکیٹنگ میرا سبجیکٹ ہے اور میں اس میں جاب بھی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس فیلڈ میں مزا آرہا ہے اور مجھے اچھا بھی لگ رہا ہے شہرت پاکر۔ مگر تعلیم ہر حال میں پہلے ہے۔“

”لیکن بہت پرانی کہاوت ہے کہ شہرت کا مزا منہ کو لگ جائے تو اس سے جان چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے؟ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”آپ کسی حد تک ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگا تو ہوسکتا ہے اس فیلڈ کو نہ چھوڑوں اور ہوسکتا ہے کہ میں پروڈکشن ڈائریکشن میں چلی جاؤں۔“

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

”جو لڑکیاں اس فیلڈ میں آتی ہیں، وہ تو فلموں میں جانے کا سوچتی ہیں اور تم...“

”ارے نہیں... میں بہت مختلف قسم کی لڑکی ہوں، اپنے گھر کے ماحول کی عادی اور عزت... فلموں میں جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بے شک مجھے فلمیں دیکھنا اچھا لگتا ہے، لیکن کام کرنا نہیں... میرے بغیر بھی بہت صحیح چل رہی ہے انڈسٹری۔“

”اس فیلڈ میں آکر از خود کیا سیکھا؟“

”بہت کچھ سیکھا ہے، اب مجھ میں بہت زیادہ خود اعتمادی آگئی ہے۔ بہت کچھ فیس کرنا آگیا ہے۔ بولنا آگیا ہے، اچھے برے کی تمیز آگئی ہے۔ لوگوں کو پہچاننا آگیا ہے، بہت سیکھا ہے میں نے اس فیلڈ میں۔“

”گڈ... تو کیا پہلے تمہاری شخصیت میں یہ خوبیاں نہیں تھیں؟“

”تھیں... مگر نہ ہونے کے برابر... گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے گھر۔ اسکول کالج میں بھی یہ ہی حال تھا۔ مگر اس ماحول میں آکر ہر اونچ نیچ کو فیس کرنا آگیا ہے۔ جو ڈر اور خوف پہلے تھا مجھ میں کافی حد تک دور ہو چکا ہے۔ پہلے بڑوں کی انگلی پکڑ کر چلتی تھی۔ اب اکیلے چلنے میں بھی ڈر نہیں لگتا۔ پہلے ڈرپوک تھی، اب بہادر ہو گئی ہوں۔ اب دوسروں کی بات ماننا اور اپنی بات منوانا آگیا ہے۔“

”چلو اب اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔“

”جناب! میرا اور میرے آباؤ اجداد کا تعلق حیدر آباد سے ہے اور میں 15 جنوری کو کراچی میں پیدا ہوئی ہوں۔ میرے دو بھائی اور ایک بہن ہے اور تینوں مجھ سے چھوٹے ہیں۔“

”اب تو تم بولڈ ہو گئی ہو پہلے کی بہ نسبت... تو شادی اپنی پسند سے کرو گی یا والدین کی پسند سے؟“

”میں بولڈ ضرور ہو گئی ہوں، لیکن اتنی بھی نہیں کہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کروں اور وہ بھی شادی کا... میرے والدین میرے لیے سب کچھ ہیں، وہ میرے لیے جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔“

”پڑھائی میں کیسی ہو... اوسط یا بہت تیز؟“

”اوسط اور نہ ہی بہت زیادہ تیز، لیکن میں اپنے آپ کو ایک اچھی طالبہ کہہ سکتی ہوں اور اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ اسکول، کالج اور اب یونیورسٹی میں کبھی چھٹی نہیں کرتی، تاوقت کہ کوئی بہت مجبوری نہ ہو جائے۔“

”اس فیلڈ کی لڑکیوں کے جب میں انٹرویو کرتی ہوں تو عموماً وہ یہ ہی کہتی ہیں کہ ہم نے تو اپنا بچپن ٹام بوائے کی طرح گزارا ہے۔ لڑکیوں والی تو ہم میں کوئی عادت ہی نہیں تھی۔ تم اپنے بارے میں کیا کہو گی؟“

”اور اگر میں اپنے بارے میں بھی یہ ہی کہوں تو شاید آپ کو یقین نہیں آئے گا، لیکن یہ سچ ہے کہ میری زندگی بھی ایسی ہی گزری ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میں اس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں جہاں جوائنٹ فیملی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جہاں رشتوں کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ تو میں نے آنکھ ہی جوائنٹ فیملی میں کھولی اور اتفاق دیکھیں کہ میرے ددھیال میں لڑکیاں کم اور لڑکے زیادہ ہیں۔ تو میرا سارا بچپن اپنے کزنز کے ساتھ گزرا۔ تو میں نے بھی لڑکوں والی زندگی گزاری ہے۔“

”لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کودنے والی لڑکی میں خود اعتمادی کی کمی کیوں ہوئی؟“

”خود اعتمادی کی کمی سے مطلب یہ نہیں کہ مجھ میں کچھ کرنے کی صلاحیت یا کوئی قدم اٹھانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ آج خود اعتمادی تھی تو میں اس فیلڈ میں آئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ چونکہ ددھیال میں لڑکیاں کم تھیں تو بس انہیں ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا جاتا تھا۔ ورنہ تو جناب میں نے بچپن میں تمام کھیل لڑکوں والے کھیلے ہیں۔ کپڑے بھی لڑکوں والے ہی پہنے ہیں۔ سب میرے بارے میں کہتے تھے کہ اس میں تو لڑکیوں والی بات ہی نہیں ہے، لیکن جب بڑی ہوئی تو احساس ہوا کہ اللہ نے جس کو جیسا بنایا ہے اسے ویسا ہی رہنا چاہیے۔ اسی میں انسان کی خوب صورتی ہے۔“

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

"آج کل جو ملک کے حالات ہیں، ان کے بارے میں سوچتی ہو، یا یہ کہو گی کہ مجھے تو سیاست سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے؟"

"میں ایسا کبھی بھی نہیں کہوں گی کہ مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے، کیونکہ اب تو سیاست بھی ہماری زندگی کا حصہ ہے اور جو آج کل کے حالات ہیں، ان سے غافل رہنا حماقت ہے۔ میں بالکل اپنے ملک کے بارے میں سوچتی ہوں اور اس کی سلامتی کے لیے دل و جان سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتی ہوں اور اکثر ایسی محفل میں سیاست پر بحث ہو رہی ہو تو ضرور حصہ لیتی ہوں۔"

"قسمت پر کتنا یقین ہے؟"

"مکمل یقین ہے، اب اپنی ہی مثال دوں گی کہ میں اس فیلڈ میں بغیر کسی پلاننگ کے آئی اور میرے لیے راستے خود بخود ہموار ہوتے گئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے مقدر میں اس فیلڈ میں آنا لکھا ہوا تھا۔ بعض کام انسان کی سوچ کے برخلاف ہوتے ہیں، مگر چونکہ مقدر میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے وہ ہو کے رہتے ہیں۔"

"فضول خرچ ہو؟"

"نہیں زیادہ نہیں اور مزے کی بات یہ کہ اپنے پیسے سے کچھ خریدنا پڑے تو کنجوسی آجاتی ہے، لیکن اگر پاپا ساتھ ہوں تو پھر جی بھر کے خرچ کرواتی ہوں، ویسے انسان کو کفایت شعار ہی ہونا چاہیے۔"

"کن چیزوں پہ زیادہ خرچ کرتی ہو؟ اور کیا کیا مشاغل ہیں اداکاری کے علاوہ؟"

"کچھ مخصوص نہیں ہے، جو پسند آجاتا ہے، خرید لیتی ہوں، ان میں کپڑے، جوتے، بیگ، پرفیوم سب کچھ ہی شامل ہے اور اداکاری کے علاوہ کافی مشاغل ہیں۔ مجھے گلاس پینٹنگ کا شوق ہے، کبھی کبھی اس پہ طبع آزمائی کر لیتی ہوں اور چونکہ مجھے یکسانیت پسند نہیں تو گھر کی چیزوں کی ترتیب بدلتی رہتی ہوں۔"

"پھر تو امور کچن سے بھی لگاؤ ہو گا؟"

"جی بہت زیادہ...... ہاتھ میں ذائقہ ہے۔ سب ہی میرے ہاتھ کے پکے کھانے پسند کرتے ہیں اور چونکہ میرا تعلق حیدر آباد سے ہے تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ حیدر آبادی کھانے کتنے مشہور ہیں، تو بہت کچھ پکا لیتی ہوں۔ مجھے کچن میں کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"پکانے کا شوق ہے کھانے کا بھی ہے؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ جس کو کھانے کا شوق ہو گا، اسی کو پکانے کا بھی شوق ہو گا۔ کوئی کام دلچسپی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ دلچسپی ہی سب کام کروانے پر مجبور کرتی ہے۔ مجھے کھانے کا بہت شوق ہے، اور اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے اور مما کے ہاتھ کے پکے کھانے بہت شوق سے کھاتی ہوں، گھر سے باہر کھانا کبھی کبھار ہی کھاتی ہوں۔"

"میوزک سے لگاؤ تو ہو گا؟"

"جی بالکل ہے...... آج کے دور میں کون نوجوان ہو گا جس کو میوزک سے لگاؤ نہ ہو، بلکہ ہر دور میں میوزک روح کی غذا رہی ہے۔ تو مجھے بھی شوق ہے، مگر موڈ کے لحاظ سے میری پسند بدلتی رہتی ہے، ایسا نہیں کہ ہمیشہ پاپ اچھے لگے یا غزلیں، جیسا موڈ ہوتا ہے ویسی ہی میوزک سنتی ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عائزہ خان سے اجازت چاہی۔

*

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخر شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمے ہے۔ جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں، اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے، جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کرپاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے، جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی

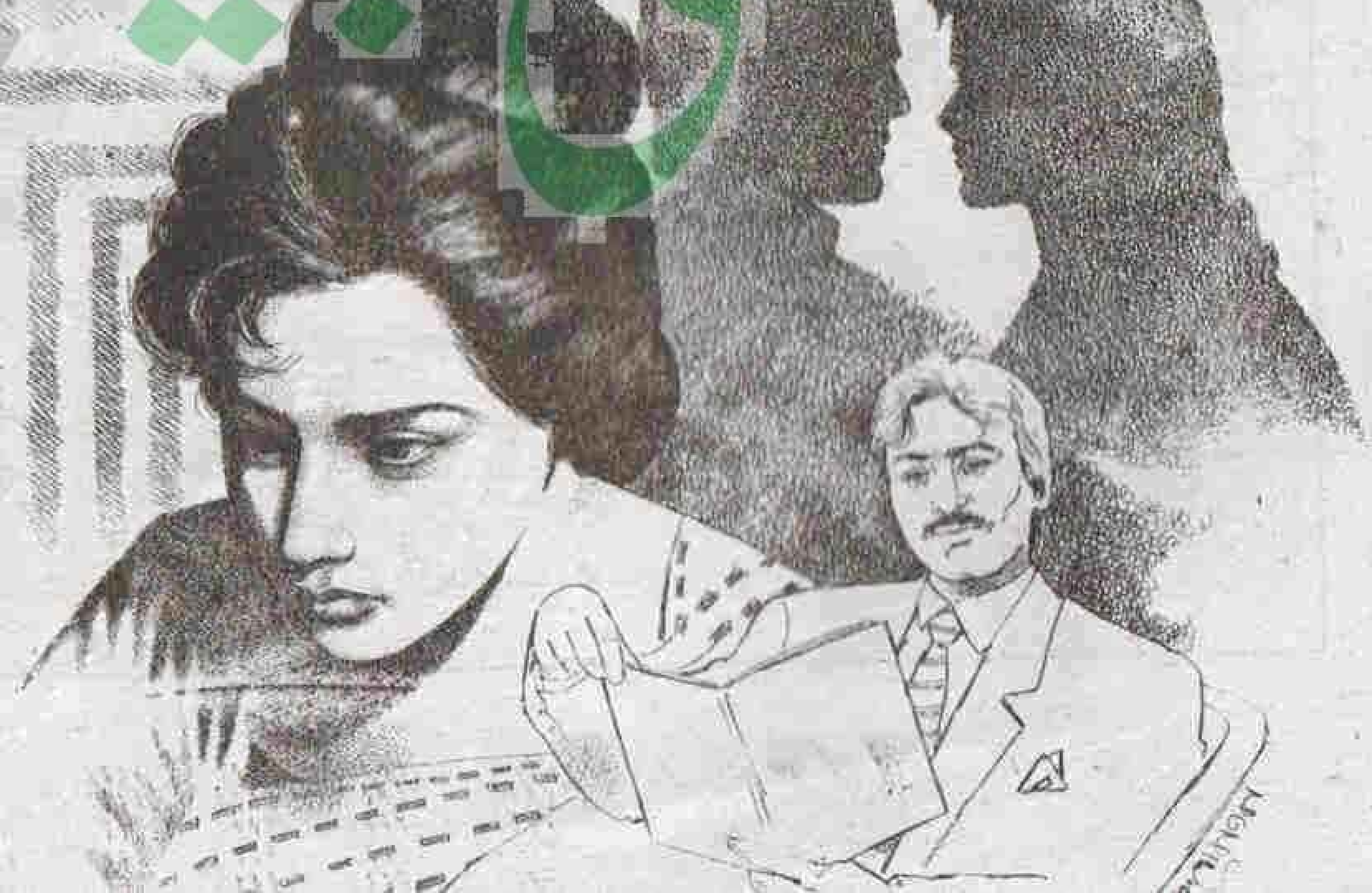

علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے، وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف آسان ہو جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲۶

چھبیسویں قسط

صبح سے اس کے خیالات بے ربط ہو رہے تھے۔ الجھے ہوئے، گنجلک سروں کا وہ ایک کونا پکڑتا تو دوسرا ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ ادھر کچن کے اسٹوو پر رکھی کیتلی ایک تسلسل سے سیٹی بجا رہی تھی۔

”مجھے بھی دیکھو، میری بھی سنو۔“ میز پر کھلی اور جا بجا ٹیگ کی ہوئی جمال کی فائل کہتی تھی ”مجھے بھی دیکھو، میری بھی سنو۔“

”آخر کس کس کی سُنے انسان۔“ کافی کے خشک بھورے سفوف پر ابلتا پانی ایک دھار سے گراتے فاروق نے قدرے اکتاہٹ سے سوچا۔ مگ کے کنارے مٹیالے جھاگوں سے لبریز ہو گئے اور کسی ایک طرف بھی اس کی توجہ مکمل طور پر مبذول نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ مگ اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی موبائل کی اسکرین روشن تھی۔ اس نے بے پروائی سے دیکھا۔ وہاں حروف نہیں ہندسے جل بجھ رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں نم ہوتا بھاپ اڑاتا مگ تھامے اور دوسرے ہاتھ میں کان سے لگائے موبائل کے اسپیکر سے جو آواز ابھری، اس کی توقع وہ کسی قیمت پر بھی نہیں کر رہا تھا۔

”میں شہریار بول رہا ہوں۔ کسی کام سے اسلام آباد آیا تھا، سوچا تم سے ملتا جاؤں اگر تمہارے پاس وقت ہو۔“

”وقت ہی تو ہے میرے پاس۔“ اس کی آواز میں اتنی ایکسائٹمنٹ کہاں سے آ گئی تھی۔ اس کے اپنے کانوں نے بھی خود کو صبح سے پہلی دفعہ اس بے ساختگی سے خوش ہوتے سنا تھا۔

”میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔ اگر تم نے بھی نہیں کھایا تو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”اگر تم بہت انگریز نہیں ہو تو تمہاری طرف آ جاتا ہوں۔“

”بولو! تمہیں کہاں سے پک کروں؟“

”میرا کوئی مسئلہ نہیں، میں با آسانی تم تک پہنچ جاؤں گا لیکن میرا خیال تھا، ہم سڑکوں پر پھریں گے۔ دراصل آج میں تمہاری آنکھ سے اسلام آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔

”اس کا مطلب فیصلہ کر آئے ہو کہ اسلام آباد کو ناپسند کر کے جاؤ گے، آؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”کیا چیز مشترک ہوتی ہے کچھ لوگوں میں۔“ اس نے ـــــ کافی سے بھرا مگ اپنے سامنے رکھتے لمحے بھر کو سوچا۔ ”کہ فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔“

”غالب ندیم دوست ـــــ۔۔۔۔۔“

کتنی دیر گزر گئی مگر اس نے ایک گھونٹ نہیں بھرا تھا۔ کرسی گھسیٹ کر مگ سامنے دھرے اس نے عادتاً ہی غالب کا مصرع دہرایا تھا۔ معلوم نہیں اس سمت سے، جو ہوا چلتی ہے، وہ کیوں خوشبوؤں بھری مہک سے اس قدر بوجھل ہوتی ہے۔ فضا میں کچھ دیر مہکے، پھیلی کافی کی سوندھی باس اب بجھ کے رہ گئی تھی۔ مرغولوں کی شکل میں مگ سے اٹھتے بھاپ کے گیلے جھونکے فضا میں کہیں تحلیل ہو کر غائب ہوئے۔ سب پر حاوی تھا تو ایک انتظار۔ وہ کب آتا ہے۔ چپ چاپ سامنے پڑی کافی سے اس نے ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

”دنیا کی سب سے بدذائقہ چیز ٹھنڈی ہو گئی ہوئی کافی ہے۔“

کم از کم ایک حتمی فیصلہ تو اس نے کیا۔ خواہ وہ اس تلخ، نیم گرم مشروب کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔

اتنے دن ان لوگوں کے درمیان رہتے۔ وہ شہریار کے مقام سے اچھی طرح آگاہ ہو گیا تھا۔ ان سب کی گفتگو میں ہر چوتھا پانچواں جملہ شہریار سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ خود اس دن کی ادھوری سی ملاقات کے بعد اس کے بارے میں لاتعداد مرتبہ سوچ بیٹھا تھا۔

”مشغول ہوں بندگی بوتراب میں۔۔۔۔۔“

واہ غالب صاحب آپ بھی کمال ولی تھے، آپ کو کیسے پتا چلا، پونے دو سو سال بعد ایک شخص ہائی رائز فلیٹ کے

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

ایک خاموش اور اداس کمرے میں ابھرنے والی ایک انجانی نئی چاپ کا اس شدت سے منتظر ہو گا۔" اس کو تواتر سے دھڑکتی ہوئی دھڑکنوں کے درمیان شبہ پڑا کہ کہیں کہیں سے کوئی بیٹ غائب بھی ہو رہی ہے۔

"غالب ندیم دوست سے......"

"حد ہوتی ہے بچپنے کی......" اس نے خود کو جھڑکا۔

* * *

فاروق نے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے نیچے جھانکا گول گھماؤ والے چوک کے اوپر ایستادہ جیومیٹریکل ڈیزائن کا خوب صورت نقش سیمنٹ کے دائرے کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ہر چیز چھوٹی اور حقیر نظر آتی ہے۔ ٹریفک اس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے کہ لگتا ہے وہی گاڑیاں ہیں جو اس گول چکر کے گرد دیوانہ وار گھوم رہی ہیں۔ چوغوں کے پھولے پھولے گھیروں کے ساتھ...... دیوانہ وار...... می رقصم بانچے ہیں جو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک ہی دائرے میں گول گول گھومتے ہیں۔

Ringo Ringo Roses

یا پانی کے تسلے میں موم بتی کے ٹکڑے سے چلنے والی کشتی گھومتی اور تڑاتی جاتی ہے۔

اپنے طور پر تو انسان بڑا طویل سفر طے کر آیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ایک دائرے کے گرد ہی گھوم رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے۔ اس نے پھر سوچا اس کے خیالات خطرناک حد تک بے ربط ہو رہے ہیں۔

وقفے وقفے سے سرکاری گاڑیاں بھی گزرتی ہیں جن کے پیچھے سیکیورٹی گارڈز ہوٹرز بجاتے دوڑتے ہیں۔ وہ اس قدر بوکھلائے ہوئے ہیں کہ گاڑی کے شیشے سے ہاتھ باہر نکال کر حقیر گاڑیوں میں ست روی سے چلنے والے سفید پوشوں اور آہستہ قدم دھرتے رزق کی دھن میں مگن پیدل چلنے والوں کو حقارت سے سڑک سے ایک طرف ہو جانے کے اشارے کرتے ہیں۔

"پرے پرے...... وقت نہیں ہے ہمارے پاس، نیچے آکر کچلے جاؤ گے کیڑے مکوڑو۔ ہم تو تمہارا بھرتا بنا کر گزر جائیں گے، خوامخواہ تم کھڑی گاڑیاں جلاتے پھرو گے، عمارتوں کے شیشے توڑو گے لیکن پرے ہٹو ہم جلدی میں ہیں۔"

وہ کسی ٹیکسی کے انتظار میں تھا یا کوئی جیپ جو سامنے پارکنگ میں آکر رکے گی۔ لیکن گاڑیوں کا ازدحام تیز رفتاری سے گول گھومتا مرکز کی طرف رواں دواں تھا۔ جہاں تقریباً" سب ہی چین فوڈ سینٹرز تھے، دو کانوں پر رکتی گاڑیاں، بچوں اور نوجوانوں کے گروہ، دروازوں اور شیشوں کے پیچھے غائب ہو جاتے۔ ننگے پاؤں، ہاتھ پھیلائے بچے ان کے پیچھے چند قدم بھاگتے، پھر کسی اگلی رکنے والی گاڑی کی طرف لپک کر آجاتے۔ دنیا کس قدر جلدی میں ہے۔

"وقت نہیں ہے جلدی جلدی......" نذرل کے وقت میں بھی وقت اس قدر کم یاب تھا؟

اس نے باپ کی محبت میں بنگالی سیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نااہل شاگرد ثابت ہوا۔ بابا کے سارے حوالے پٹ سن، پانی، موسلی، جھینگے، ملاح اور نذرل تھے۔ وہ کانٹوں والی مچھلی اس مہارت سے کھاتے تھے کہ ان کے حلق میں آج تک کوئی کانٹا نہیں اٹکا۔ ابھی وہ قتلے ٹٹول کر ان کا بھرکس نکال رہا ہوتا یا کسی دبے ہوئے خفیہ کانٹے کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارتا کہ بابا دوسرا قتلہ اٹھا چکے ہوتے تھے۔

بنگال نے ان کو عاق کر دیا تھا، لیکن بنگال خود کو ان کے دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ آج بھی جب وہ فاروق سے کہنا چاہتے تھے کہ "بیٹا ذرا ہاتھ تیز چلاؤ، میرے پاس وقت نہیں ہے۔" تو غالب کے کسی مصرعے کی طرح وہ نذرل کو دہراتے۔

“بیلا نانی رے، جولدی جولدی۔”

اور وقت ہے کہ کس تیزی سے بھربھری ریت کی طرح بند مٹھی میں سے پھسلا جاتا ہے۔ وقت صرف گزرتا ہے یا بدلتا بھی ہے؟ اور بدلتا ہے تو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔

صبح اس کی غیر موجودگی میں ہدایت اللہ آجاتا تھا۔ اس کو پتا تھا صاحب چابی کہاں چھپا کر جاتا ہے، پہلے وہ ادھر ادھر جاسوس نظروں سے کھوجتا کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر فٹ میٹ کے نیچے سے چابی نکال کر فلیٹ کا دروازہ کھولتا اور فاروق کے واپس آنے سے پہلے وہیں چھپا کر واپس چلا جاتا۔ ان ہی چور نظروں سے لوگوں کو شوقیہ شک میں مبتلا کرتے..... اور نہیں جانتا تھا کہ سارے بیچلرز اپنی چابی ایسے ہی کسی فٹ میٹ کے نیچے یا کسی اوندھے پڑے گملے کے پیچھے چھپا کر جاتے ہیں۔ اور چور بھی یہ راز خوب جانتے ہیں۔

جب سے وہ میس چھوڑ کر فلیٹ میں شفٹ ہوا تھا۔ ہدایت اللہ ساتھ ہی نتھی ہو گیا تھا۔ وہ ذہین، سیکھنے والا تھا یا اس کی ٹریننگ ماہر ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ ویکیوم لگانا، اسٹیک کو اوون میں ڈالنا، ہم کر کو ریشر دینا اور اس کے گھر کے واحد بیڈ روم کو چمکا کر اور اجال کر جاتا۔ کچن کے ریک چمک رہے ہوتے اور برتن قرینے سے شیلف میں اسکول کے بچوں کی طرح قطار میں دھرے رہتے۔ فریج میں اسٹاک لیے شیشے کے برتنوں پر ترتیب وار پیپر ’منگل، بدھ کی پرچیاں‘ چسپاں ہوتیں، یہ ماں کا کارنامہ تھا۔ وہ کبھی کبھار آتیں نگران کی آمد کا احساس جگمگاتی ٹاب سے لے کر دیواروں سے لٹکے بلب تک جھلکتا تھا۔ ساتھ ساتھ ہدایت اللہ کی شامت آتی، کونوں میں چھپی مٹی کی تہہ، کواڑوں کے پیچھے قبضوں میں دھنسے، نظر نہ آنے والے جالے، ہدایت اللہ جھنجلا جاتا۔

“آپ صاحب کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟” وہ ایسے بڑبڑاتا جیسے قائم مقام بیوی کا کردار ادا کرتے عاجز آگیا ہو۔

“تم اس کو کہو نا! کوئی لڑکی ڈھونڈے۔”

“میرے خیال سے لڑکی تو کوئی انہوں نے ڈھونڈ لی ہے۔” وہ ایگ بیٹر کی موٹر آف کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

“کون ہے وہ لڑکی؟ یہاں آئی تھی کیا؟ کیسی ہے؟”

“نہیں خیر! آئی تو نہیں، میں نے دیکھی بھی نہیں لیکن نظر آتا ہے صاحب کچھ بدل گیا ہے۔ اکثر کھڑکی میں کھڑا چاند دیکھتا رہتا ہے۔”

“حد کرتے ہو ہدایت اللہ!” وہ پھر ناامیدی سے اپنے سوفلے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ “کیا اس کی چاند سے شادی کردوں؟”

“یہ بات نہیں ہے۔” وہ اڑا رہا۔ “جب کوئی لڑکی پسند آجائے تو لوگ چاند کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔”

“لیکن چاند دیکھ کر کرتا کیا ہے؟ گانا گاتا ہے؟” انہوں نے ماوے میں آئسنگ شوگر گراتے سنجیدگی سے پوچھا۔

“آپ مذاق اُڑا رہی ہیں۔ دیکھ لیجیے گا۔ یہ بات سچ ثابت ہو گی۔”

“تمہارے زمانے کی فلموں میں ایسا ہوتا تھا ہدایت اللہ! اب محبت ایسے نہیں ہوتی۔” انہوں نے سفید برف کی سی چوٹیوں جیسا سوفلے فریزر میں رکھتے کہا۔

“اب شادی بھی ایسے نہیں ہوتی۔ آدھے گھنٹے بعد نکال لینا اور شیلف سے یہ چھینٹے صاف کر دینا۔”

“اب ازراہ کرم میرے ملازم کو بگاڑنے کی کوشش مت کیجیے۔” وہ خفگی سے بڑبڑاتا کہیں سے نمودار ہوا۔

“تمہیں تو بگاڑ نہیں سکی، اتنی اجازت تو دو کہ تمہارے ملازم کو ہی بگاڑ دوں۔ بڑی حسرت ہے۔ ویسے وہ چاند والے واقعے کی سچائی کیا ہے؟ چاند ہی دیکھتے ہو یا سامنے والی کھڑکی میں کوئی ٹکڑا رہتا ہے؟”

وہ یہاں ہوتیں تو جیسے یہ بے آباد سا گھر جگمگا اٹھتا تھا۔ دو کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے وہ ان کو یہاں سے وہاں متحرک دیکھتا رہتا۔ غسل خانوں میں اس کی دیواروں کی ٹائلز کسی سفید سفوف سے چمکاتے وہ بڑے سائنسی سے گلے جاری رکھتیں۔

“تمہاری جینز میں تنہائی داخل ہو گئی ہے۔ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے فاروق! اپنے باپ کی طرح اپنی ذات کے عشق میں زندگی نہ گزار دینا۔”

“ٹکڑا چاند کا نہ بھی ہو تو مجھے قبول ہے۔ انسان کا بچہ ہو۔” وہ پکے ہوئے کھانوں پر کلنگ ریپ چپکاتے باورچی خانے کے کونے سے آواز لگاتیں۔

“ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ عشق کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ سمجھ رہے ہو نا!”

“جی سمجھ رہا ہوں۔” وہ بے دھیانی سے کہتا۔

“اچھا! ایک بات تو بتاؤ۔” وہ چھوٹے تولیے سے ہاتھ خشک کرتی اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھتیں، ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ ٹکائے اسکول گرلز کے سے بھول پن سے وہ اس سے پوچھتیں۔

“یہ عشق کیا ہوتا ہے؟ کیا جاتا ہے باقاعدہ منصوبہ بنا کر یا بس ہو جاتا ہے؟”

“کبھی کیا تو ضرور بتاؤں گا۔”

“ابھی کیا نہیں تو وہ چاند والا قصہ کیا ہے؟”

“آپ سنجیدہ ہو گئیں، چاند جیسے بے ہودہ واقعہ پر ہدایت اللہ کے بیان سے۔” اس نے مصنوعی حیرت طاری کرتے بھنویں اچکائیں۔

“چاند والے واقعہ پر تو نہیں۔ لیکن ہدایت اللہ والے بیان پر ہاں!”

وہ چمکتی میز کی ملائم سطح پر کہ جس پر گرد کا شائبہ بھی نہ تھا، نامحسوس سی لکیریں کھینچتی ایک دم جیسے بہت سنجیدہ نظر آئیں۔

“اب ایک بات میں بھی بتا دوں اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا تو میں جانتی ہوں، تم مجھے نہیں اپنے باپ کو بتاؤ گے۔”

“یہ اچانک فاصلوں پر کیوں چلی جاتی ہیں آپ؟”

“اس لیے کہ فاصلے تو بہرکیف ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ پیدا بھی ہم نے خود ہی کیے ہیں۔ دیکھو فاروق! شادی بہرحال اپنی خوشی کے لیے کرنی ہے۔ اگر اپنے ماں اور باپ دونوں کو خوشیاں دینے کی کوشش کرو گے تو یہ بھی نہ بھولنا کہ ہم میں کچھ بھی کامن نہیں۔ ہماری خوشیاں ایک دوسرے سے مختلف، ہمارے غم جدا، ہماری دلچسپیاں ساؤتھ نارتھ پولز، ہم نے زندگی میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں بولا جس کے بعد دوسرے نے کیا مطلب؟ نہ کہا ہو۔ یاد رکھو ہم دو بالکل مختلف ہستیوں کو بیک وقت خوش نہیں کر سکتے۔”

وہ برق رفتاری سے اٹھیں جیسے کوئی ادھورا کام اچانک یاد آیا ہو۔ اس کے بستر سے سلوٹیں دور کرتے، اس کی طرف پشت کیے انہوں نے دھیمے سے کہا۔

“ہم دونوں تمہارے مجرم ہیں۔ اپنے حصے کی معافی میں تم سے مانگتی ہوں اور اس کا اعتراف تو کر ہی چکی ہوں کہ اس نے تمہیں بہت شاندار انسان بنایا ہے۔”

پھر وہ اسی تیزی سے پلٹ آئیں۔ ان کی پلکیں ہلکی سی نم تھیں۔

“کیا نام ہے اس کا؟”

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

"کس کا؟" فاروق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"اسی چاند کے ٹکڑے کا جو سامنے والی کھڑکی میں رہتا ہے۔"

"لاحول ولا...... میں سمجھا' بابا کا نام پوچھ رہی ہیں۔"

* * *

"کہاں سے آرہے ہو؟" انہوں نے ایک نظر اس کی دھج کی طرف دیکھا "یا کہیں جارہے ہو؟" انہوں نے کاغذوں کے ڈھیر سے لمحے بھر کے لیے ہی سر اٹھایا تھا۔

"مجھے یقین تھا آپ یہیں ملیں گے۔ اب تک دفتر میں بیٹھنے کی وجہ؟"

فاروق نے کرسی گھسیٹ کر سامنے بیٹھتے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ مسلسل کام نے ان کے چہرے کی شادابی نوچ ڈالی تھی۔ اسے رنج سا ہوا' کتنا پیارا آدمی ہے' کس بے دردی سے خود کو برباد کیے دے رہا ہے۔

انہوں نے ہلکا سا توقف کیا۔ "پہلے میرے سوال کا جواب دو۔"

"مجھے کہاں جانا تھا' میٹنگ تھی۔ اٹھا تو سیدھا اس طرف آگیا اور اب آپ یہ ریزگاری گننا بند کریں۔ اس نے آپ کو بہت تھکا ڈالا ہے۔ میرے پاس آکر رہیں۔ کچھ دن آرام کرلیں۔"

انہوں نے پین کا ڈھکنا بند کرکے جیسے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے' وہ کچھ دیر اپنے آپ میں مسکراتے رہے۔

"اول تو تھکے بغیر آرام کرنے کا تصور میری ڈکشنری میں نہیں ہے۔ نمبر دو تمہارے گھر آکر میں کیا کروں گا۔ تمہارا ملازم مجھے ہر وقت روکتا ٹوکتا رہتا ہے۔ میں اپنی پلیٹ بھی دھونے کھڑا ہو جاؤں تو ایسے تڑپ اٹھتا ہے جیسے میں اس کی ملازمت پر ڈاکا ڈالنے آگیا ہوں۔ نمبر تین مجھے اسلام آباد کا مزاج ہی پسند نہیں۔ عجیب شہر ہے۔ لگتا ہے غلطی سے میانی صاحب آنکلا ہوں۔"

انہوں نے سرکائی ہوئی فائلیں واپس گھسیٹیں۔ عینک دوبارہ ناک پر رکھی۔ ان عقابی کوند والی آنکھوں سے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

"ٹلو میرے سر سے...... میں تمہاری طرح سرکاری ملازم نہیں ہوں کہ عیش کرنے کی تنخواہ لوں۔"

"آج بروز ہفتہ جب آپ کا سارا عملہ عیش کرنے کی تنخواہ لے رہا ہے تو آپ اکیلے ہی غیر سرکاری کیوں؟"

"یہ میرے انکم ٹیکس ریٹرن ہیں اور GST میں کچھ گڑبڑ لگتی ہے' لہٰذا آپ تشریف لے جائیے۔ رات کے کھانے پر آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔"

انہوں نے جو کہنا تھا کہہ دیا پھر اس کے وجود سے بے خبر ہوچکے تھے۔

* * *

"کہاں جاتے ہیں عموماً" یہ راستے؟" اس نے چوک پر کھڑے ہو کر ہر طرف بچھے راستوں اور زمین میں اترتی سرنگوں جیسی سڑکوں کی طرف دیکھتے تشویش سے سوچا۔ راستوں کا انتخاب بھی کیسا تکلیف دہ مرحلہ ہے۔

"ایہا الناس......" اس نے ادھورا سا لفظ دہرایا وہ چچا عبدالعزیز کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس کی توقع کے عین مطابق پبلک سیڑھیوں پر میلہ لگائے بیٹھی تھی۔ جہاں برآمدے میں جلنے والی روشنی کی راڈ جس پر بھنگوں پتنگوں کا ازدحام بھی منڈلا رہا تھا' ان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ عبیرہ اپنی دوست کے ساتھ کسی لایعنی تقریر میں الجھی تھی۔ رضا نے شاید اس کے آنے کا اعلان نہیں کیا تھا کیونکہ ان سب کے چہروں پر اس کو اچانک دیکھ لینے کی حیرت بھری خوشی امڈی تھی۔

"یہ کتنے بھلے لوگ ہیں۔" اس نے ایک مرتبہ ان سب کے بارے میں نہایت فرصت سے سوچا تھا۔ "چشم ماروشن دل ماشاد۔" قسم کے...... ہر ایک کو سمیٹ لینے والے۔ جیسے چھت پر سونے والے دنوں میں بابا اس کو پودنے کی کہانی سناتے تھے۔ "گھس گھس! میرے کان کی کوکرو میں گھس......" ہاتھی' شیر' چیونٹی' دریا ایک ننھے سے پودنے کے کان میں کیا کیا کائنات سمائی تھی۔

اس نے دوائے درد دل بیچنے والے کے گرم جوشی سے بڑھے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسی کان کی کوکرو میں ایک کونے میں اپنا رومال بچھا کر بیٹھ رہا۔

البتہ بیٹھنے سے پہلے وہ جو لمحے بھر کو ایک سایہ ڈاکٹر صاحب کے چہرے سے گزرا' وہ لمحہ جیسے غلطی سے اس کی گرفت میں آگیا تھا۔ ایک لمحہ ہی ہوتا ہے اگر اتفاق سے وہ کسی اور طرف دیکھ رہا ہوتا یا کسی اور حسن اتفاق سے اسی وقت اس کی پلکیں جھپک گئی ہوتیں یا کاش اس دن وہ وہاں آیا ہی نہ ہوتا' تاریخ کے اس حصے سے بے خبری ایک نعمت رہتی۔

"آپ بھی اپنے خواب بیان کیجیے۔" ڈاکٹر نے اصرار کیا تھا۔

"اچھی بات ہے ڈاکٹر صاحب!" اس نے سوچا "کاش مجھ میں بھی ایسی اعلا ظرفی ہوتی۔" وہ مسکرا دیا ایک طویل معنی خیز مسکراہٹ۔

"ان میں سے بچپنا ابھی ختم نہیں ہوا۔ یہ ابھی تک ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنے اپنے حصے کا تھیٹر دہراتے رہتے ہیں۔ اللہ ان سب کی معصومیت برقرار رکھے۔"

وہ خلوص نیت سے دعا کرتا' اس بحث کا حصہ بن گیا جو ٹاک شوز دیکھ دیکھ کر ان سب کی رگوں میں سرایت کر چکی تھی۔

* * *

"تم اس طرف گئے نہیں؟"

"کس طرف؟" اس نے بے دھیانی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسی طرف جس کے خیال سے تمہارے چہرے پر اسٹرابری آئس کریم والا فلیور دکھائی دے رہا ہے اور تم ضرورت سے زیادہ بے توجہی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔"

"میں نے آپ کو پہلے بھی مشورہ دیا تھا' اپنے آفس کے باہر ایک کھوپڑی اور دو ہڈیوں والا بورڈ لگالیں۔ آدھے بنگالی بابا تو آپ ویسے بھی ہیں۔"

"عباس سے ملے تھے؟ کیسا ہے وہ؟"

"نہیں مل سکا۔ وہ سب لوگ باہر سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ میں باہر سے ہی واپس آگیا۔"

"اندر جانے پر پابندی لگادی ان لوگوں نے؟"

"جی ہاں! وہاں بورڈ پر بڑا بڑا لکھا تھا۔ "یہ شارع عام نہیں ہے' خلاف ورزی کرنے والا حوالۂ پولیس کیا جائے گا۔""

"تم عام تو نہیں ہو یا حوالہ ہونے سے ڈرتے ہو؟" وہ سوپ کا چمچ منہ میں لے جاتے رک گیا۔

"بابا! آپ تو خطرناک ہوتے جارہے ہیں۔ آپ خود کیوں نہیں گئے ابھی تک وہاں؟ آپ بھی تو عام نہیں ہیں؟"

"ضرور چلتا۔ تم نے اب تک مجھ سے کہا ہی نہیں تھا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے نیپکن اور پلیٹ رکھتے پرجوش لہجے میں کہا۔

"چلیں گے آپ؟"

"تم کہوگے تو ضرور۔ ویسے تو یہ کام تمہاری ماں کا ہے۔"

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"مجھے یقین ہے' میرا بیٹا مسخرہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

فاروق کچھ دیر کے لیے چپ ہوگیا جیسے اس ساری بے سروپا بحث سے باہر نکلنا چاہتا ہو۔

"آپ مل کیوں نہیں لیتے سر سے؟"

"سوچا تھا' ملوں گا۔" وہ قطعی سنجیدہ ہوگئے۔

"جب پاکستان اپنے مسائل سے نمٹ کر ترقی کر رہا ہوگا اور ہم اپنی اپنی الجھنوں سے آزاد ہو چکے ہوں گے۔ لوگ فخر سے سر اٹھا کر اپنے وطن کی طرف دیکھیں گے۔ یہاں خوشحالی ہوگی۔ امن و امان ہوگا۔ ہم ایسے ہی بچکانہ خواب دیکھنے والے لوگ ہیں۔ اب اس سے کیا ملوں۔ کس طرح اس کا سامنا کروں' جب اور پیچھے اور پیچھے ہٹتے دیوار سے جا لگے ہیں۔ جس طرف سر گھماؤ سازشی' بے ایمان لوگ جونکوں کی طرح چمٹے خون چوستے' گدھوں کی طرح لاشوں پر منڈلاتے' اتنے گدھ کہ آسمان سے ختم ہوگئے ہیں' ہم دونوں ایک دوسرے کا سامنا کر ہی نہیں سکتے۔"

"کیا اس میں آپ دونوں کا قصور ہے؟"

"شاید ہے۔ ظلم صرف یہ نہیں ہے کہ ظلم کیا جائے۔ روایت ہے کہ ظلم سہنا بھی ظلم ہے۔"

"ہم تو نسلوں کے ظالم ہوئے پھر۔" فاروق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کبھی کبھی مجھے یہ سوچنا بڑا عجیب لگتا ہے کہ ہم بار بار یہاں بیٹھ کر یہ کہانی دہراتے ہیں اور وہ مجھے پہچانتے بھی نہیں۔"

"اس غلط فہمی میں مت مارے جانا۔ وہ تمہیں نہ پہچانتا تو تمہیں اتنی جرات نہ دیتا کہ تم آؤ اور اس کی سیڑھیوں پر پاؤں پسار کر بیٹھ جاؤ۔ قدیم زمانے کی بات ہے۔"

وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

"اب تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ قبل مسیح کی ہے یا فرعون کے زمانے کی یا تب کی جب نوح اپنا سفینہ تیار کر رہے تھے۔ ہم آدھی کامیابی حاصل کرنے والے لوگ کسی کو راہ سے ہٹا تو دیتے ہیں مگر اس سے بدتر کو کاندھوں پر اٹھائے نعرے لگاتے ہجوم میں شامل ہو جاتے ہیں جیسے ایک پہیہ چل رہا ہو یا جیسے کسی ٹیکنیکل خرابی سے ایک ہی منظر ساکت ہوگیا ہو۔ اب اسی منظر میں اسی گھومتے پہیے کے گرد میں اس سے کیا ملوں؟"

"پتا نہیں ہم نے کب سے تاریخ کو فریزر میں جما کر رکھا ہوا ہے۔ آپ کے زمانے سے میرے زمانے تک تاریخ جیسے ٹھٹھری ہوئی ساکت پڑی ہے۔ میں جمال کیس میں اس کی فائل دیکھ رہا تھا۔ اس کے فرد جرم پر جو تاریخ درج ہے وہ 2011ء ہے' لیکن لگتا تھا یہ واقعہ 1970ء کا ہے یا حد سے حد 1980ء کا۔ میرے خیال میں واقعات وہی رہتے ہیں۔ بس ریفرنس نمبر بدل جاتے ہیں۔ آج بھی ایک محب وطن پاکستانی ہمیں نہیں چاہیے۔ کیونکہ وہ شور مچاتے ہیں' واویلا کرتے ہیں ہاں اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ چپ بیٹھا اپنے اندر کڑھتا رہے گا تو ہمیں زیادہ شکایت نہیں ہوگی کیونکہ اپنے دل کے جلانے پر ہمیں اپنا پورا حق اور اختیار حاصل ہے۔ جمال ایک گمنام شخص ہے لیکن اپنے وقت کا استعارہ ہے۔"

"وہ کورٹ کیوں نہیں جاتا؟"

"شاید اس لیے کہ کورٹ اٹھارہ کروڑ مقدمے ہر روز نہیں نمٹا سکتی۔ یہاں کون دکھی نہیں؟ آپ دیکھیے! وہ

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

اپنے حقیر سے حقیر ایجنٹ کی بھی حفاظت کرتے ہیں اور ہم نے اپنے لوگوں سے بھی ہاتھ اٹھالیا ہے۔ عجیب بات ہے، وہ جتنے مالک کے وفادار ہیں، اس شدّت سے ملک کے وفادار نہیں۔ کیا ہر آدمی کی کوئی قیمت ہوتی ہے بابا؟ ہر آدمی بکاؤ ہے؟ ہر خواہش، ہر خواب سیل پر لگا ہوا ہے۔ کٹ تھروٹ سیل، کھڑکی توڑ ہفتہ، ایک خریدیں ایک مفت حاصل کریں۔ کتنے بے قیمت ہوگئے ہیں ہمارے خواب۔“

* * *

”یہ سیدھی چوڑی شاہراہ ایک اہم موڑ پر بند ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے راستے کہیں نہیں جاتے۔ غور کرو شہریار! اور میری آنکھ سے اسلام آباد کو دیکھو۔

یہ پارلیمنٹ ہے، آپ اس سے بچ بچا کر دائیں بائیں نکل سکتے ہیں لیکن پھر آگے راستے بند ہیں۔ لوگ اس کو بحال کرنے کے لیے سالوں جدوجہد کرتے ہیں، جانوں سے کھیلتے ہیں، قید ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ گولیاں کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، لیکن جب ان لوگوں کو آپ باہر سے اندر لے کر آتے ہیں تو سب سے پہلے وہ آپ کو قید کرتے ہیں، آپ پر گولیاں چلاتے ہیں اور ان کے ساجھی بنتے ہیں جن کے خلاف آپ اب تک جدوجہد کرتے آرہے تھے۔ قربانیوں سے ان کو دلچسپی نہیں کیونکہ یہ ان کو نوازتے ہیں جہاں سے تیر آرہے تھے۔

ایک کہانی کی روایت ہے، کسی بادشاہ کا فقیرنی پر دل آگیا۔ تم جانتے ہو بادشاہ دل ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ وہ اس کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ بیاہ کا لفظ میں نے رفع شر کے لیے استعمال کیا ہے۔ پتا نہیں بیاہ کر لایا یا بس لے آیا۔ اس کو نہلا دھلا کر خلعت فاخرہ پہنائی گئی۔ یار شہریار! خلعت فاخرہ صرف مردوں کا لباس ہے یا عورتیں بھی پہن سکتی ہیں؟ خیر! خوب صورت تو تھی ہی، بج سنور کر بالکل ملکہ لگنے لگی۔ میرا یہ مسئلہ بھی حل کرنا، سب ملکائیں چندے آفتاب، چندے ماہتاب کیوں ہوتی ہیں؟ کوئی معمولی شکل و صورت کی گھٹی ہوئی، بادشاہوں کے گھر کیوں پیدا نہیں ہو سکتی؟ تو راوی بیان کرتے ہیں، رات ہوتی اور سارا محل سوجاتا تو وہ طاقچوں پر سکے رکھ دیتی، اپنا بھکارن کا لباس پہن کر کشکول اٹھائے، ہر طاقچے سے سکے مانگتی تھی۔ کسی کسی طاقچے پر وہ سکے رکھتی بھی نہیں ہوگی کہ دھتکارے جانے کی حسرت بھی پوری ہوتی رہے۔

تو اس کہانی سے یہ سبق ملا، انسان اپنے اصل کی طرف دیوانہ وار پلٹتا ہے۔ سو یہ سڑک جس عمارت پر ختم ہوتی ہے وہاں کوئی نہ کوئی بھکارن کا لباس پہنے کشکول ہاتھ میں اٹھائے۔ آگے تم خود سمجھ دار ہو کیونکہ یہ ریڈ زون ہے۔“

* * *

”چین نے جب کلوزڈ ڈور پالیسی اپنائی تو اپنے دروازے بند کر لیے تھے اور جب ایک ”کھل جا سم سم“ کے طلسم نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ دس ماہ میں دس عظیم الشان عمارتیں کھڑی تھیں جن کی تعمیر دس سال میں بھی ممکن نہیں تھی، یہ ہمارا Tenamen square ہے۔ اس شاہراہ پر ہماری بھی دس عظیم الشان عمارتیں ہیں۔ میں نہیں جانتا، ان میں بسنے والے لوگ بھی عظیم الشان ہیں کہ نہیں۔ کیونکہ یہاں کے باسی ان محلوں میں رہتے ہی نہیں، انہوں نے محلوں کے اندر بڑے بڑے بنکرز تیار کر رکھے ہیں۔ دولت آپ کی قسمت کی لکیروں میں ہے، مگر نصیب میں نہیں۔۔۔

جن تمام عمارتوں کی سامنے والی سڑکیں ہم سریا اور سیمنٹ کی مضبوط دیواروں میں بند دیکھ رہے ہو، یہ سب وہ لوگ ہیں جو حکومتِ پاکستان سے ہماری حفاظت کی بھاری تنخواہ لیتے ہیں اور ہمارے خوف سے اپنی محفوظ پناہ گاہوں سے باہر نہیں آتے اور بھاری تنخواہ سے اگر تمہیں غلط فہمی ہو، میری یا تمہاری تنخواہ یا ہم دونوں کی مجموعی

تنخواہ تو ایسا نہیں ہے۔ تاہم ہم دونوں کی تنخواہ کو آپس میں ضرب دے دیا جائے تو حاصل ضرب آس پاس ہوتا ہے۔

راولپنڈی میں اس سے بھی زیادہ احتیاطیں ہیں۔ دیواروں سے باہر مزید دیواریں ہیں۔ ان سے باہر لوہے کے خاردار گچھے ہیں اور ان گچھوں سے بھی آگے سڑک بند کرنے کے لیے بلاک کھڑے ہیں۔ ان حفاظتوں کے باوجود آپ اس سڑک کے برابر سے گزر نہیں سکتے کیونکہ آپ Who the hell bloody people ہیں۔ یہاں جگہ جگہ آپ کو ایسے گھر ملیں گے جن کو چاروں طرف سے لوہے کی مضبوط گرل نے جکڑ رکھا ہے۔ اس گھر کے سامنے والی معمول کی سڑک بھی ٹریفک کے لیے بند کردی جاتی ہے۔ اگر اتفاق سے آپ کا گھر اسی گلی میں ہے تو آپ کہیں دور دراز کا راستہ تلاش کرتے براہ راست اپنے گھر کی چھت پر اتریں کیونکہ مملکت خداداد پاکستان کی سرزمین پر سی ڈی اے کی بنائی ہوئی سڑک پاکستانیوں پر بند ہے۔

یہ کون لوگ ہیں۔ شہروں کے درمیان شہریوں کو تنگ کرنے کے لیے کیوں آباد ہو گئے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کوئی نہیں جانتا۔ یہ سب کے سب سفید فام ہوتے ہیں، کسی سے بات کرنا تو در کنار، بات کا جواب بھی نہیں دیتے۔ کیونکہ انہوں نے دیواریں اور گیٹ بھی بند کر لیے ہوتے ہیں لہٰذا آپ ان کے گھروں میں جھانکنے کی بدتمیزی بھی نہیں کرسکتے۔

ایک مرتبہ بڑے بڑے افلاطون شہریوں کو ایک چھوٹے سے بچے نے مات دے دی۔ اس نے سائیکل چلاتے اور چیونگم چباتے ایک عمارت کی طرف دیکھا جو سریوں اور سیمنٹ کے ٹکڑوں سے ڈھانپی جارہی تھی بچے نے بھاگتی سائیکل کو بریک لگائی، کام کرنے والے مزدوروں کے پاس لمحے بھر کو رکا اور تشویش سے بولا۔

"اوہ! ہماری اسٹریٹ میں بھی بلیک واٹر والے آگئے۔"

تب میں نے جانا یہ محاورہ نہیں ہے۔ سچ مچ بچہ بچہ جانتا ہے۔ پہلے لوگ شرمندہ ہوتے تھے اور خفیہ رکھتے تھے کہ ان کے امریکہ اور روس میں رابطے ہیں۔ اب ڈھٹائی آگئی ہے۔ ہر شخص یہ ثابت کرنے پر تلا ہے کہ وہ امریکہ سے بہت قریب ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ گول مول کرکے یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امریکہ میں ہائی کمان ہر بات انہیں خود بتاتی ہے اور وہ لوگوں سے آکر پوچھتا ہے "یار حفیظ! بتا کیا کروں!"

"معاف کرنا! یہ اس طرف وہ سڑک ہے، جس پر میں تم کو نہیں لے جاسکتا۔ کیونکہ یہاں سفید فام باشندوں کی بستیاں ہیں جس کو مہذب زبان میں Diplomatic enclave کہتے ہیں۔ وہ شہر کے اس حصے کے حکمران ہیں، آپ غلام باشندے، حقیر پاکستانی، سفید قوم کی مرعوبیت میں مبتلا اوپر سے دہشت گرد.... اس لیے امن پسند صلح جو گورے آپ کو یہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے، اس لیے آپ اس علاقے کو یہیں سے دیکھیں گے۔

میں کمزور عقیدہ آدمی نہیں ہوں، لیکن جب میں اس طویل القامت مارگلہ ٹاورز کے نیچے کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے لگتا ہے، وقت ریوائنڈ ہو گیا ہے۔ بلڈنگ میں روشنیاں جل جاتی ہیں جو قیمتی پردوں سے چھن چھن کر باہر آتی ہیں، کسی کمرے میں ایک چھوٹی سی بچی نظر آتی ہے، جس کی ماما نے ابھی پردے نہیں گرائے۔

میں دیکھتا ہوں، وہ کمپیوٹر پر بیٹھی کوئی گیم کھیل رہی ہے۔ کسی دوسرے فلیٹ کی کھڑکی سے ایک آباد ڈائننگ روم نظر آتا ہے۔ خاتون خانہ بڑی تیزی سے کمرے اور باورچی خانے کے درمیان آتی جاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ٹھنڈا، پرسکون ماحول، آرام دہ، خوش باش گھر، یہ اس بلڈنگ پر آخری رات ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں اور جانتا ہوں لیکن مقیم نہیں جانتے۔ میں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا، لیکن ہمیشہ رک جاتا ہوں۔ میں Saddist نہیں لیکن خود کو

اس اذیت سے بار بار گزارتا ہوں۔ جب میرے سامنے یہ عظیم الشان عمارت زمین بوس ہوتی ہے تو میں ان تمام زندہ توانا لوگوں کو اپنے سامنے ہوا میں اڑتا اور ملبے میں دھنستا دیکھتا ہوں۔ دھول بیٹھتی ہے تو یہ بلند و بالا جاہ و جلال والی عمارت ایک نوحہ نظر آتی ہے۔

اب تم جو سیمنٹ کے ٹکڑے اور لوہے کے مڑے تڑے ڈھانچے اس گراؤنڈ پر بکھرے دیکھ رہے ہو۔ یہاں ایک سرسبز میدان تھا، رنگ برنگے پھولوں سے سجا، کسی کے ڈائننگ روم نے، کسی کے کمپیوٹر کے ملبے نے ان رنگوں اور خوشبوؤں کو ڈھانپ لیا ہے۔ ابھی تک مجھے سیمنٹ کے اس ٹکڑے سے اس ننھی بچی کے خون کی خوشبو آتی ہے۔ جو رات گئے ویڈیو گیم کھیلتی رہی اور صبح دیر تک سوئی تھی کہ ایک دھماکا اس کو نیند میں نگل گیا۔

یہ اسلا آباد کا قبرستان ہے۔ اس ویرانے میں سے دو سڑکیں نکلتی ہیں۔ ان میں سے ایک پطرس بخاری روڈ، دوسری فیض احمد فیض روڈ ہے، گو اس قبرستان میں نہ فیض ہیں نہ پطرس، لیکن وہ دونوں قبرستان کو گھیرے ویرانے میں چپ چاپ پڑے ہیں۔ ان کے حصے میں یہی دو سڑکیں آئی ہیں، کیونکہ بڑی والی آباد شاہراہ آغا شاہی کو مل گئی تھی۔ اسلام آباد کی طرح اس قبرستان کے بھی کئی سیکٹر ہیں۔ یہ وہ سیکٹر ہے، جس میں گریڈ بیس سے اوپر کے افسران دفن ہیں۔ سرکاری ملازم سننے میں کم تر درجے کا لفظ لگتا ہے، لہٰذا ان مردوں کو ہم سرکاری افسر کہتے ہیں۔ ان کے اکثر کتبوں پر ان کے عہدے درج ہیں۔ پرنسپل سیکریٹری، جوائنٹ سیکریٹری، چیئرمین، فلاں فلاں....

یہاں اٹھارہ انیس گریڈ کے مردے دفن نہیں ہوسکتے ان کے لیے شاگرد پیشہ اسی عمارت میں افسروں سے ذرا فاصلے پر تعمیر ہے۔ ازراہ احتیاط تاکہ فرشتوں کو پروٹوکول کا دھیان رکھنے میں آسانی رہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں، یہ افسران آپس میں کیا باتیں کرتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنے قصے سناتے ہوں گے۔ تمہارا ابھی ان سے پالا پڑا ہے۔ میرا مطلب ہے جب یہ زندہ تھے، مگر ریٹائرڈ ہو کر لان میں کرسی ڈال کر بیٹھے کسی غیر اہم پرزے کی طرح انتظار کرتے کہ کب کوئی ملاقاتی آتا ہے۔ کیونکہ ان کا ماضی داستانوں سے زرخیز ہوتا ہے۔ یہ... یہ لوگ بہت اچھے قصہ گو بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے جملے کی ساخت ایک مخصوص لفظ سے سجائی جاتی ہے "اس نے مجھ سے کہا۔ سر!" سر کا لفظ ادا کرتے ان کا منہ لذت بھرے ذائقے سے لبریز ہوتا ہے۔ رس بھرا "سر" نشے میں سرشار "سر" سامنے کھڑا مودب، محکوم، آپ کو افسری کے خمار میں لت پت کرتا۔ میں یہاں کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے لگتا ہے، یہ قبر اس قبر سے مخاطب ہوتی ہے۔ "کل آیا تھا ایک فرشتہ، مجھ سے کہنے لگا۔ "سر! اگر آپ کی اجازت ہو۔"

عموماً "لوگ گلہ کرتے ہیں، مشرف نے اپنے نو سالہ عہد حکومت میں کچھ بھی نہیں بنایا، لوگوں کو بھی گلہ کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ نیشنل مونومنٹ اس کی بنائی ہوئی ہے۔ ہر روز پچیس سے تیس لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ اوپر پیر سوہاوہ ہے جہاں لوگ "منال" کی ریلنگ سے نیچے اسلام آباد کے گھروں کو باری باری روشن ہوتے دیکھتے ہیں۔ سبز پہاڑ آہستہ آہستہ کاہی رنگ کے، پھر سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ یہ تفریح گاہ بھی مشرف کی ایجاد ہے یا دریافت ہے۔ جو لفظ تمہیں مناسب لگے، وہ اس میں ڈال لو۔

یہ جو پیلے رنگ کی ہے، یہ لال مسجد ہے۔ ایک دفعہ بے قابو ہجوم نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ایک شخص کہیں سے سیڑھی لے آیا، دوسرا کوچی اور سرخ پینٹ، اور وہ اس پیلی عمارت کو تن دہی سے لال کرنے میں جت گیا۔ اس دوران بم دھماکہ ہوا۔ لوگ جانیں بچا کر بھاگنے لگے لیکن وہ لاپروا اپنی پشت پر ہونے والے واقعے سے بے نیاز اسی تن دہی سے کوچی پھیرتا رہا۔ افسوس حکمرانوں نے اس کو مزدوری دیے بغیر، پسینہ خشک ہونے کا انتظار کیے، بنا مسجد کو پھر سے پیلا کردیا۔ یہ رنگ اس مسجد کی یاد میں تھا جس کو آزادی سے قبل مسلمانوں نے ایک شب میں تعمیر کیا تھا۔

یہ چک شہزاد ہے۔ اس کا پہلا گھر ہی عبرت کا نشان ہے۔ درختوں سے الٹی لٹکی چمگادڑیں اور چھوڑ کر بھاگ

جانے والوں کا غم مناتی تنہائی۔ اس کے گیٹ پر ایک کتبہ لگا ہے۔ سوری! مجھے معلوم ہے کتبہ گھروں پر نہیں لگتا اور لکھا تو کچھ اور ہے کہ آپ اپنی شناخت کرائے بغیر اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتے، لیکن میرے سامنے سے یہ حرف مٹ جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے یہاں لکھا ہے "بر مزارِ ما نے چراغ نے گلے۔۔۔"

* * *

"آؤ! یہاں بیٹھتے ہیں، کیونکہ میں نے سنا ہے، تمہیں نہروں سے عشق ہے۔" وہ جیسمین اور روز گارڈن کے بہتے پانی کی پلی پر بیٹھتے ہوئے بولا "پہاڑوں کی ندیاں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ تم نے غور کیا" اب تک جن لوگوں کا تم گلہ کرتے آئے ہو۔ ان میں سے ایک طبقے کے نمائندے "تم" اور ایک کا "میں" ہوں۔ آؤ! ہم یہاں بیٹھ کر اپنا اپنا گریہ کریں۔"

ان دونوں کے درمیان خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ صرف پلی کے نیچے بہتے سبزی مائل پانی کی دھیمی آواز سے سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔

کتنی دیر کے سناٹے کو پھر شہریار نے ہی توڑا تھا۔ "مجھے اندیشہ تھا، شاید تم اچھے شخص نہ ہو مگر یار! تم تو با کمال آدمی نکلے۔"

"ایسا ہے کیا۔۔۔؟ شاید نہیں۔" فاروق کاہلی سے پاؤں پسارے بولا تھا۔ "شاید ہمارے سوچنے کا محور ایک ہے۔ ہم ایک ہی فریکوینسی پر چلتے ہیں۔"

"مجھے اب تسلی ہے تم کسی کا دل نہیں دُکھاؤ گے حالانکہ مجھے اندیشے تھے۔"

"اگر تمہیں تسلی ہے تو مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ کیا اس "کسی" میں تم نے خود کو بھی شامل کر لیا ہے؟ کیا مجھے یقین دلا سکو گے کہ میری وجہ سے تمہارا دل نہیں دکھا؟ حالانکہ میں نے اسلام آباد کا کیسا مکروہ نقشہ تمہارے سامنے رکھا۔ آئندہ زندگی میں امید کی طرف دیکھیں گے۔"

"نہیں میرا دل ہرگز نہیں دُکھا۔" شہریار نے وثوق سے کہا۔ "میں راضی برضا رہ کے خوش رہتا ہوں اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہو گا وہی جو اس کی چاہت ہے۔"

فاروق کو لگا اس کے پاس لفظ ختم ہو گئے ہیں۔ کتنی دیر وہ اچھے لفظ کی تلاش میں غوطے مارتا بے بسی سے بڑبڑایا۔

"میں نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا تو۔۔۔۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم چیزوں کے بارے میں جذباتی ہو۔"

"ہاں ہوں۔" اس نے ایک لمحے کے لیے شہریار کا چہرہ دیکھا۔ "تم نہیں ہو کیا؟"

"ہاں میں بھی ہوں۔"

وہ دونوں جانتے تھے وہ اس موضوع پر بات نہیں کر رہے، جو بظاہر نظر آرہا تھا۔ کتنی دیر کی خاموشی کے بعد فاروق اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمیں یہاں سے فوراً" اٹھ جانا چاہیے، کیونکہ اسلام آباد کے بارے میں، میں نے تمہیں آخری بات تو بتائی نہیں، جیسے بلی نے شیر سے درخت والی ٹیوشن چھپا لی تھی۔ رات ایک بجے کے بعد اچانک کہیں سے سوروں کے غول نمودار ہو جاتے ہیں اور یہ خاصے جارح ہوتے ہیں، لہٰذا اس سے قبل کہ سور کی گھڑیوں میں ایک بجے ہمیں اپنے ٹھکانوں پر ہونا چاہیے۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نعیمہ ناز

احساس

"یاسر! آپ خود دیکھ رہے ہیں سب کچھ، اب بتائیں کہ میں کیا کروں؟"

نرگس بہت جھنجلائی ہوئی تھی، اُدھر چھوٹے بیٹے نے قے اور دست سے بے حال ہو کر اسے حال سے بے حال کر رکھا تھا، اُدھر ساس کی بیماری اور لاچاری نے مزید کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بیٹے کا پھیلایا ہوا گند سمیٹ کر اسے دھو کر فارغ ہوئی تو اماں کا کمرہ اس کا منتظر تھا۔ ان کو کوئی بھی چیز ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو دلیہ کھایا تھا وہ سب قے میں اُگل دیا۔ بستر کی چادر، ان کے کپڑے اور فرش دیکھ کر نرگس کو ابکائیاں آنے لگیں۔

"یاسر! بھئی بہت ہو چکی، آپ ظاہر سے کہیں، وہ بھی کچھ خدمتیں کر لے، سارے ثواب لوٹنے کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں۔"

کمرے اور ساس کو ان کے حال پر چھوڑ کر اس نے شوہر کا پیچھا لے لیا۔

"یار! کسی طرح بندوبست کر لو، ظاہر اور اس کی بیوی کا جواب تمہیں معلوم ہی ہے چوتھے فلور پہ دو کمروں کا فلیٹ، لفٹ نہیں ہے، سیڑھیوں سے آنا جانا کیسے ہو گا، آئے دن لوڈشیڈنگ، حبس اور گرمی الگ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
پاک سوسائٹی کی پیشکش

اماں کا دم گھٹے گا‘ وغیرہ وغیرہ ان کے پاس بہانوں کی کیا کمی ہے۔" یاسر بے بسی سے بولا۔

"کیوں؟ آپ سے کچھ بولا کیوں نہیں جاتا‘ اس کی بھی تو ماں ہیں‘ صرف آپ پر ہی تو سارے فرائض عائد نہیں ہوتے‘ لینے کے لیے‘ کھانے کے لیے اپنا حق جتانا خوب آتا ہے‘ خدمت گیری کے لیے‘ ہاری‘ بیماری میں دیکھ بھال کے لیے ہمیں ہی پاگل بنایا جاتا ہے‘ ہماری گردن ہی پتلی نظر آتی ہے‘ آؤ بھئی لو پھندا فٹ کردو۔"

نرگس کئی مہینوں سے بھری بیٹھی تھی‘ جب سے ساس کی بیماری نے طول پکڑا اور وہ محتاج ہو کر بستر پر پڑی تھیں‘ نرگس ایسی گھن چکر بنی کہ اب تو بے زاری کی حد کو پہنچ گئی تھی‘ حالانکہ گھر کے جھاڑو پونچا‘ صفائی برتن اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی بلکہ ساس کے بیشتر کام بھی اسی سے کروائے جاتے تھے۔ ان کا نہلانا‘ دھلانا‘ ان کے کپڑے وغیرہ دھونا‘ سب کچھ ماسی ہی کرتی تھی مگر وہ چوبیس گھنٹے کے لیے تو نہیں آتی تھی‘ وہ ابھی ابھی اماں کو دلیہ کھلا پلا کر‘ سارے کاموں سے فارغ ہو کر گئی تھی کہ پیچھے سے پھر انہوں نے گند پھیلا دیا تھا۔

نرگس کو یہ بھی غصہ تھا کہ دیور اور دیورانی تو بہانے بنا کر انہیں اپنے ساتھ رکھنے سے گریز کرتے تھے‘ بس آتے اور خیر خیریت پوچھ کر ان سے مل ملا کر چلے جاتے اور خدمت گزاری کا سارا بوجھ اس کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا تھا۔ یاسر کون سا کچھ کرتے‘ رقم دے کر اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے‘ آگے نرگس جانے اور اس کا کام‘ اس کے کاموں میں ساس کی تیمار داری کا جو نیا کام شامل ہوا تھا اس نے اسے چکرا کے رکھ دیا۔

"حلیمہ کو کسی سے بلوا لو‘ وہ صفائی کر دے گی۔" یاسر نے اس کی مسلسل بڑبڑاہٹ کے جواب میں کہا۔

"ہاں تو ظاہر ہے کہ اب اسے ہی بلواؤں گی‘ اب میں خود تو یہ سب کچھ کرنے سے رہی‘ بڑی بی کے جراثیم‘ میرے بیٹے کو بھی لگ گئے‘ دو دن میں ہی ذرا سا منہ نکل آیا ہے بے چارے کا۔"

ہر ماں کی طرح اس کی جان بھی اپنے چار سالہ اکلوتے بیٹے میں تھی‘ اس کی پرورش ویسے ہی بڑے لاڈ پیار اور چاؤ سے ہو رہی تھی‘ بیماری وغیرہ میں تو وہ ماں‘ باپ کی ہتھیلی کا چھالا بن جاتا تھا‘ ایک وقت میں دو دو مریض سنبھالنے سے نرگس عاجز ہو گئی تھی۔ بیٹے کی بات الگ تھی‘ وہ اس کے وجود کا حصہ تھا‘ اس کی آمد اور پھر اسے پالنے پوسنے کے سارے مراحل کتنے ہی تکلیف دہ اور جانگسل۔ کیوں نہ ہوں‘ اس میں بھی اک سرخوشی اور راحت محسوس ہوتی تھی‘ ممتا کے جذبے کی تسکین یا مستقبل کے نشاط افزا خواب اولاد خصوصاً" بیٹوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس ایک بوڑھی‘ بیمار اور لاچار عورت کا کیا ہے؟ بے شک وہ اس کے شوہر کی ماں ہی سہی مگر اپنی ساری توانائیاں اور عمر وہ قریب قریب خرچ کر ہی چکی تھیں‘ عمر کی نقدی میں فقط چند سکے باقی تھے۔ جو کبھی بھی‘ کسی بھی وقت اچانک ختم ہو جانے تھے‘ ایک وجود جو ایک رشتے یا انسان ہونے سے زیادہ اپنے بوجھ ہونے کا احساس دلاتا ہو‘ اس کی اہمیت اور پرواہ ذرا کم ہی کی جاتی ہے۔

اماں کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اس نے فون کر کے دیور‘ دیورانی کو بلوا لیا۔

"کچھ ہو گیا تو کل کلاں کو مجھے ہی طعنے ملیں گے کہ آخری وقت میں بلوایا نہیں۔" باتوں باتوں میں نرگس نے دیورانی کو جتا ہی دیا۔ "اب جہاں اتنی خدمت کر رہی ہوں‘ تو چھوٹے بیٹے کو بھی ان کی آنکھوں کے سامنے کر دوں‘ بے چاری کو سکون مل جائے گا‘ اسی لیے تم لوگوں کو بلوا لیا‘ بھئی ماں ہیں‘ بے شک ہمارے ساتھ رہتی ہیں مگر ماں کی مامتا تو سارے بچوں کے لیے ہوتی ہے‘ چاہے دور رہوں یا قریب۔"

چکن قورمہ بناتے ہوئے نرگس مسلسل بولتی رہی۔ طلعت ڈپلومیٹ بنی اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے ساتھ ساتھ اپنی مجبوریاں بھی بتاتی رہی کہ وہ اپنے شوہر اور بچے کو اپنی ساس سے دور رکھنے پر کیوں مجبور ہے۔

"ویسے آج کل تم بلیک سوٹ بہت بنانے لگی ہو۔" نرگس نے اس کے بلیک سوٹ کو بغور دیکھا جس پر بہت نفاست سے پائپنگ اور ڈوریوں سے ڈیزائن بنا تھا۔

"بس اتفاق ہے۔" طلعت ایک ماہ میں چوتھی بار نیا بلیک سوٹ پہن کر آئی تھی اور اسے اتفاق قرار دے رہی تھی‘ جبکہ اپنی بہن کے یہی سوال پوچھنے پر اس نے جواب دیا تھا کہ

"پتا نہیں کب بڑی بی کا اوپر سے بلاوا آ جائے‘ سوگ کے لیے بنا کے رکھتی ہوں اور پھر پہن لیتی ہوں‘ یہ چوتھا سوٹ ہے۔"

ادھر یاسر‘ ظاہر کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔

"اماں کی بیماری میں ٹھیک ٹھاک پیسہ اٹھ گیا ہے‘ تھوڑی بہت سیونگ تھی‘ سب ہی ختم ہو گئی‘ بہت مشکل حالات ہو گئے ہیں۔" یاسر ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب اماں پر رقم خرچ کرنے کی باری تمہاری ہے اب ظاہر تھوڑا بہت اپنا حصہ ہی ڈال دے‘ مگر ظاہر بھی بیوی کا سکھایا پڑھایا ہوا تھا‘ زمانے بھر کی بے چارگی اور مسکینیت چہرے پہ طاری کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"بھائی جان! آپ کو سب کچھ معلوم ہے ہمارا حال‘ روز کنواں کھود کر پانی پینے والے لوگ ہیں ہم۔ مہنگائی اتنی ہو گئی ہے کہ بس سفید پوشی کا بمشکل بھرم رکھا ہوا ہے‘ طلعت بیمار ہو گئی تھی‘ ڈاکٹر نے طاقت کے انجکشن اور دوائیاں وغیرہ لکھی تھیں‘ ہفتہ دس دن تک استعمال کیں پھر لا ہی نہیں سکا‘ اخراجات ایسے ہیں کہ مہینے کے آخر میں کھینچ تان کے گزر بسر کرتے ہیں۔"

کھانا کھا کر وہ لوگ رخصت ہوئے تو بارہ بج چکے تھے نرگس کچن سمیٹ کر بیڈ روم میں آئی تو اس کا موڈ آف تھا۔ آتے ہی یاسر پر برس پڑی۔

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلن پو/ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

"ہمیشہ ہی دونوں میاں، بیوی بے وقوف بنا کر چلتے بنتے ہیں، آپ نے ظاہر پر زور کیوں نہیں دیا، کیا وہ بیٹا نہیں ہے؟ ان لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے اماں جی کی خدمت کرنے کا؟ غضب خدا کا ہر ہفتے بیگم صاحبہ نیا سوٹ بنا رہی ہیں اور ماں کے اوپر کچھ خرچ کرنے میں مہنگائی کا رونا رو رہے ہیں دونوں میاں بیوی۔ آخر ہم کہاں کے لینڈ لارڈ ہیں جو یوں پانی کی طرح پیسہ بہاتے رہیں؟ اور ہاتھ پاؤں سے جو خدمت ہو رہی ہے وہ الگ۔"

نرگس ایسے احسان جتا رہی تھی جیسے اماں کے سارے کام ماسی کے بجائے وہ خود کرتی ہو۔

"تو اب میں کیا کروں؟ اماں کو زبردستی تو ظاہر کے گھر چھوڑ کر آنے سے رہا۔"

یاسر نے دبے دبے لہجے میں ایسے کہا جیسے ماں کی بیماری اور لاچاری میں وہ خود قصوروار ہو، نرگس کے سامنے اس معاملے میں اس کا رویہ ہمیشہ معذرت خواہانہ ہی ہوتا تھا، نرگس کے ماتھے کی شکنیں پھر بھی کم نہیں ہوتیں وہ مسلسل بڑبڑاتی ہی رہی تاوقتیکہ اسے نیند آ گئی۔

رات کے نہ جانے کس پہر قدرت کو رحم آیا اور اماں کی اور بیٹوں بہوؤں کی بھی مشکلات آسان ہو گئیں۔ ظہر کی نماز میں تدفین کردی گئی۔ شام تک بیشتر رشتے دار جو دور کے علاقوں سے آئے تھے وہ بھی چلے گئے، رات میں ظاہر اور اس کی بیوی رک گئے تھے۔

دوسرے دن نرگس نے ماسی کو اماں کے کمرے کی صفائی پر لگا دیا، ان کا بستر، چادریں اور تکیہ وغیرہ اوپر دھوپ میں ڈلوایا اور حلیمہ کو یہ سب چیزیں لے جانے کو کہہ دیا۔ الماری سے ان کے کپڑے بھی نکال کر اسے ہی دے دیے۔ نرگس کو ویسے بھی مرے ہوئے انسان کی کوئی چیز استعمال کرتے ہوئے بڑا خوف محسوس ہوتا تھا۔

طلعت بھی وہیں کمرے میں آ گئی، کچھ دیر تک وہ نرگس کو الماری سے مختلف اشیاء نکالتے ہوئے دیکھتی رہی، نرگس نے الماری بند کی تو اس سے صبر نہیں ہوا۔

"بھابھی!" طلعت، جٹھانی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"ظاہر بتا رہے تھے کہ اماں کے پاس کچھ زیورات تھے، شاید ان کی اپنی شادی کے موقع کے تھے، انہوں نے دیکھے ہیں، پرانے اسٹائل کا گلوبند کا سیٹ تھا، ہم دونوں کو تو بری میں نئے ڈیزائن کے زیورات ہی چڑھائے تھے، وہ سیٹ شاید ان کے پاس ہی ہوگا، آپ کو بھی کچھ بتایا نہیں انہوں نے؟" طلعت نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

نرگس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس کی بات سن کر "دکھ سہیں بی فاختہ اور انڈے کھائیں کوے۔" فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی محاورہ آیا۔

"بیمار ماں کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری کے لیے تو تم لوگوں نے ہری جھنڈی دکھا دی اور اب حصہ بٹانے کے لیے ابھی سے حاضر، ماں کے مرنے کے دوسرے ہی دن۔"

نرگس انتہائی تلخ لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں باجی! بڑی اماں کے پاس ایک کالی پیٹی ہے، اس میں سے پتا نہیں کیا دیکھتی رہتی تھیں، ایک بار میں نے پوچھا بھی کہ اماں اس میں کیا دیکھتی رہتی ہو، کوئی آ جائے تو جھٹ سے بند کر دیتی ہو تو کہنے لگیں کہ اس میں میری ساری دولت ہے۔" حلیمہ نے دخل اندازی کی، جو وہیں کام کر رہی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا ہے بیچ میں بولنے کو۔ جاؤ، جا کے اپنا کام کرو۔" نرگس اس پر برس پڑی۔

"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی قیمتی چیز موجود ہے۔"

اپنی بات کی تصدیق ہونے پر طلعت چہک کر بولی، ملنے والی متوقع خوش خبری نے جٹھانی کا سخت لب و لہجہ اور بات بھی، نظر انداز کروادی۔

"بلکہ میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں۔" طلعت لپک کر

الماری کی طرف بڑھی نرگس کی کھا جانے والی اور گھورتی ہوئی نظروں کی پرواہ کیے بغیر الماری میں کئی اشیاء کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی۔

ایک کالے رنگ کا چھوٹا سا اٹیچی کیس، الماری سے نکال کر اس نے نیچے رکھا۔

"جازب!" کمرے سے باہر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

"اپنے پاپا کو بلاؤ اور بڑے ابو کو بھی۔" طلعت کا چہرہ خوشی اور کامیابی کے احساس سے چمک رہا تھا۔

"کیسی گھنی تھیں بڑی بی!" نرگس کے دل میں مری ہوئی ساس کے لیے غصہ امڈنے لگا۔ "ساری خدمتیں ہم نے کیں اور کبھی بھنک بھی نہیں پڑنے دی کہ اپنی دولت پر سانپ بن کر بیٹھی ہیں، حرام ہے جو کبھی کوئی اشارہ بھی دیا ہو کہ اپنے زیورات کلیجے سے لگا کر رکھے ہیں، کبھی بھاپ تک نہیں نکالی منہ سے۔"

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے نرگس یہ بات یکسر فراموش کر گئی کہ وہ ساس کے پاس آ کر بیٹھتی ہی کتنا تھی، جو انہیں کچھ کہنے سننے کا موقع ملتا۔ یاسر بھی کبھار کھڑے کھڑے خیر خیریت پوچھ لیتا اور اس کو تو اس کی بھی فرصت نہیں تھی۔

یاسر اور ظاہر بھی آ گئے تھے۔

"چلو کچھ تو چھوڑ کے گئی ہیں۔" یاسر کے دل کو تھوڑا اطمینان ہوا "شیئرز خرید کے رکھ دوں گا، آگے چل کے کام آئیں گے۔"

ظاہر سوچ رہا تھا کہ ملنے والی رقم سے پرانی موٹر سائیکل بیچ کر نئی بائیک خرید لے گا بہت عرصے سے اس کی خواہش تھی مگر اتنی رقم نہیں ہو پاتی تھی بڑی مشکل سے لاک توڑ کر یاسر نے اسے کھولا، سب کی تجسس اور اشتیاق بھری نظریں اندر سے نکلنے والی اشیاء پر جمی تھیں، ایک ایک کر کے مختلف اشیاء نکلتی گئیں اور ان سب کے چہرے پھیکے پڑتے چلے گئے۔

سب سے اوپر یاسر اور ظاہر کی شادی کی دو تصاویر تھیں، دونوں دولہا بنے اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ تھے، دو تصاویر دونوں پوتوں کی تھیں، ایک بہت پرانی کھلونا گاڑی تھی، جس کے تین پہیے نکلے ہوئے تھے اور ایک پچکی ہوئی گیند، جس کا رنگ بھی اڑ چکا تھا۔ یہ دونوں چیزیں یاسر اور ظاہر کے بچپن کی یادگاریں تھیں جب پیسوں کی بہتات اور کھلونوں کی افراط نہیں تھی۔ وہ دونوں چند مخصوص چیزوں سے ہی کھیلا کرتے تھے۔

ہاتھ کا بنا ہوا ایک سوئیٹر، جس نے کئی سردیوں، یاسر کا ساتھ دیا تھا، جس میں اون کی گرمائی کے ساتھ ساتھ ماں کے احساس اور محنت کی حرارت بھی شامل تھی، گوٹے کناری سے سجی ایک خوب صورت مخملی ٹوپی جو ظاہر کی بسم اللہ پہ بڑے ارمانوں، چاؤ اور محنت سے بنائی گئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بدرنگ سے جھبلے، ہاتھ کے ہی بنے ہوئے ایک جوڑی گلابی رنگ کے خوب صورت سے موزے، ایک ٹوٹے ہوئے بیٹ کا آدھا حصہ تھا، جو یاسر کی اسکول لائف کی یادگار تھا۔ اسی بیٹ سے اس نے ایک زوردار چھکا مارا تھا کہ بیٹ دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ایک زنانہ رسٹ واچ تھی، جو ظاہر نے اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر ماں کو لا کر دی تھی۔ کروشیے کی بنی ہوئی سفید ٹوپی جو اب پیلی ہو چلی تھی اور چار خانے والا نیلا رومال، یاسر اور ظاہر کو اچھی طرح یاد تھا کہ یہ ٹوپی اور رومال ابا جی استعمال کرتے تھے۔

سب سے آخر میں ایک لفافے میں دو رسیدیں تھیں جس کے مطابق جیولر کو کچھ زیورات فروخت کر کے دوسرے نئے زیورات خریدے گئے تھے۔ ان رسیدوں پہ جو تاریخ درج تھی وہ ان دونوں کی شادی سے ایک ماہ پہلے کی تھی۔

کمرے میں گہری چپ کا راج تھا، نرگس اور طلعت خاموش تھیں اور یاسر اور ظاہر کے اندر کوئی شور مچا رہا تھا، دونوں کی آنکھیں خشک تھیں مگر اندر ہی اندر کوئی طوفان سا آ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو پڑے، انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے آج ہی، ابھی ابھی اماں کا انتقال ہوا ہو۔

* * *

فاخرہ جبیں

فیس بک ڈاٹ کام

آج کے زمانے میں سب سے مشکل کام رشتہ ڈھونڈنا ہے۔ پہلے زمانے میں تو لڑکیوں کے لیے رشتے ڈھونڈنا مشکل تھے۔ میرے بیٹے کی باری آئی تو سارے شہر میں لڑکیوں کا ہی کال پڑ گیا۔ ٹھیک ہے چندے آفتاب، چندے ماہتاب نہ سہی، مگر اب ایسا بھی نہیں کہ بجھے ہوئے چراغ گھر میں لا سجاؤں۔

کوئی چمک دمک صورت کی۔

کوئی جوت سگھڑاپے کی۔

کوئی جگ مگ سیرت کی۔

آخر ایک اکلوتا میرا علی مہران... نہ اس کا کوئی بھائی، نہ بہن، سیدھا سادا، معصوم، خوبرو، فرماں بردار، نیک سیرت، اسکول، کالج، یونیورسٹی میں بیسیوں لڑکیاں ساتھ پڑھتی تھیں، مگر مجال ہے جو کہیں آنکھ لڑائی یا وفا لٹائی ہو۔

میاں صاحب کہنے لگے۔

”بیٹے سے پوچھ لو، ہو سکتا ہے کوئی نظر میں، دل میں بسا رکھی ہو۔“

لو بھلا... یہ بھی کیسے ممکن ہو؟ نہ کہیں رشتہ داروں میں آنا، نہ دوستوں میں جانا، ایسی خرافات میں پڑنے والا نہیں تھا وہ... بس ایک ہی شوق بچپن سے رہا، کمپیوٹر اور بس کمپیوٹر، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب اسی کے ساتھ۔

کھانے میں سب سے زیادہ سینڈوچ پسند ہیں، کیوں؟ کیونکہ ایک ہاتھ سے کھائے جاتے ہیں، تردد نہیں کرنا پڑتا، کھاتے جاؤ اور انگلیاں کی بورڈ پر چلاتے جاؤ، ہمہ وقت بڑی نفیس سی ٹپ ٹپ۔

اب ایسے فرشتہ صفت بچے کے لیے بیوی بھی تو ویسی ہی ہونی چاہیے نا؟

آس پڑوس، رشتہ داروں میں بھی کہیں بات بنتی نظر نہ آئی... کچھ نے علی کو گودوں کھلایا اور کچھ کو علی نے... اب باجیوں یا بھتیجیوں چچیوں کو اٹھا کر سیج پر بٹھا دوں... نہ بھئی، منہ بولے رشتوں میں بھی ایسا گھپلا مجھ سے نہیں ہوتا۔

اب لے دے کر ایک ہی ترکیب نکلی ہے۔

بجیا کی نند کی بیٹی کی شادی... پہلے تو جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اب سوچتی ہوں چلی ہی چلوں، کیا معلوم؟ کوئی بھولی صورت نظر آئے اور من کی مراد پوری ہو جائے۔

* * *

نہ جانے آج کل کی لڑکیوں کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟

پہننا، اوڑھنا، بننا سنورنا آتا ہی نہیں... اب بجیا کی جٹھانی کی بیٹی کو ہی دیکھ لیں۔ این سی اے میں پڑھتی ہے۔ کہتے ہیں طلبہ و اساتذہ میں یکساں مقبول ہے، مگر مجھے تو کچھ ہونق سی لگی... جو قمیص پہنی وہ ٹخنوں کو چھو رہی تھی اور دوپٹے کی بکل یوں ماری تھی جس طرح ایوب کھوسہ کسی زمانے میں اپنی گرم چادر اوڑھا کرتے تھے۔ بڑی بڑی جٹائیں ماتھے، تھوڑی اور کندھوں کو چھو رہی تھیں۔

ایک اور کزن نے اپنی بیٹی کو دعا سلام کی غرض سے بلایا... وہ بے چاری نازک اندام... دھان پان سی... چھوٹے سے چہرے پہ سیاہ فریم کا بڑا سا چشمہ... ”میں عبدالقادر ہوں“ کے عبدالقادر جیسا۔

پھپھو کی نواسی سے ملاقات ہوئی... میں نے کندھے پہ تھپکی دینے کو ہاتھ اٹھایا۔ وہ مصافحہ لینے کے لیے ہاتھ ہوا میں لہراتی رہ گئی... بچی کو شرمندگی سے بچانے کے لیے میں نے جھٹ جوابی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ محترمہ رکوع میں چلی گئیں، تھپکی لینے کے لیے... لاحول ولا... بھئی ادب و آداب، میل ملاقات کا بھی تو کوئی طریقہ سلیقہ ہونا۔

دو چار اور بھی دیکھیں جو زیور لتے پہنے اپنی عمر سے بڑی ہی لگیں۔ نہ بھئی۔۔۔ ایک، آدھ بچے کے بعد علی کی بیوی کم، خالہ زیادہ لگنے لگیں گی۔

"یا اللہ! کوئی تو چھوٹی موٹی سی لڑکی سامنے آئے۔۔۔ جس پر آنکھ اور دل دونوں ٹھہر جائیں۔" میں نے بہت دل سے دعا مانگی تھی اور شاید وہ گھڑی قبولیت کی ہی تھی۔

* * *

"بجیا! یہ لڑکی بھلا کون ہے؟"

بلا مبالغہ میں نے اس لڑکی کو کوئی تیسری بار دیکھا تھا اور تینوں ہی مرتبہ وہ مجھے میرے پسندیدہ رنگوں کے ملبوسات میں دکھائی دی تھی۔

پہلی بار مہندی پر۔۔۔ شوخ، بھڑکیلے رنگوں کے بجائے سیاہ رنگ کے لباس میں۔

میں فون پر علی کو کھانے پینے کے بارے میں سخت قسم کی ہدایات دے کر پلٹی تو اچانک ہی اس لڑکی سے ٹکرا گئی تھی۔ اس کا پاؤں میرے پاؤں تلے آگیا تھا۔

وہ بے چاری سسکاری سی لے کر قریبی صوفے پر گری اور فوراً" ہی جوتا اتار کر اپنے پیر کا جائزہ لینے لگی۔

سفید کبوتروں جیسے پیر سیاہ ڈوریوں والے سینڈل میں مقید تھے، میری نظر ٹھہری گئی۔

خوب صورت اور خاص طور پر صاف ستھرے ہاتھ پاؤں میری کمزوری تھے۔

زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی، مگر از راہ مروت ہی میں نے معذرت کرنا چاہی، تو اس نے بڑے سبھاؤ سے مجھے خاموش کرادیا۔

"ارے نہیں۔۔۔ بالکل چوٹ نہیں آئی، ویسے بھی رش زیادہ ہے، مجھے خیال کرنا چاہیے تھا۔" وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی تھی۔

دوسری ملاقات بارات والے دن ہوئی۔

سب انتظام ہال میں تھا، مگر بارات کے آنے پر جو افراتفری سی پھیلتی ہے، وہ یہاں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ باراتیوں کے استقبال کے لیے بیشتر کرسیاں خالی ہوگئی تھیں۔ میں نے اکتا کر یوں ہی اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، تب وہ گلابی رنگ کے چوڑی دار پاجامے اور فراک میں ملبوس قریبی نشست پر بیٹھی نظر آئی۔

بہت ہلکی سی جیولری اور برائے نام میک اپ۔۔۔ آنکھوں پر سیاہ لائنر اور پلکوں پہ مسکارا البتہ نمایاں تھا۔ مجھے اس کی یہ ادا بھی اچھی لگی، کیونکہ میں اب تک میک اپ میں آنکھوں کی سجاوٹ کو خاصا وقت دیتی ہوں۔

مجھ سے نظریں چار ہوئیں تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر فوراً" مجھ تک آئی۔ دعا سلام ہوئی تب ہی میزبان اور باراتی ہال میں داخل ہوئے۔ زیادہ بات چیت تو نہ ہوئی، مگر اس کا سلجھا ہوا رکھ رکھاؤ والا انداز دل میں جگہ کر گیا۔

اور آج تیسرا دن تھا کہ پستی رنگ کے لباس میں وہ روشنی سی بن کر سامنے کی سیڑھیوں سے اتری اور ولیمہ پر آئے مہمانوں میں کہیں کھو سی گئی۔

اور میں بجیا سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"میری نند کی کزن کی بیٹی ہے حوریہ۔" بجیا نے بتایا۔

اور پھر کھانے کے دوران میں دانستہ اس لڑکی کی تلاش میں کھانے کی پلیٹ لیے گھومتی رہی اور جب نظر آئی تو سکون کا سانس لیا۔

سلاد اور ذرا سے چاول۔۔۔ پلیٹ میں ڈالے۔۔۔ وہ پیپسی کا گھونٹ لے رہی تھی۔

بہت زیادہ کھانے والی پیٹو لڑکیاں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور بجیا کو حوریہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا کہتے ہوئے میاں جانی کو فون کھڑکا دیا۔

"لگتا ہے۔۔۔ بات بننے والی ہے۔۔۔ میں لڑکی کے گھر سے ہو آؤں۔۔۔ پھر آپ کو بتاؤں گی۔"

میں نے بجیا کی طرف چند روزہ قیام کا ارادہ کیا۔ اور

ایک روز بنا بتائے ہی حوریہ کے گھر جا دھمکی۔ ماضی میں وہ محترمہ بھی غالباً" میرے ہی قبیل سے تعلق رکھتی ہوں گی، جو بہو کی کھوج میں گھر گھر جاکر کوڑا جمع کرتی رہیں۔ اب اس زمانے میں، میں جمعدار کا بہروپ تو بھرنے سے رہی، بس ان کے گھر کے قریب گاڑی خراب ہونے کا بہانہ ہی کافی تھا۔

بجیا کو ساتھ لے کر گئی تھی کہ ان ہی سے جان پہچان تھی ان کی۔۔۔ جوں ہی گھر میں داخل ہوئے، پُرتپاک انداز میں استقبال ہوا۔ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پذیرائی کسے اچھی نہیں لگتی۔ میں دل ہی دل میں خوش، مطمئن بڑی تسلی سے بیٹھ رہی، بس ابھی چند امتحان اور باقی تھے۔۔۔ پھر۔۔۔

مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

سادگی سے سجا ہوا گھر تھا۔ آرائش پر بہت زیادہ خرچ نہیں کیا گیا تھا۔ سبز بیلوں اور رنگ برنگے پھولوں سے ہر سونی دیوار اور ستون کو آباد کیا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں کین اور بمبو کا فرنیچر، ہر دور کے فیشن میں ان۔

حوریہ کی امی کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ والد صاحب کالج میں لیکچرار۔۔۔ حوریہ چائے لے کر آئی تو براؤن رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایک بار پھر میرا پسندیدہ رنگ۔

"اف خدایا! اس لڑکی کو جانے کیسے خبر ہوگئی کہ میں براؤن رنگ پہ مرتی ہوں۔" وہ چائے لینے گئی تو میں نے بجیا کے کان میں سرگوشی کی۔ چائے کے ساتھ جو لوازمات آئے انہیں دیکھ کر میں تو میں، خود بجیا کا بھی حیرت سے منہ کھل گیا۔

میکرونیز کا باؤل۔۔۔ کباب۔۔۔ کیک۔۔۔ تینوں چیزیں ہوم میڈ۔

خود میرے گھر میں اچانک آجانے والے مہمانوں کی تواضع ان ہی لوازمات سے کی جاتی ہے۔ اور وہ بھی میرے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی۔ بازاری چیزوں سے میں سخت الرجک ہوں، ہمیشہ گھریلو پکوان قابل ترجیح، بینگ۔

لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے، میں جھوم جھوم گئی۔

تھا جس کا انتظار...

* * *

دنیا میں سب سے مشکل کام... نہیں... نہیں رشتہ ڈھونڈنا کہاں؟

جوڑے تو آسمانوں پر طے ہوتے ہیں، جب وقت اور نصیب میں ہو، مل ہی جاتے ہیں۔

دنیا کا سب سے مشکل کام تو بری بنانا ہے۔ وہ بھی تب، جب بیٹا اکلوتا ہو، کون سا ارمان رکھوں؟ کون سا پورا کروں۔

علی بے چارے نے تو دوسری شاپنگ میں ہی ہاتھ کھڑے کر دیے۔

"جس نے استعمال کرنا ہے، وہ ہی خوار ہو... میں لیڈیز شاپنگ نہیں کر سکتا۔"

میرے بھی من میں آئی، تو باپ، بیٹے دونوں کا اے ٹی ایم اڑا کر لاہور پہنچ گئی۔ حوریہ تو حوریہ... علی مہران کی شاپنگ بھی ہم ساس، بہو نے مل کر کر ڈالی... ایک ایک چیز کی سو بار جانچ پرکھ کی، تب خریدی۔

میں نہیں چاہتی تھی، حوریہ کسی بھی طرح کسی سے کم دکھائی دے، آخر کو سو فیصد میری رضا و منشا کے مطابق یہ انتخاب ہوا تھا۔

علی نے تو تصویر تک دیکھنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔

ایک روز ذرا میں نے بات چھیڑی بھی تو مسکرا کر سر جھکا لیا۔ شرمیلا بھی تو بہت ہے نا، آرام سے کہہ دیا۔

"اب ایک بار ہی دیکھوں گا، آپ کی پسند پر اعتماد ہے مجھے۔"

لو جی، غبارے میں کچھ اور ہوا بھر گئی، میں مزید مستعد۔

"آج کل کے زمانے میں ایسا سعادت مند بیٹا... خیر میں نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی، چاند، سورج کی جوڑی نہ کہلائے تو میرا نام بدل دیجیے گا۔"

میں فخریہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

* * *

مایوں، مہندی، بارات... لیجیے سارا کھیل بس یہیں تک۔ ساری بھاگ دوڑ ختم، دلہن گھر آ گئی، من کی مراد پوری ہوئی، میاں نے سراہا، رشتہ داروں نے ستائش کی، سب انتظام بخیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچا۔

لڑکے بالے ابھی تک دولہا، دلہن کو گھیرے بیٹھے تھے۔ لڑکیوں کا جوش و خروش دیدنی، سب رسمیں ہو گئیں۔ آخر میں نے ہی زبردستی سب کو اٹھا کر خواب گاہوں کی راہ دکھائی، حوریہ کو اس کے کمرے تک پہنچایا۔ سرخ گلابوں سے سجا بیڈ روم، اپنے کمرے کی آرائش و سجاوٹ، سب علی مہران نے خود کروائی تھی۔ ہم لوگوں نے تب ہی دیکھا، جب حوریہ نے کمرے میں قدم دھرا۔

میرا بیٹا اتنا رومانٹک، مجھے قطعاً" اندازہ نہیں تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں شمع دان... مسہری چنبیلی اور گلاب کی خوشبو سے مہکی ہوئی... دیواریں گلاب کی لڑیوں سے آراستہ... حوریہ کو بیڈ پہ بٹھا کر پھر میں نے زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا، ویسے بھی مہران صاحب بیڈ روم میں جلد آنے کا اشارہ دے گئے تھے، مجھے سوچ کر ہنسی آنے لگی۔

"ہاں بھئی، باپ اتنا رومانٹک ہے تو بیٹا بھی دو ہاتھ آگے ہی ہو گا۔"

کمرے میں آتے ہی مجھے یاد آیا، حوریہ کی منہ دکھائی کا نیکلس تو اب میں نے علی مہران کو دیا ہی نہیں، زیورات کے ساتھ علی مہران نے وہ ڈبہ بھی مجھے ہی تھما دیا تھا۔

"بہت ہی بھولا بیٹا ہے آپ کا... اتنا اہم کام بھی یاد نہیں۔" میں نے مہران صاحب کو جتایا۔ عجلت میں وہ ڈبہ نکالا اور علی مہران کے بیڈ روم کی طرف لپکی۔

علی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نظر آیا۔ جتنی دیر میں، میں نے پکارنا چاہا وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔

"یاہو..." نعرہ مستانہ کمرے سے بلند ہوا اور ہوا کے دوش پہ لہراتا میرے کانوں تک پہنچا۔

"فیس بک... زندہ باد۔"

"ہائیں..." میں ذرا سا ٹھٹھکی۔

"یہ علی مہران کو کیا ہوا؟"

"اچھا... اچھا... فیس بک یعنی کتابی چہرہ... چلو شکر ہے... علی مہران کو حوریہ پسند تو آ گئی، لیکن بھئی، اتنے نعرے بازی کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ بس یہ آج کی نسل بھی نا؟ اب ایسے وقت میں خواہ مخواہ دروازہ بجا کر انہیں ڈسٹرب کیا کرنا، واپس ہی چلنا چاہیے۔

ہے جوش گل بہار میں

* * *

"اوہ میرے خدا! کس جتن سے یہ دن آیا ہے، جی چاہتا ہے ہوا میں اڑوں، آسمان کو چھو لوں، یا پھر دو چار جستوں میں سمندر ہی پھلانگ جاؤں، حوریہ سے دوستی کو ایک سال بیت گیا تھا۔ فیس بک پر فرینڈ شپ ہوئی، بعد میں معلوم ہوا، دور پرے کی رشتہ دار بھی لگتی ہے لیجیے کام آسان ہو گیا، اس دور پرے کو قریب ترین میں بدل دینے کی خواہش دل میں ہمکنے لگی۔

ان ہی دنوں ممّا میرے رشتے کی کھوج میں نکل پڑیں۔ کبھی کسی زمانے میں، شاید بچپن میں کسی بھلے انسان نے پوچھا تھا۔

"کیسی دلہن لاؤ گے؟"

میں فٹ بولا تھا۔ "ماما جیسی۔"

اور ماما نے گرہ میں باندھ لی یہ بات، ایسی پکی، مضبوط گرہ کہ وقت آنے پر ہی کھلی، اور میں منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔

"فلاں لڑکی منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنستی ہے۔"

"فلاں کے ہاتھ میں ذائقہ نہیں، ابلی ہوئی گوبھی لا کر سامنے رکھ دی۔"

ایسی پرفیکشنسٹ میری ماما... بات بنے تو بنے کیسے؟

میں کیا جانوں حوریہ کھانا کیسا بناتی ہے؟ مجھے کیا خبر کہ حوریہ کو پہننا اوڑھنا آتا ہے کہ نہیں؟ طریقہ سلیقہ کتنا ہے میری جانے بلا... مجھے تو بس اتنی خبر تھی کہ حوریہ کی سوچ، اس کے خیال، اس کے معیار، اس کا ذہن، مجھ سے ہم آہنگ ہے۔

تو پھر؟

"بابا!" اتنے بڑے بڑے کونسچن مارک... کہ بابا کو پکارے بنا نہیں رہ سکا۔

اور بابا... دی گریٹ۔

"مہندی پر بلیک سوٹ" بابا کا حکم ہوا۔

"کیا؟" حوریہ چیخی۔

"وہ تو ولیمہ..."

"نہیں... صرف مہندی پر۔"

"شادی پر پنک۔"

"پنک سوٹ؟ لیکن کہاں سے؟ میرا تو کوئی سوٹ پنک نہیں، اچھا رکو، ٹھہرو، خولہ، تمہارا پنک سوٹ۔"

اور پھر جو بابا نے کہا، وہ ہم نے کیا اور آج اپنی محبت کو پا لینے کا نشہ بھی چکھ لیا۔

لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی۔

"بابا! آپ ممّا کو اتنا جانتے ہیں؟" ایک روز کھانے کی میز پر میں نے یوں ہی پوچھ ڈالا۔

"ہمارے پاس کوئی اور چوائس نہیں بیٹے... ہم نے اسی فیس بک کو پڑھنے میں ایک عمر گزاری ہے۔"

"ہائیں... فیس بک؟" ماما سالن کا ڈونگا رکھتے ہوئے چونکیں۔

"فیس بک کیا بلا ہے بھئی... آپ دونوں باپ، بیٹے اسی پہ فدا ہو گئے؟ اس روز علی بھی..."

ممّا جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ حوریہ تو سٹپٹا کر کھڑی ہی ہو گئی۔

"ممّا! آپ بیٹھیے نا، کھانا میں سرو کرتی ہوں۔"

وہ ان کے ہاتھوں سے ڈونگا لینے لگی تھی۔

اس کی بوکھلاہٹ پر ممّا حیران، جبکہ میں اور بابا کھل کر مسکرا دیے تھے۔

*

شاہین ملک

سپنے چاہ اور موہ کا پھندا

سیل فون پر نگاہ پڑتے ہی علیشا چونکی پانچ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ پورے گھنٹے بھر کا سفر کر کے پھر گھر کی صورت نظر آئے گی۔ اس نے پانی کا تھرماس، خالی لنچ بکس اور ہینڈ بیگ اٹھایا اور کرسی سے اٹھتے وقت کولیگ کو اگلے روز کے اسائنمنٹ کی بریفنگ دے کر بس اسٹاپ کا رخ کیا۔

راستے میں ایک بار پھر خوابوں سے اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی۔ جدید ترین فیشن اور رجحانوں کے فرنیچر کی دکانوں کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ کسی دکان پر لیدر کے فرنیچر تو کہیں ساگوانی اور شیشم کی لکڑی کا چنیوٹی اسٹائل کا خوبدار صوفہ سیٹ، کہیں دائیں جانب جلتے ہوئے ٹیبل لیمپ کی روشنیاں اسے اپنے دل کے معبد خانے میں ٹمٹماتے چراغ سے لگتی تھیں۔ روزانہ وہ اس طویل شاہراہ سے گزرتی اور سوچتی کہ اس بار بینک میں پندرہ ہزار روپے جمع ہوئے ہیں۔ چار ہزار عیدی کے ملا کے کل ہو گئے 19 ہزار صرف چھ ہزار اور جمع ہو جائیں گے تو وہ نیا صوفہ ضرور خرید لے گی۔

اس کا ڈرائنگ روم بھی ایک مشہور فرنیچر شاپ کے دیے ہوئے ایک ویب سائٹ کے امیج کے مطابق سج جائے گا۔ یہ ڈرائنگ روم میرے اور میرے خاندان کے ذوق کی عکاسی کرے گا۔ ٹھیک ہے کہ گھر مکینوں سے بنتا ہے اور مالی حیثیت ان کی کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی علمی بصیرت اور اخلاقی اقدار سے پہچانے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود سماج کے معیار مختلف ہو گئے ہیں۔ جس گھر کے لاؤنج اور ڈرائنگ روم سے مہنگے یا انتہائی منفرد فرنیچر اور آرائش کا شائبہ نہ ملے، وہ گھر گھر نہیں لگتا۔ جس طرح ہم عورتیں میک اپ کر کے اطمینان اور اعتماد محسوس کرتی ہیں اسی طرح گھر کی آرائش کر کے وہی اعتماد قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارتی ہیں۔

اسی اثنا میں اس کی بس آ گئی اور وہ خوش دلی سے اس میں سوار ہو گئی..... "میں واپسی پر آج قیمہ لے جاتی ہوں مٹر اور آلو تو گھر میں ہیں۔ اظفر اور زین دونوں چاول پسند کرتے ہیں تو بس ٹھیک ہے، قیمہ چاول اور پچھلے پہر کی دال نئے بگھار کے ساتھ اچھا کومبینیشن رہے گا۔ اس ماہ کیا بڑا کام کرنا ہے؟ بلوں کی ادائیگی وقت پر ہو گئی یا نہیں؟ موسم بدل رہا ہے اظفر کو اسکول یونیفارم کا سویٹر بھی لے کر دینا ہے۔ اظفر کوچنگ سینٹر سے آ کر اسنیکس کھائے گا؟ جلیبیاں، سموسے، نگٹس یا شامی کباب گھر میں کچھ تو ہونا چاہیے۔ ہاں کوئی کولڈ ڈرنک بھی فریج میں رکھا ہو تو کیا برا ہے؟ ہمارے گھر میں سب چیزیں محفوظ رکھی جا سکتی ہیں ماسوائے کولڈ ڈرنک کے..... لے جاتی ہوں پھر بھی۔"

وہ بڑبڑاتی رہی۔ لمبا سفر تھا اور دن بھر کا تھکا ہوا دماغ۔ اونگھ سی آنے لگی مگر ہمارے ہاں کی بسوں میں اس قدر آپادھاپی ہوتی ہے کہ اونگھتے وقت بھی اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔

"اعصابی تھکن کیوں ہونے لگی مجھے، میں تو صحت مند ہوں۔" اس نے خود کو دلاسا دیا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ دفتر میں [illegible] صحیح جاتے تو گھر پر کوئی نہ کوئی الجھن آن پڑتی، مگر زندگی اسی کا نام ہے۔ ہر کوئی ہمیشہ پھولوں کی سیج پر نہیں رہتا۔ زمینی حقائق کچھ اور ہی ہوا کرتے ہیں۔ بچپن میں ساتھ رہنے والوں سے ہونے والی تلخیاں، محبتیں اور خفگیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ کوئی روٹھنے کا ارادہ ناکام بناتا ہے تو کوئی منا لینے کی عادت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے۔ کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی عادت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ دل ہے کہ اپنے اندر غموں سے لڑنے کی طاقت جمع کرتا چلا جاتا ہے۔ "آج کیوں دل ڈوب رہا ہے؟ کچھ زیادہ دباؤ تھا شاید کام کا۔"

وہ سبزی خریدنے خوامخواہ رک گئی، حالانکہ فیصلہ کر کے چلی تھی کہ قیمہ آلو پکانا ہے۔ قیمہ تو لے لیا۔ اب کیا رہ گیا، اگلے روز کے لیے بھنڈی اور ٹماٹر، ہاں یہی بہتر ہیں۔ مرکزی شاہراہ پر کھڑے کھڑے دماغ ماؤف سا ہونے لگا تھا۔

"کیا حساب ہے بھنڈی؟" علیشا نے سبزی والے

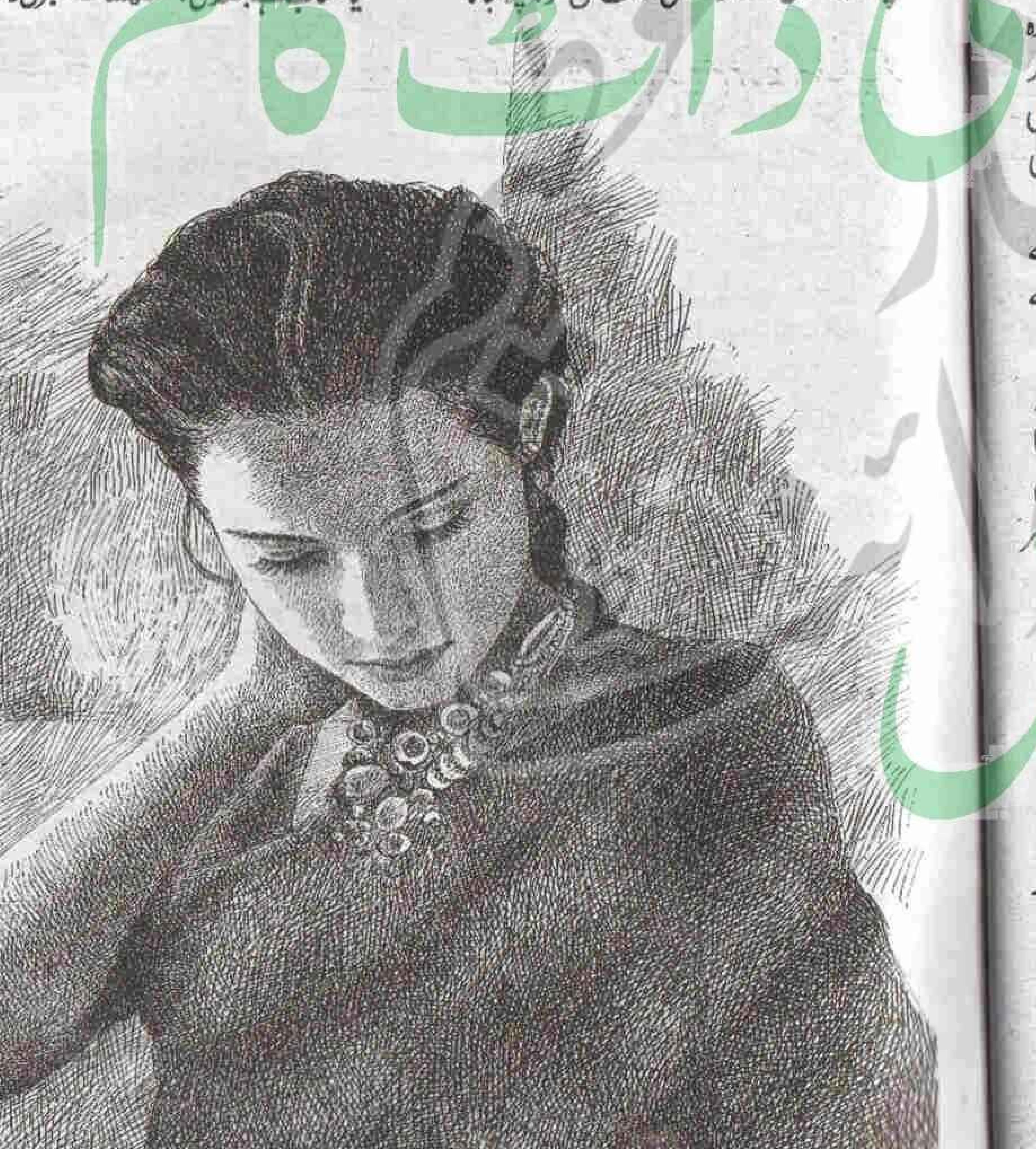

سے پوچھا۔

جواب ملا "چالیس روپے بی بی....." اور وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"اوکے' آدھا کلو تول دو۔"

سبزی لے کر وہ اوپر اپنے فلیٹ میں آئی۔ اظفر' اس کے بیٹے کا ٹیوٹر آیا ہوا تھا۔ وہ کچن ہی میں بیگ اور سبزی کا تھیلا لے گئی۔ بائیں جانب سلیب پر انہیں دھر کر چائے بنانے لگی۔ قیمہ تھوڑی دیر کے لیے اس نے پیچھے رکھ دیا تھا۔ مبادا چائے میں اس کی مہک نہ آجائے۔ ٹیوٹر کو ایک پیالی دے کر وہ قیمہ چڑھانے لگی سارے مسالے اکٹھا ڈال کر ڈھکن ڈھک کے وہ راہداری سے ہوتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی۔

"بیٹا! کبھی بیٹی جیسا سگھڑاپا نہیں رکھتا۔" اس کی سہیلی ردا نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ اب یہی منظر اس کے گھر میں اترا ہوا تھا۔ بے ترتیب بچھونے اور پھیلی ہوئی اسٹیشنری "پتا نہیں کیا تلاش کرنا چاہا تھا اظفر نے۔" اس نے ایک ایک کر کے چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔ اس سے پہلے کہ زین دفتر سے لوٹیں' وہ چاہتی تھی کہ ہر کمرہ ترتیب سے آراستہ ملے۔ چند لمحوں ہی میں ٹیوٹر کی رخصتی کا وقت ہو گیا۔ وہ جاتے جاتے علیشا کو اظفر کی تعلیمی کارکردگی پر بریف کیا کرتے تھے۔ اظفر کے بلانے پر وہ باہر گئی۔ اتنے میں وہ موبائل آن کر کے اب تک کے آئے ہوئے میسجز اور مسڈ کالز دیکھنے لگا۔

"برخوردار! تشریف لائیے آپ بھی۔" علی رحمٰن' اظفر کے ٹیوٹر نے اسے آواز دی اور وہ تیزی سے موبائل میز پر دھر کے ان کے قریب آکھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر ان تینوں میں معمول کی گفتگو ہوئی۔ ٹیوٹر رخصت ہوا تو علیشا کچن میں قیمہ بھوننے اور آٹا گوندھنے میں مشغول ہو گئی۔

سیل فون پر میسج ٹیون آئی تو اس نے آٹے میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو صاف کرنے کے بعد پڑھا۔ لکھا تھا "میرا سفری سامان نکال دینا۔ مجھے لاہور جانا ہے رات کی فلائٹ سے۔ پرسوں رات واپسی ہو گی۔"

زین العابدین ایڈورٹائزنگ میں فری لانس پروڈکشنز کرتے تھے۔ پچھلے چند برسوں سے یہ گھرانہ مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ چند اداروں کی کشمیری فلمیں اور اسکرپٹ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے تھے اور کئی ایک نے اب تک معاوضہ ادا نہیں کیا تھا۔ مالی تنگی کو دیکھتے ہوئے **علیشا** نے سیلز اور مارکیٹنگ کے بھولے بسرے سبق پھر پڑھے اور ملازمت کر لی تاکہ گھر کی کھوکھلی ہوتی ہوئی معیشت کا سہارا بن جائے۔ گرانی روز افزوں بڑھتی چلی جا رہی تھی' ورنہ زندگی آسانی سے گزر سکتی تھی۔ اب لائف اسٹائل بھی ایسا ہوتا چلا جا رہا تھا کہ جس میں اپر مڈل اور مڈل دونوں ہی طبقے مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ وہ یہی سوچتی تھی کہ دنیا میں ہر کوئی تو سونے کا چمچہ لے کر نہیں پیدا ہوتا' پھر زین ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ ہم پیچھے رہ گئے یا ہمارے پاس دنیا کی ہر آسائش ہونی چاہیے تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے زین کا اچانک لاہور جانا بہت کھلا۔ رات گئے وہ لوٹے تو اپنا بیگ دیکھ کر مسکرائے۔

"آج نہیں' کل صبح جانا ہے۔ پروگرام بدل گیا ہے۔ کلائنٹ کا موڈ ہوتا ہے ناں' اسے شالیمار میں رقص فلمانا ہے۔ بسکٹ کا اشتہار ہے اور ناچ کے بسکٹ بیچنا ہے۔"

علیشا سنجیدہ تھی مگر زین ہلکے پھلکے خوشگوار موڈ میں تھے۔ اس نے زبردستی مسکرا کر "اوکے" کہا۔

"کھانا لگاؤں کیا؟" رات کے بارہ بجے تک وہ ان کا انتظار کر رہی تھی جبکہ اظفر کے اسکول کے لیے چھ بجے بیدار ہونا بہت ضروری تھا۔ چاہتی تھی کہ جلد فراغت ہو جائے تو وہ بھی بستر میں جا سکے' لیکن وہ صرف بچے کو کھلا پلا کے سونے پر آمادہ کر سکی۔ بچہ بھی ایسا تھا کہ باپ کے آنے تک کھیل کود میں مگن رہنا چاہتا تھا تاکہ ان کے آنے پر ہی سوئے۔ **علیشا** کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ گھر کے نظام الاوقات متعین ہو جائیں۔ کبھی اس کا زور چلتا تو کبھی نہیں۔ اسی اثنا میں زین بولے۔

"کھانا رہنے دو' چائے بنا دو۔" وہ پھرتی سے مڑی اور

کچن سے چائے کی مسحور کن مہک آنے لگی۔ چائے ختم کرتے ہی وہ بولے۔

"یار! ذرا سرسوں کا تیل لیتی آنا اور تکیے کو ایک اور غلاف پہنا دو ورنہ تمہارا لایا ہوا نیا تکیہ روغنی روٹی کا نقشہ بن جائے گا۔" وہ مسکرا رہے تھے۔ **علیشا** کو ہنسی آگئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ان کے سر کی مالش کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کمرا سمیٹنے لگی۔ بکھرے ہوئے اخبار' پھیلے ہوئے جوتوں کے جوڑے' کمپیوٹر ٹیبل کی صفائی وغیرہ۔

جب رات وہ سونے کے لیے لیٹی تو زین نے لائٹ گل نہیں کی بلکہ کہا۔

"میں سوچ رہا تھا' اب اظفر سمجھدار ہو گیا ہے۔ ہمیں کمرہ علیحدہ کر لینا چاہیے۔"

اسے حیرت ہوئی تھی لہٰذا اس نے ایک لمحے کو اپنے اندر ارادے کی کمزوری سی محسوس کی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو بھئی؟ کیا کہہ دیا میں نے؟ آج کل بچے کیا نہیں جانتے۔ ہماری اخلاقی اور سماجی اقدار شرم و لحاظ والی ہیں۔ ہماری تہذیب..... وہ کہتے کہتے رک گئے۔

علیشا نے اپنا تکیہ اٹھایا اور لاؤنج میں بچھے صوفہ کم بیڈ پر آڑا ترچھا خود کو گرا لیا۔ سارے دن کا تھکا ماندہ جسم پل بھر میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ علی الصبح اذانوں کے وقت آنکھ کھلی تو گردن میں دکھن سی محسوس کی' مگر ہماری تہذیب..... اس سے آگے وہ پتا نہیں کیا باور کرانا چاہتے تھے۔

✱ ✱ ✱

وہ چائے لے کر کمرے میں گئی تو وہ فون پر اپنے اسسٹنٹ کو کچھ سمجھا رہے تھے۔ سینٹر ٹیبل پر چائے رکھ کر وہ جانے لگی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ بات ختم کر کے وہ بولے۔

"اظفر کی فیس دے دی ہے کیا؟"

"جی! دو تاریخ ہی کو دے دی تھی۔"

"یوٹیلٹی بلز ہو گئے کیا؟"

"بجلی کا بل ہی باقی ہے۔ گیس اور پانی کے تو ادا ہو گئے۔"

"آج ایک عرصے بعد انہوں نے گھر کے معاملات میں دلچسپی لی تھی۔ اسے وہ بہت اچھے لگے۔ ورنہ تو اسے یاد نہ تھا کہ کبھی اظفر کے یونیفارم' ذاتی استعمال کی اشیاء' گھر کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے کبھی بنا کہے چند روپے ہتھیلی پر رکھے ہوں اور وہ ہر بار یہی سوچتی کہ ہر مرد کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ کوئی اتنا ڈومیسٹک نہیں ہوتا اس لیے دوسرے مردوں کے ساتھ زین کا مقابلہ کرنا ہرگز صحیح نہیں ہو گا۔ علم و دانش رکھنے والے افراد ذرا مشکل پسند بھی ہوتے ہیں اور ان کی فلاسفی بھی اور طرح کی ہوتی ہے۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے ساری حیاتی محبت کے اسی فلسفے کی گرہیں کھولیں اور ہر بار یہی بتایا کہ محبت میں انا فنا ہوتی ہے تو محبت ہوتی ہے ورنہ یہ ہوتی ہی نہیں ہے۔ جب انا اور غرور کی مٹی سے پیر بھرے رہیں تب تک راستہ نہیں کٹتا۔ مٹی راستہ عبور نہیں کرنے دیتی۔ انا کوئی لبادہ' کوئی پردہ نہیں رکھتی۔ صاف دل' شفاف نیت اور ایمانداری سے سپردگی کا عالم' یہ ہوتی ہے محبت کی فضا۔

اندر سے آواز آئی "ہائے نی **علیشا**! تیرا لٹیا شہر بھنبھور تو نے نہ پائی محبت۔ اب تو کپڑے دھو برتن مانجھ کر اور چاکری کر کے ہی تجھے دنیا کے روبرو سہاگن کا سوانگ بھرتا ہے۔ وہ مسالہ بھونتی جاتی اور خود کو دلاسا دیتی جاتی۔ آج میں یہ پکا لوں' آج میں بستر کی نئی چادر لے آؤں' آج میں پردے دھو کے ٹانگوں' آج میں نئے برتنوں میں کھانا لگاؤں' آج میں ڈھنگ سے بال سنواروں' کوئی صاف ستھرے نئے لگتے سے کپڑے پہنوں گی۔ کچھ تو التفات ہو میری جانب بھی۔ میری ذات بھی توجہ چاہتی ہے۔ کوئی ایک جملہ حوصلہ افزا سا' میرے اندر امنگ جگا دے جینے کی..... کیا میں زہر نگلنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ کیا میں نے اس شخص سے اس لیے شادی کی تھی کہ یہ اپنا وجود پتھر سا کر لے۔ برف تو پھر جذبے کی حرارت سے پگھل

جاتی ہے۔ پتھر سے میرا وجود ٹکرائے گا تو گزند بھی مجھے ہی پہنچے گی۔ میرے معصوم جذبوں' چاہتوں اور احساس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

اس نے کچن سے فارغ ہوتے ہی نہا دھو کے کپڑے بدلے۔ کمرے کو از سر نو سنوارا۔ جھاڑا ہوا بستر لگایا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ لوڈشیڈنگ ہمارے جیسے مقروض ملک کے مقدر میں لکھی گئی ان مٹ تحریر ہے۔ ہم اس لیے اندھیرے میں رکھے جاتے ہیں کہ کہیں روشنی ہماری آنکھوں کو چندھیا نہ دے۔

"امی...... کہاں کھوئی ہوئی ہیں؟ سنیں! میں سیل فون کا کارڈ لے آؤں؟ کیا آپ کو بھی چاہیے؟"

"نہیں چندا! مجھے نہیں چاہیے...... لیکن باپ کے گھر آنے کا وقت ہے' ایسے میں تم نیچے دکان پر نظر آؤ گے تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔ صبح لے لینا۔"

"امی! صبح اسکول جانا ہے۔ مجھے تو ابھی دوستوں سے باتیں کرنی ہیں۔ ٹیسٹ کی تیاری کی کچھ پرابلمز ہیں امی!" اظفر نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ **علیشا** نے اسے جانے دیا۔

"دیکھو! میرا سیل فون احتیاط سے لے جاؤ۔ زینے پر بے پناہ اندھیرا ہے۔ ٹارچ روشن کر لینا۔"

"اچھا امی! لیکن آپ نے ابو سے اپنے کارڈ کا ہی کہنا ہے ورنہ میں دو گھنٹے لیکچر سنوں گا کہ مجھے رات کے وقت کارڈ کیا کرنا ہے۔"

"ابھی سوچ لیں کچھ اور چاہیے تو۔" اظفر نے جیکٹ پہنتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' کچھ اور نہیں چاہیے۔ آپ جلدی سے جائیں اور لے آئیں جو لانا ہے۔"

"امی! آئس کریم بھی......" وہ کم سن بچوں کی طرح فرمائش کرتا تھا یا اسے پتا تھا کہ ماں کا دل نرم ہے وہ جھٹ سے سو دو سو روپے پکڑا دے گی۔

"صرف ایک چاک بار...... کیا سمجھے؟"

"نہیں! میں لیٹر پیک لاؤں گا۔ مجھے دوپہر میں بھی چاہیے۔"

علیشا پھر سوچنے لگی۔ "یہ آج کل کے بچوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ہر وقت تفریح' ہر وقت تعیشات' ہر لمحے سہولتوں کی طلب' ہم ان کے بچے ہیں یا یہ ہمارے باپ ہیں' کچھ فرق کیوں نہیں رہ گیا۔ ہمارا بچپن کیسے قناعت پسندی سے گزرا۔ جو ماں باپ نے کھلایا' پہنایا' اوڑھایا' خوشی سے کھا پی لیا۔ آج کل کے بچوں کے تو مطالبے ختم ہی نہیں ہوتے۔"

تھوڑی دیر بعد لائٹ آئی اور وہ کپڑے استری کرنے لگی۔ بیل بجی تو وہ چونکی۔ "یہ لڑکا پھر چابی لے کر نہیں گیا۔" اس نے دروازہ کھولا تو پتا چلا زین آئے ہیں۔ وہ اخلاقاً" مسکرائی' جواب نہیں ملا۔ آدھی مسکراہٹ ہونٹوں میں قید کر کے وہ بولی۔

"کھانا لگاؤں؟"

ایک پرانا گھسا پٹا سوال نظر انداز کر کے وہ بولے۔

"نہیں! صرف چائے دے دو۔"

"صاحبزادے نظر نہیں آئے نیچے؟" اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر غائب ہے۔ اب کیا ختم ہو گیا تھا گھر میں؟" انہوں نے کپڑے بدل لیے تو پوچھا تھا۔

"اس کے سیل فون میں بیلنس ختم ہو گیا تھا۔ بہانہ بنایا آئس کریم کا۔"

"اچھا میں سمجھا کہ پھر ہرا دھنیا' نمک یا شکر ختم ہو گئی ہو گی۔" انہوں نے گلاس میں پانی انڈیلا۔ اتنے میں اظفر گھر میں داخل ہوا۔

"کیوں صاحبزادے! ٹیوشن ٹھیک چل رہی ہے آپ کی؟" انہوں نے چائے کا پہلا گھونٹ بھرا۔

"جی! سر تو آ رہے ہیں مگر بس یہ سو سو ہی ہیں؟" اس نے کارڈ اسکریچ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سو سو کیا ہوتا ہے؟" انہوں نے **علیشا** کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ ان کی کوئی اسپیشل لغت ہے' جہاں سے اونگے بونگے لفظ تخلیق ہوتے ہیں۔ استاد کی عزت نہ کرنے والا کبھی علم حاصل نہیں کر سکتا بدتمیز۔" **علیشا** نے اپنے بیٹے کی طرف غصے سے دیکھا۔

"یہ لڑکا پتا نہیں کب محنت کرے گا۔ میں تو اس سے مایوس ہوں بھئی۔" زین نے اسے لاپروائی سے سیل فون پر پیغام رسانی کرتے دیکھ کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ بیڈ روم میں سونے کے لیے گئی تو زین نے کہا "دراصل غلط وہ نہیں تم ہو۔ تمہیں فرصت ہی نہیں کہ گھر اور بچے کی فکر ہی کر لو۔ اسے کمپیوٹر' لیپ ٹاپ اور سیل فون کیوں دے رکھے ہیں تم نے؟ اسی لیے دل نہیں لگتا اس کا پڑھائی میں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر ہم دونوں گھر سے باہر ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے In touch رہنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔" **علیشا** نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا اور اپنے صوفہ کم بیڈ کو کھول کے لیٹ گئی۔

آنکھوں سے بہتے پانی کی شدت اور احساس کو محسوس کرنے کی فرصت شاید کسی کو نہیں تھی۔ رات کے کسی پہر وہ تھک کر سو تو گئی مگر ایسا لگا جیسے تنہائی کا زہر رگ و پے میں اتر رہا ہو۔ لوگ اس کیفیت کو ڈپریشن کا نام دیتے ہیں لیکن وہ اعصابی طور پر کمزور نہ پڑنا چاہتی تھی۔ اظفر کو دو چار باتیں سنا کر اس نے دل ہلکا کر لیا تھا۔ صبح زین کو لاہور جانا تھا۔ دفتر والوں کی گاڑی آٹھ بجے آ جاتی تھی۔ اظفر نے سات بجے ہی اسکول کی تیاری کر لی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وین آ گئی۔ وہ بھاگم بھاگ اسے اور زین کو ناشتہ کروانا چاہتی تھی۔

"آپ سلائس مکھن لیں گے یا مفنز کے ساتھ چائے؟"

"صرف چائے۔" زین کی سادہ سی فرمائش تھی۔

"پاپا نے تو آج جہاز کی باسی ڈبل روٹی اور سوکھا سا جیم کھانا ہے مجھے دے دیں مفنز۔" اظفر نے اس کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

"تم بھی لے لو۔" **علیشا** نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ وہ جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی اظفر نے مفنز کھانا شروع کیا اتنے میں زین کپڑے بدل کر آ چکے تھے۔ وہ بھی چائے پی رہے تھے۔ ان کے بریف کیس میں سی ڈیز' ہیڈ فون' اے ٹی ایم کارڈ' ویزا کارڈ سب کچھ جو اسے یاد تھا' وہ رکھ چکی تھی۔ ایک ہینڈ بیگ میں نائٹ سوٹ' ٹی شرٹ' ایک جینز اور موزے وغیرہ رکھ دیے تھے۔ وین آئی ادھر زین کی گاڑی بھی آ گئی۔ دونوں نے ساتھ ساتھ ہی گھر چھوڑ دیا۔

بہت دیر تک وہ گیلری میں کھڑی باپ بیٹے کو جاتے دیکھتی رہی۔ پھر واپس آ گئی۔ ابھی ڈائننگ ٹیبل سمیٹنے' اظفر کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام اور خود دفتر جانے کے لیے لباس کی تیاری اور شام کے کھانے کے ساتھ ساتھ ماسی سے گھر کی صفائی کرانے تک ایک نہیں' کئی کام تھے جو کرنا باقی تھے۔ ایسا لگا جیسے گھوڑے کو چابک ماری جائے تو وہ سرپٹ دوڑنے لگتا ہے۔ اپنے مالک کا ہر حکم بجا لانے کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے۔ غریب سرپٹ دوڑ ہی سکتا ہے ناں!

اس کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے ملتانی مٹی کا چہرے اور گردن پر لیپ کیا۔ بستر کی چادریں تبدیل کیں' ڈائننگ ٹیبل کا کور بدلا' کشن جھاڑے' ڈسٹنگ کی اور گھر کو سجا بنا کے اظفر کے لنچ کا انتظام کیا۔ مٹی سوکھی تو چہرہ دھو کے کپڑے بدلے۔ لنچ بکس اور اپنے بریف کیس کو تھامے گھر سے نکل گئی۔

ہر روز کی یہ روٹین تھی اور گھر سے جڑے ہوئے محبت کے اس رشتے میں کس قدر مٹھاس اور اپنائیت تھی...... ان منظروں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ اندر سے گنگنانے لگتی تھی۔ غربت کو دھونے کے لیے گھروں سے نکلنے والی محنت کش عورتوں کے چہروں پر چمکتے ہوئے پسینے کو دیکھ کر وہ مسکرا اٹھی۔

راستے بھر وہ کوچ کی دھکم پیل اور گرمی کو برداشت کر لیتی' یہ سوچ کر کہ اس کی محنت کی کسی کو ضرورت ہے۔ اس کے اپنے گھر کی دیواروں پر جمی غربت کی گرد جھاڑنے کے لیے' اس کی فیملی کو اس کی ضرورت ہے۔ آنکھیں دھوئیں سے کسکتی بھی تھیں' پانی چھلکتا بھی تھا تب بھی وہ اجالے تلاشنے کی خواہش میں اپنی بینائی کو بچا کے رکھتی تھی۔ ٹشو پیپر کا سہارا لے کر آنکھوں کو گرد سے بچاتی جاتی۔ دل میں دھڑکنیں

رقص نہ بھی کرتیں، تب بھی زین کا کوئی والہانہ پن، اظفر کا پیار اور ان تینوں کے درمیان محبت، اعتبار اور یقین کا رابطہ اسے تھکنے نہ دیتا تھا۔

ریشمی پوشاک‘ نامی اس بوتیک پر وہ ڈیزائننگ سے لے کر مارکیٹنگ تک سب ہی کچھ دیکھتی تھی۔ جب خوشبوؤں میں مہکی ہوئی کوئی دوشیزہ، لباس خریدنے آتی تو اس کی آنکھوں میں دیے جلتے دیکھ کر اسے اپنی ساری تھکن اترتی نظر آتی.... یہ حوصلہ ہوتا ہے جو ایک نظر سے دوسری میں منتقل ہوتا ہے۔ خاموش نگاہوں میں گیت گاتے ہوئے وجود.... آئینوں کے سامنے لہرا کر وہ جب اپنی فٹنگز دیکھتیں تو وہ تازہ دم ہو جاتی تھی۔

منہ مانگے داموں پر بکنے والے ان ملبوسات کو دیکھتے ہی **علیشا** کے جسم میں توانائی کی جو لہر اٹھتی وہ گھر جا کر اسے روبوٹ بنائے رکھتی۔ گھر پہنچتے ہی اس کا استقبال گھر کی بے ترتیبی ہی کیا کرتی تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی طاقت کو ذخیرہ کرکے کام کرتی رہتی تاکہ زین کے آنے سے پہلے کھانا تیار ہو جائے۔ زین کے آنے جانے کا کوئی ایک وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ سرِشام آجاتے اور وہ دن ہوتا دہری شامت کا۔

"میں کب سے چائے کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ بیگم صاحبہ ہیں کہ آکے ہی نہیں دیتیں۔" وہ شکوہ بھی پیار سے کرتے لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ کتنا حصہ پیار ہے اور کتنا حصہ برہمی کا۔

"ابھی بنائے دیتی ہوں۔" وہ اپنا بیگ رکھ کے فوراً" کچن میں چلی جاتی۔ اس برہمی کا بھی اپنا ہی مزا تھا۔ وہ بھی چائے کا ایک گھونٹ بھر کر خود کو اطمینان دلاتی۔

"دیکھو! تمہیں کتنی فریڈم دی ہوئی ہے۔ اپنی مرضی سے کام کر رہی ہو اور آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں.... بچہ اکیلا رہتا ہے۔ اس کے پاس کون آتا ہے، کون جاتا ہے؟ یہ کیسے کھاتا پیتا ہے، تمہیں اس کی کوئی فکر نہیں۔" کھانے میں صرف سات منٹ کی دیر ہوئی تو الزامات کی بھرمار شروع ہو گئی۔

"میرا خیال ہے انسان دن بھر کام کرنے کے بعد گھر لوٹ کر چند لمحے پرسکون رہ کر کچھ کام کرنا یا کچھ سوچنا چاہتا ہے۔"

"تم نے کیا سوچنا ہے۔ تم جیسی عورت کو صرف اپنے ہار سنگھار اور کھانے کی فکر ہوتی ہے۔"

"ہر چیز جو ممکن ہو مہیا کرکے جاتی ہوں۔ گھر میں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔ آپ کا بچہ یا تو کمپیوٹر پر ہوتا ہے یا سیل فون کے میسیجز پر یا پھر کتابوں کی دنیا میں۔ ہر آدھے پونے گھنٹے بعد میں فون کر رہی ہوتی ہوں۔ پڑوسیوں سے آنے جانے پر نظر رکھنے کے لیے کہا ہوا ہے۔ آپ کیوں اتنے چراغ پا ہو رہے ہیں؟" **علیشا** نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا تو زین اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

* * *

وہ لاہور میں تھے اور وہاں پہنچ کے اظفر کو میسیج آچکا تھا کہ "میں خیریت سے ہوں اپنا اور ماں کا خیال رکھنا۔" اسی امرت کو قطرہ قطرہ اپنے وجود میں اتارتے ہوئے وہ گھر کے چھوٹے بڑے کام نبٹاتی رہی۔ اسے ایک رات اور ایک پورا دن تنہا رہنا تھا۔

"چلو! الماریاں صاف کرتی ہوں۔" اس نے ایک ایک کرکے صفائی کا کام شروع کیا۔ چند بڑے سائز کے شاپرز سامنے رکھ کر وہ غیر ضروری کپڑوں کو علیحدہ کرنے لگی۔ زین شلوار قمیص کبھی کبھار ہی پہنتے تھے مگر اکٹھے آٹھ سوٹ دیکھ کر وہ سوچنے لگی کہ کون سا رکھے اور کون سا ماسی کو دے دے۔ ہر اچھی بیوی کی طرح اس نے ہر قمیص کی جیب بھی ٹٹولی کیونکہ چھ مہینے پہلے ایسی ہی ایک قمیص دھوتے وقت سو روپے کا نوٹ بھی دھل گیا تھا مگر شکر تھا کہ پھٹا نہیں تھا۔ آج کوئی نوٹ نہیں ملا مگر ایک سیل فون مل گیا۔

"یہ کس کا ہے۔" وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی مگر خود کو علم ہوتا تو وہ سوال ہی کیوں کرتی۔

"اظفر کا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اس کے پاس تو کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہتی تھی۔ ایک سستا سا موبائل اسے دے رکھا تھا اور زین کے نزدیک اظفر کی تمام تر لاپروائیوں اور بدتمیزیوں کا سبب یہی موبائل فون تھا۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، پھر ایک طرف رکھ کے باقی کا کام نبٹانے لگی۔

رات گئے فراغت ہوئی تو وہ سیل فون کی طرف متوجہ ہوئی.... بہت مہنگا اور شاندار قسم کا موبائل تھا۔ بالکل ویسا جیسا اخبار کے رنگین اشتہار میں چھپا تھا اور ٹی وی کے ہر چینل پر اس کا اشتہار چلتا تھا۔ شاید کسی کو دینے کے لیے خریدا ہو یا کسی نے تحفہ دیا ہو گا۔

"کھول کے دیکھوں، کیسے چلتا ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی جیسے وہ کوئی کھلونا ہی تو ہو۔ موبائل فون میں اس کو دلچسپی ادھر ادھر آنے جانے والے میسیجز سے ہوئی تھی، وہ اسی طرف راغب ہوئی اور اب ایک ایک کرکے آنکھوں سے پردے ہٹنے لگے تھے۔ ایک اداکارہ نے زین سے برملا اظہار عشق کیا تھا۔ وہ مسکرا دی.... "ایسی ہی ہوتی ہیں یہ نئی نئی اداکارائیں۔"

ایک نو آموز ڈرامہ نگار نے انہیں اپنا آئیڈیل مان کر اپنے لیے کامیابی کی دعا کی استدعا کی تھی.... "ویل ڈن زین صاحب!" وہ مسکرا دی۔

ایک صحافی نے اپنے سنجیدہ کالم کا عنوان تجویز کرنے کی فرمائش کی تھی.... اس نے انہیں اپنا استاد مانا تھا۔ **علیشا** کو زین پر فخر ہوا۔ آٹھ دس ایسے پیغامات گزر گئے تو وہ سوچنے لگی کہ اب سیل فون بند کرکے واپس رکھ دے کہ ایک مشترکہ دوست حبا کے پیغامات بھی آنے لگے۔ یہ کیا لکھا تھا۔

"میں نہ جانے کب سے آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔ آپ نے **علیشا** کے کچن میں جانے کے بعد میری تعریف کی تو مجھے بہت اچھا لگا.... میں رات بھر نہ سو سکی۔ سوچتی رہی کہ کاش **علیشا** کی جگہ میں آپ کے ہمراہ رہتی.... آپ کی خدمت کرتی، جی جان سے، اپنا سب کچھ مان کے۔"

"حبا.... کیا یہی اپنی حبا؟" اس کے دماغ میں کیسے جھکڑ چلنے لگے.... ہوا بھی گرم تھی اور بدن میں چنگاریاں بھی بھر گئی تھیں۔

حبا تو اکثر گھر میں آتی تھی.... کبھی زین سے صلاح مشورے کرنے تو کبھی اس کے ساتھ دوستی نبھانے.... کتنے ہی راز دونوں نے شیئر کیے تھے۔ وہ اپنے والدین کے کچھ فیصلوں سے نالاں رہتی تھی۔

"میں آپ کی بھلائی چاہتی ہوں۔ **علیشا** تو آپ کی شہرت سے جلتی ہے، جب ہی تو خود کو کیریر وومن بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی۔ ہر وقت فیشن ڈیزائنرز کے ہاں آتی جاتی ہے۔ کتنے غرور سے وینزہ احمد، نبیلہ، این جے اور منا مشتاق سے ہونے والی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتی ہے۔ کتنے آرٹسٹوں کے ساتھ تصاویر کھنچواتی ہے اور فیشن کے رسالوں میں اسے شائع کراتی ہے۔ کتنے ادیبوں اور شعرا کو گھر بلا کر ضیافتوں کے بہانے اپنے تعلقات استوار کر رہی ہے اور آپ ٹھہرے بہت ہی بھولے، اس کی مکاریوں میں آگئے ہیں۔ آپ اس کی عادت سے واقف نہیں وہ آپ کو اور مجھے بھی کئی مرتبہ نیچا دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔"

وہ کچھ آگے بڑھی تو ایک میسیج میں زین کہہ رہے تھے۔ "اصل میں چھوڑنا تو میں اسے کئی برسوں سے چاہتا ہوں مگر اظفر کا خیال آتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے جوان بیٹا...." آگے کی سطور شاید delete ہو گئی تھیں۔

"آپ کو کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ امی ابو کب سے انتظار میں ہیں۔ کسی ایسے ویسے سے شادی نہیں کرنے والی.... میں تو آپ کی لونڈی باندی ہوں اور بس۔"

اتنا پڑھ کر **علیشا** کا دماغ چکرانے لگا۔ کیا یہ وہی حبا ہے، جو اپنے دفتری کولیگز کے عشق کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ کبھی اسے فرحان ویلنٹائن ڈے پر سرخ پھول بھیجتے تو کبھی کوئی کراچی کی مہنگی ترین بوتیک سے خریداری کی آفر کرتا۔ زین سے اس کے اس نوعیت کے تعلقات؟ شہابی رنگت اور لانبا قد رکھنے والی اس دبلی پتلی سی لڑکی کے اس نئے روپ کو سہنا کچھ آسان بات نہیں تھی۔ وہ زین سے

کیا چاہتی تھی۔ ٹیلی ویژن کی ابھرتی ہوئی پروڈیوسر تھی، اسکرپٹ رائٹرز اور دیگر چینلوں پر ایک نہیں، ہزاروں پروڈیوسر اور تکنیکی عملہ اس سے واقف تھا۔ ایک میڈیا پرسن کے طور پر اس کا بزنس کمیونٹی میں بھی اٹھنا بیٹھنا تھا اور وہ آداب محفل جاننے والی لڑکی تھی۔ اگر چالیس کے سن کو بھی پہنچ رہی تھی، تب بھی اس کا ساتھ نبھانے والوں کی ایک طویل فہرست موجود تھی، پھر وہ کیسے ایک شادی شدہ مرد کے گھر کو ڈسٹرب کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ اب اسے یاد آرہا تھا کہ ہر تہوار پر ایک آدھ دن کے لیے وہ ان کے گھر میں موجود ہوتی۔ مہنگے مہنگے تحفے دینا دلانا، سالگرہ وغیرہ پر باہر کھانے کے لیے آنا جانا، اظفر سے چیٹنگ کرنا، زین سے گھنٹوں حالات حاضرہ پر بات چیت کرنا، کبھی کسی سیاستدان سے انٹرویو کرنے کے لیے مختلف زاویوں سے سوالات کرنا یہ سب عام معمول کی باتیں تھیں۔ کبھی شائبہ تک نہ پڑا کہ وہ اکیلی یا زین بھی اس کے ساتھ مل کر اسے دھوکا دے رہے تھے۔

اب اسے رفتہ رفتہ یاد آرہا تھا کہ وہ کیوں کبھی اس کے تھکے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی اسے گھورنے لگتے اور کبھی جب وہ ہلکے پھلکے زیور اور میک اپ کر کے ان کے ہمراہ باہر جانے کے لیے تیار ہوتی تو وہ زہر آلود لہجے میں کہتے تھے۔

"اوں ہوں تم پر کچھ بھی جچتا نہیں۔"

وہ کیسی بے وقوف تھی کہتی تھی۔

"ہاں! میں نے عرصے سے نہ فیشل کیا ہے نہ بلیچ ہی کیا ہے اور یہ فنکشن بھی تو اچانک نکل آیا۔"

آج سے دس بیس برس پہلے زین کسی اداکارہ، ماڈل یا پروڈیوسر سے شادی کر لیتے تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر اب...... بڑھاپے کی دہلیز پر ایسا کوئی اقدام کیا معنی رکھتا تھا...... اپنی بے عزتی اور ذلت کا احساس ستائے جا رہا تھا۔ وہ سنبھلنا چاہتی تھی تاکہ کوئی حتمی فیصلہ کر لے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ کیوں ہر بار میکے سے واپسی پر زین کا موڈ بگڑا ہوتا تھا۔ کیوں اس نے اس وقت مسئلہ کی توہ نہ لی۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی کہ مالی تنگ دستی کی وجہ سے گھریلو سکون برباد ہو رہا ہے۔ جب ہی تو اس نے بوتیک پر ملازمت کی تھی، لیکن وہ نہیں سمجھ پائی کہ کام کرنے کے بعد بھی گھر میں سکون اور خوشی کیوں نہ آسکی۔ زین کیا اس وقت سچ بول رہے تھے کہ میں الیکٹرانک میڈیا میں رہ کر بھی دیگر لوگوں کی طرح کا لائف اسٹائل نہیں رکھتا کیونکہ یہ سراسر عیاشی ہے۔ لیکن اس سیل فون میں آنے اور جانے والے میسجز کئی رازوں سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ زین نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ حبا کے ساتھ مطمئن اور خوش باش ازدواجی زندگی گزار سکیں، لیکن انہیں اظفر کا خیال ستا رہا تھا جبکہ حبا نے باور کرایا تھا کہ وہ اس بچے کو گھر سے نکالے گی نہیں، مگر یہ اس کی مرضی پر چھوڑا جائے کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے، اپنی ماں کے ساتھ یا اپنے والد کی نئی بیوی کے ساتھ؟

صبح ہوتے ہی علیشا نے حبا کے سیل پر کال ملائی۔ فون بند جا رہا تھا۔ پھر اپنی حماقت پر غصہ آگیا۔

"یہ کیا کیا میں نے؟ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے وہ کہاں جاگتی ہے۔ چلو مسڈ کال دیکھ کر کال بیک تو شاید کر ہی لے۔ میں نارمل رہوں گی۔ ابھی اس پر کچھ بھی واضح نہ کروں گی؟ میں زین کو بھلا نہیں سکوں گی۔ کم از کم اتنی جلدی...... وہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر نے کان اور ناک کے انفیکشن کا واحد حل سرجری بتایا ہے۔ مجھے اس موقع پر انہیں تنہا چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے۔"

عقل کی ننھی منی سی چڑیا دانش کے ایک باب کو کھولے سبق پڑھانے لگی۔ "انہوں نے کون سا تمہارا خیال کیا۔ تم سے محبت کے دعوے کیے، ساری زندگی ساتھ نبھانے کے وعدے کیے، مگر کیا انہوں نے ان کی پاسداری کی؟"

اندر چھڑی ہوئی جنگ کو جیتنا بہت کٹھن ہونے لگا۔

اس گھر کو بنانے سنوارنے کے جتن کرنے والی نیند کی آغوش میں ایک دیا جلا کر خوابوں سے بشارت لینے والی علیشا بری طرح نڈھال ہو گئی تھی۔ ایسا ہی ہوتا ہے بے بسی اور ذلت موت سے پہلے مار دیا کرتی ہے۔

نئے صوفے کا آڈر منسوخ کر کے، نئے برتنوں کی فہرست پھاڑ کے، گھر کے سودے سلف کی فہرست بھی پرزہ کر کے وہ خوب روئی مگر اس کے ہاتھ میں دبا فون ایک بار پھر جاگا۔ حبا کا ——— آیا تھا۔

"جان جی! علیشا کا فون ساڑھے آٹھ بجے آیا تھا۔ آپ کو بتا دوں اب میں کال بیک کروں یا نہیں؟ کیا بات کرنی ہے اس سے؟ ابھی کیا نہیں اتنی صبح۔ ری فلائٹ کینسل ہو گئی ہے۔ آج لاہور نہیں پہنچ پاؤں گی۔ آئندہ پروگرام کے لیے فوراً رابطہ کریں۔"

لیے روانہ ہو گئی۔

اب اس کے ایک اور سوال کا جواب مل گیا تھا۔

راستے میں اظفر کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"بیٹا! پاپا کو لاہور میں کچھ زیادہ مصروفیت ہو گئی ہے، اس لیے ہم دو روز کے لیے نانی جان کے ہاں ہو آتے ہیں۔ میں وہیں سے اسکول لے جاؤں گی۔ پاپا کو کچھ وقت چاہیے اپنے لیے اور مجھے بھی آپ کے لیے کچھ وقت چاہیے، اس لیے ہمارا الگ الگ رہنا ضروری ہے۔"

پتا نہیں اظفر کو یہ فلسفہ سمجھ میں آیا یا نہیں، مگر وہ اس خیال سے خوش تھا کہ اس کے ماموں کے پاس لیپ ٹاپ ہے، دو گاڑیاں، ہر کمرے میں اے سی، کشادہ اور وسیع رقبے پر پھیلا ہوا لان اور زندگی کی ہر سہولت مہیا ہو گی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ابتدا میں تو بچے انہی سہاروں سے بہل جاتے ہیں، مگر عمر کے ساتھ ساتھ شخصیت میں رہ جانے والے خلا کو مادی سہولیات کیسے پر کر سکتی ہیں؟

چند دن بعد زین سمجھ گئے کہ علیشا نے سیل فون سے نفرت کا اسرار منکشف کر لیا ہے، اسی لیے وہ گھر چھوڑ گئی ہے۔

* * *

کئی برس بیت گئے ہیں۔ علیشا اب بھی کام کر رہی ہے۔ اظفر کالج جانے لگا ہے۔ زین اسے پکار پکار کے تھک سے گئے ہیں مگر علیشا اپنی جنگ کو زیادہ شدید سمجھتی ہے۔ چراغوں کو ہوا کے رخ پر رکھ کر جلا رہنے کی ضد کر رہی ہے۔

وہ کہتی ہے اس کا اعتبار، یقین اور بھروسا، سبھی کچھ ہوا برد ہو گیا ہے۔ وہ نفس کی ہوسناکیوں، ذہنی بیماریوں اور مکاریوں کو برہنہ آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔ اعتبار کا موسم کھو جائے تو انسانوں سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اب وہ ایک روبوٹ ہے جس میں جذبات نہیں ہوتے۔ جب تک موت اسے پرواز کا پروانہ نہ دے گی، وہ اسی طرح زندگی کے چھوٹے بڑے کام کرتی رہے گی۔

حبا نے زین سے شادی نہیں کی۔ وہ دراصل کیا چاہتی تھی؟ اس کا اور زین کا رشتہ صرف ضرورت کا تھا یا عشق کا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا جبکہ زین نے کہا ہے کہ وہ کتھارسس چاہتے تھے؟

علیشا سوچتی ہے کہ زندگی کے نصاب میں دکھ کو اختیاری مضمون کیوں بنا لیا جائے؟

آخر دنیا کو یہ اختیار بھی کیوں دیا جائے کہ کوئی اٹھے اور ہمیں کم نگہی کی دھند میں جب چاہے گم کر دے۔

علیشا چاہ اور موہ کے پھندے کی گرہ میں الجھی ضرور ہے مگر تھکی اور مری نہیں ہے، یہ بتانے کے لیے وہ آج بھی بہتر کل کے لیے جنگ کر رہی ہے۔ یہی جیت کا خواب اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ سمجھ گئی ہے کہ "زندگی کوئی افسانہ نہیں ہوتی مگر کبھی کبھی کوئی افسانوی کردار زندگی کو دربدر بھی کر سکتا ہے، خوابوں کو روند سکتا ہے۔ یوں زندگی افسانہ بن بھی سکتی ہے۔"

سمیرا حمید

دو کوڑی کی

اس نے اپنے قریب سرسراہٹ سنی، بے آواز آواز سنی، یہ وہی آواز تھی جو واقع ہونے سے پہلے دل کی نیت پر سن لی جاتی ہے، جو صرف زہرہ سنا کرتی تھی یہ آواز اسے گہری نیند سے بھی جگا دیا کرتی تھی، یہ ٹن ٹن کی آواز تھی جو شیطان، ہتھوڑے کی طرح برسائے چلا جاتا ہے۔

ٹن ٹن۔ اٹھو۔ ٹن ٹن۔ دیکھو میدان صاف ہے، پیش قدمی کرو۔ شیطان جو ذہن و دل میں ہزاروں لطف جگا کر ترغیب کا راستہ صاف کرتا ہے۔ جو ایسی آگ جلاتا ہے جسے سمندر بھی ٹھنڈا نہیں کر سکتے۔

زہرہ نے کامران کے دل کی یہی "ٹن ٹن" سن لی تھی۔ وہ لمحے گننے لگی۔ اسے معلوم تھا، وہ ابھی اٹھے گا اور وہ پھر ایسے ہی اٹھا جیسے اٹھتا آیا تھا... نڈر، لیکن ڈرا ہوا۔ بے خوف — لیکن سہما ہوا۔

اس کے قریب سے گزر کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ زہرہ پہلو کے بل ویسی ہی لیٹی رہی جیسے وہ پہلے لیٹی تھی اور اسے سوتا سمجھ کر کامران آرام سے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اسے اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں تھی... وہ آنکھیں بند کیے بھی جان سکتی تھی کہ کامران ایک بار ضرور پیچھے پلٹ کر دیکھے گا۔ اس کی چال بے آواز ہوگی۔ اپنے پیچھے وہ گھر کا مین گیٹ باہر سے لاک کرے گا اور پھر ایک گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کے مین گیٹ کو اندر سے... اس کے پاس دونوں گھروں کی چابیاں ہیں۔ وہ دونوں گھروں کا رکھوالا ہے۔

رات کی ایک خوبی ہے کہ یہ بے شمار عیب چھپالیتی ہے، جیسے ہر رات کامران کے چہرے کے تاثرات چھپالیتی ہے جب وہ اپنے گھر سے نکلتا ہے اور تیسرے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔

زہرہ اس کے قدم گن سکتی تھی۔ اب وہ لاؤنج سے ہوتا ہوا سیڑھیوں سے اوپر جا رہا ہوگا۔ سیڑھیوں کے ساتھ والے بچوں کے کمرے کو وہ باہر سے لاک کر دے گا اور پھر۔

آہٹیں، آوازیں بن جائیں گی اور نگاہیں، سرگوشیاں۔

زہرہ بیڈ پر چت لیٹی اندھیرے میں گھور رہی تھی۔ اب وہ فجر کے وقت ہی آئے گا... یا ناشتے کے بعد۔ "تایا ابو! آپ کب آئے؟" کامل، شمائل "تایا ابو" کو صوفے پر آڑا ترچھا دیکھ کر چہکنے لگیں گے۔ "بابا! تایا ابو سے کہیں ناں ناشتہ ہمارے ساتھ کر کے جائیں۔"

اور وہ اپنے گیلے بال لیے ایسے اٹھلائے گی جیسے وہ مورنی ہو اور اس کے پروں میں ایک اور پر کا اضافہ ہو گیا ہو۔ کچن کے دروازے کے پاس رکھے اپنے "را" طوطے کو وہ بلاوجہ بار بار بہلائے گی۔

زہرہ نے اپنی چھلکتی آنکھوں کو سختی سے بند کیا اور آستینیں اوپر کرتی واش روم میں چلی آئی۔ ڈگمگاتے قدموں سے وہ بہ مشکل کھڑی ہو پائی اور پھر پلٹ کر لائٹ آن کی۔ وہ اندھیرے میں وضو کر سکتی تھی لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی لائٹ وہ خود کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کو وہ جتنا پھیلا سکتی تھی، اس نے پھیلا کر ان میں چھپے سیلاب کو دیکھا۔ وہ خود کو

آئینے میں دیکھ کر خود پر ترس کھانا چاہتی تھی شاید..... اپنے چہرے پر کئی بار ہاتھ پھیرنے کے بعد اس نے الٹی ہتھیلیوں سے آنسو صاف کیے اور ایک بار پھر خود کو آئینے میں گھورنے لگی۔

وہ قیام میں تھی۔ رکوع میں تھی۔ سجدے میں تھی، لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اس کی نظروں میں وہ ہی چہرے تھے۔

☼ ☼ ☼

اکثر وہ اپنے طوطے کو لیے آجاتی، انداز وہی جیسے کوئی ساون کی پہلی پھوار میں بھیگتا اٹھلایا اور بل کھایا چلا جاتا ہے۔

"بھابھی! میرے طوطے کو آج کے لیے رکھ لیں، مگر خیال رکھیے گا بلی کی تو آہٹ سے بھی سہم جاتا ہے۔ چہلیں کرنا بھول جاتا ہے۔ خوف سے آنکھیں دونوں نہیں کھلتیں، الوؤں کی طرح شکل لٹک جاتی ہے۔ آپ کے گھر تو بلیاں بھی بہت آتی ہیں۔ ہر ایک کو تو دودھ ڈالنے بیٹھ جاتی ہیں۔"

"لوگ تو باجی کا خون پی جاتے ہیں۔ یہ اف نہیں کرتیں۔" وائپر لگاتے لگاتے بھی رضیہ جواب دینے سے نہ چوکی۔

زہرہ بدستور پودوں کو پانی دیتی رہی، پانی گملوں سے بھر کر باہر نکل رہا تھا۔ پر وہ پھر بھی دیے جا رہی تھی۔ نساء کی آواز سن کر وہ ایسے ہی بے ربط ہو جاتی تھی۔ آگے، پیچھے، دائیں، بائیں بکھر جانے کے لیے تیار۔

"میں بھائی صاحب کو دیکھوں تیار ہوئے کہ نہیں۔ اکثر دیر کرتے ہیں تیار ہونے میں۔" وہ اپنی جھنکار جیسی آواز میں بولتی ہوئی اندر چلی گئی۔

دور تک رضیہ نے اس کی پشت کو دیکھا۔ پودوں کو پانی دے کر زہرہ نے تسبیح پکڑ لی۔

"باجی! نمازیں، وظیفے ہی کرتی رہیں گی یا زبان سے بھی کچھ بولیں گی؟ زیادہ نہیں تو زاہد بھائی کو ہی فون کر کے کہہ دیں کہ اس بلا کو واپس بلا لیں۔ اچھی بھلی تھی وہاں میاں کے پاس، نہ جانے کیوں بھیج دیا یہاں۔ میاں کا بھی نہ معلوم کتنا ناک میں دم کر رکھا ہو گا۔ کیا کیا نہ دیکھا ہو گا انہوں نے، کیا کیا نہ چھپاتے ہوں گے۔ اب دیکھ لیں بھائی صاحب کو پوچھنے گئی ہیں یا انہیں تیار ہی کرنے بیٹھ گئی ہیں۔ پانچ وقت اذان کو بجتی ہے، پر کیا مجال جو ان کے دلوں کا شیطان بھاگ جائے۔"

زہرہ تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ وہ تسبیح کے دانے نہیں، وقت کے لمحے گن رہی تھی۔ وہ ایک ایک لمحے کے لیے صبر کر رہی تھی۔ کتنی دیر ہو گئی تھی نساء کو اندر گئے۔

آج اسے اپنے میکے کے کسی فنکشن میں جانا تھا، اسی لیے وہ پہلے بھائی صاحب کو تیار کروانے آئی تھی۔ وہ انہیں کپڑے، جوتے اور وقت بتا کر جلدی آنے کا کہے گی..... پھر وہ الماری کھولے بھائی صاحب سے ان کی پسند کا لباس پوچھے گی۔ بھائی صاحب اس کی نظروں کے زاویوں کو پڑھتے ہوئے، کپڑوں کو ادھر ادھر کریں گے باہر نکال کر جانچیں گے، لگا کر دیکھیں گے..... پھر بھائی صاحب اسے لے کر جائیں گے..... رات دیر ہو جانے کی وجہ سے انہیں مجبوراً وہیں سونا پڑے گا۔ پھر صبح بچے انہیں لاؤنج میں دیکھیں گے اور چلا چلا کر تایا ابو، تایا ابو کہتے ہوئے ان کے اوپر نیچے لوٹ پوٹ ہونے لگیں گے۔

زہرہ وہیں تخت پر بیٹھی پھیکی سی پڑ گئی۔ اسے اپنی کمر پر چبھن ہونے لگی۔ کمر پر اس کے لمبے بالوں کی اجڑی ہوئی چوٹی تھی، جنہیں پہلے پہل وہ سہلا سہلا کر باندھا کرتی تھی۔ گھنٹوں مساج کیا کرتی تھی۔ لمبی چوٹی کو کمر پر لہراتے ہوئے اسے ہر بار یہ احساس ہوتا کہ ان بالوں سے کسی کو کتنی چاہت ہے، دوپٹہ پہلے پہل تو گردن کے نیچے تک ہی پھیلا رہتا، پھر وہ مستقل سر پر ٹھہر گیا..... کیونکہ اس کے لمبے بالوں نے لہرانا چھوڑ دیا تھا..... ایسے ہی جیسے اس کے گھر کے پھول، پودوں نے۔ ان میں سے تو خوشبو آنا بھی بند ہو گئی تھی۔ وہ جو کمرے کی کھڑکی سے پودوں کی پھولوں کی آیا کرتی تھی۔

بو ہر سو گھر میں پھیلی رہتی تھی۔ وہ خوشبو آنا بند ہو گئی۔ اسے کوئی اور ہی خوشبو آنے لگی تھی اب..... کہتے ہیں گناہ کی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے..... یہ وجہ نہیں دیتی۔

بتا دیتی ہے..... جیسے سڑا ہوا مردہ گوشت۔

زہرہ کی روح اس بو کو سونگھ کر جھلسنے لگی تھی۔ وہ اپنے ابتلائے حال میں بھاگی پھرتی تھی، کبھی حاجت کے لیے اور کبھی توبہ کے لیے.....

☼ ☼ ☼

گھر کے ساتھ والا پلاٹ کسی اور کا تھا لیکن اس کے ساتھ والا پلاٹ کامران نے زاہد کو اس کے کہنے پر لے دیا۔ تین سال پہلے "نساء" یہاں آئی تھی کامل اور شامل کے ساتھ، "بھائی صاحب، بھائی صاحب" کرتی۔ گھر کے بڑے دروازے سے لے کر اپنے کمرے تک وہ بالوں کی لٹوں کو جھلاتی بھائی صاحب کو بتاتی جاتی کہ اسے کس جگہ کیا چاہیے، کہاں الماری بنے گی، کہاں صوفہ رکھنا ہے، کہاں اسے قالین چاہیے اور کہاں دروازے۔

عورتوں کے کیا ڈھب ہوتے ہیں، زہرہ نہیں جانتی تھی۔ وہ ایک عورت کو جانتی تھی، جو کامران کی بیوی اور ایک بیٹا اور بیٹی کی ماں ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ عورت نساء جیسی بھی ہوتی ہے۔ وہ تو جانتی تھی کہ زہرہ "کامران کی بیوی اور نساء" زاہد کی بیوی..... تو نساء اور کامران کون۔ وہ جانتی تھی۔ یا شاید نہیں۔

"بہت چاہ، بہت لگاؤ ہے آپ دونوں میں۔ ایسے لگتا ہے، ابھی بیاہ کر لائے ہیں زاہد بھائی آپ کو۔"

نساء کے آنے کے سال بھر بعد دو ہفتوں کے لیے زاہد آیا تھا اور رضیہ ان دونوں کے لگاؤ پر حیران ہوا کرتی تھی۔

"زہرہ باجی! یہ عورت آپ کے وارے کی نہیں۔ یاد رکھیے گا! آسمان سے تارے مرد ایسی ہی عورتوں کے لیے توڑ لانے کو تیار رہتے ہیں۔ یہ سب کو خوش رکھنا جانتی ہیں دو لفظ نہیں سنیں گے زاہد بھائی اس کے خلاف..... آنکھوں بھی دیکھ لیا تو یہ کچھ نہ کچھ عجوبہ ہی بنا دے گی، پکڑ نہیں دے گی اپنی۔"

زہرہ کو لگتا تھا اس کا دم گھٹ جائے گا۔ وہ کچن میں، کمروں میں، اندر باہر ان کی سرگوشیاں سنتی اور پھر بھی اسے لگتا اسے واہموں نے گھیر لیا ہے، بات وہ نہیں..... آنکھوں دیکھا یا کانوں سنا، شک ہے، وہم یا پھر یقین..... اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ کس کروٹ یقین کرے۔

"میں آتا ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں۔"

راتوں کو اکثر نساء کے فون آتے..... زاہد کے رہنے تک کچھ سکون تھا لیکن پھر.....

"کہہ رہی ہے، ڈر لگ رہا ہے۔ شاید گھر میں کوئی آیا ہے۔ دیوار پھلانگنے کی آواز سنی ہے۔ تم سو جانا آرام سے، دیکھ بھال کر میں لاؤنج میں سو جاؤں گا۔" یہ شروع شروع کے خوف تھے۔ پہلے پہل نساء کے خوف سے زہرہ بھی ڈر جاتی۔ زاہد فون کرتا، شرمندہ ہوتا۔

"بھابھی! بھائی جان سے کہیں ایک بار دیکھ آئیں۔

نساء سے کہا تو ہے' آپ کے پاس آجائے' اگر زیادہ ڈر لگ رہا ہے تو' لیکن سنتی ہی نہیں ہے۔"

زہرہ فوراً" کامران کو اٹھا کر بھیجتی' خود فون کرتی' تسلی دیتی۔ اکیلے ڈرتی ہے تو ہے۔ باہر والوں کے لیے پاکستان میں رہنا ہی باعث خوف ہے۔

"ارے بھابھی! آپ بھی تو عورت ہی ہیں... کہتے ہیں بھابھی کو اپنے پاس سلا لیا کریں۔ آپ میرے پاس آئیں یا میں آپ کے پاس' اب گھر میں جو مرد کا جلال ہے' وہ تو مرد کا ہی ہے نا۔"

جب میکے سے بھائی آکر رہنے لگے تو یکدم اس کا خوف غائب ہو گیا۔

"اپنے گھر میں کیا ڈرنا... وہ تو شروع شروع کے دن تھے۔ نئی جگہ' نیا گھر اور پھر یہ ٹی وی والے' آئے دن کی نت نئی خبریں' زاہد نے تو سارے خاندان کو پریشان کر رکھا ہے۔ اور بھائی صاحب ہیں نا' یہ ساتھ والا گھر ہی تو ہے۔ ایک ہی تو گھر ہے۔ جب چاہے بلا لو۔"

پھر بھی کبھی چھوٹا بھائی چلا آتا تو کبھی بڑا' کبھی بہن تو کبھی ماں۔

"ہر کوئی چلا آتا ہے یہ کہہ کر کہ نساء اکیلی ہے' ارے بھئی کس نے کہا میں اکیلی ہوں' عاجز آگئی ہوں میں ان مہمان نوازیوں سے' بھائی صاحب آپ زاہد سے کہیں' منع کیا کریں میرے خاندان والوں کو فون۔ اکیلی' اکیلی' میں کہاں کی اکیلی' آپ ہیں نا۔"

زہرہ بچوں کو قرآن پاک کا سبق دے رہی تھی اور رضیہ سبزی بنا رہی تھی' بھائی صاحب شاید اخبار پڑھنا چاہ رہے تھے اور نساء...

"باجی! آپ پہلی عورت ہیں جو میکے والوں کی مہمان نوازیوں سے تنگ ہیں۔" رضیہ خود کو روک نہ سکی۔ وہ صبح سے شام تک زہرہ کے ساتھ رہتی تھی۔ کام والی نہیں' گھر کا فرد ہی لگتی تھی۔

نساء نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ سنتی اپنے مطلب کا تھی یا صرف بولتی تھی... یا اپنی چمکتی' دمکتی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔

"ھ... پیش و...؟" کامل اس سے سبق پوچھ رہا تھا۔

سدرہ سپارہ گود میں رکھے اپنے ناخن چبا رہی تھی اور وہ ان پانچ چھ بچوں میں بیٹھی اخبار کے پیچھے ہونے والے واقعہ کو دیکھ رہی تھی۔

"تائی امی...! ھ' پیش۔ و؟ تائی امی...!" کامل مسلسل پوچھ رہا تھا۔

وہ اخبار کا صفحہ پکڑے بھائی صاحب کے ساتھ کوئی خبر پڑھ رہی تھی۔ دونوں ایک ہی خبر پڑھ رہے تھے۔ دونوں کا ہاتھ ایک ہی خبر پر تھا۔

"دھو۔" رضیہ نے زہرہ کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد خود ہی بتا دیا۔ زہرہ کی تسبیح ہلنا بند ہو گئی تھی... وہ اپنا ورد بھول گئی۔ اسے ان دونوں کے پیچھے دیوار پر سائے لرزتے دکھائی دیے۔ ان سایوں کو دیکھتے ہی وہ کھو کھلی سی ہو گئی۔ راکھ اور کوڑے کا ڈھیر بن گئی...

جبکہ اس کے بال لمبے تھے' نساء کے چھوٹے تھے۔

اس کا قد دراز تھا' نساء کا چھوٹا تھا۔

اس کا رنگ دودھیا تھا' نساء کا گندمی تھا۔

اس کی آنکھیں بھوری تھیں' نساء کی کالی تھیں۔

اسے لوگ خوبصورت کہتے تھے اور نساء کو قبول صورت۔

پھر؟

کتنی ہی بار اس نے خود کو جانچا تھا۔ شروع کے دنوں میں وہ یہی کام کیا کرتی تھی۔ شیشے کے سامنے کھڑی آنکھیں پھیلا پھیلا کر خود کو دیکھا کرتی۔ کبھی بالوں کو آگے رکھتی' کبھی پیچھے' کبھی پشت دیکھتی' کبھی رخ لیا ہے' جو دل میں سما جاتا ہے۔

صورت...؟ تو وہ تو اس کے پاس تھی۔

اسے تو نساء کی صورت بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ اسے تو یہ بھی بہت اچھا لگتا تھا کہ وہ اس کے گھر کے قریب آگئی ہے۔ اسے اچھا لگتا تھا نساء سے باتیں کرنا' اس کے ساتھ بازار جانا۔ بازار جاتے ہی وہ چھا جاتی تھی۔ دنوں میں ہر دکان' ہر دکان کے خواص اسے ازبر ہو چکے تھے۔ بلکہ بازار کی کہیں بہت اندر اور کہیں بہت دور نکڑ کی بہت سی دکانیں اسی نے دریافت کیں'

اتوار بازار کے رش میں بھی وہ اس تمکنت سے چلتی کہ اسے دیکھ کر لوگ راستہ صاف کرنے لگتے۔ وہ ہر دکان میں ایسے جاتی جیسے اس دکان کا افتتاح کرنے آئی ہو اور وہ توقع بھی یہی کرتی کہ اس کا استقبال ایسے ہی کیا جائے اور کیا جاتا بھی تھا... وہ نساء تھی زہرہ نہیں۔ وہ کپڑوں کے ڈیزائن دیکھتی یا برتنوں کے' اس کا ہر انداز خاص ہوتا' وہ جس دکان سے ایک بار چیز خریدتی اس دکان پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتی وہ ان ہزاروں خریداروں میں سے نہیں تھی' جو آتے جاتے ہیں... وہ ان میں سے تھی جو سالوں بعد بھی آتے ہیں تو پہچان لیے جاتے ہیں۔

"آج چکن کڑاہی اور تندوری روٹی' وہ بھی خمیری... مزے آئے گا رات کے کھانے میں۔"

کھانا وہ کچھ بھی پکاتی' ہاں! اس کا اہتمام اور ذکر اس انداز سے کرتی جیسے کسی دعوت عظیم کا کیا جاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے مزا کشید کرتی' ہر چیز کو خاص بناتی یا کوشش ضرور کرتی۔

"ارے... میں تو۔ بس کھانا ہی..." کامران فون رکھ کر اس کی طرف پلٹے۔

"نساء کہہ رہی ہے' کچھ خاص پکایا ہے آج۔ جا کر دیکھیں تو سہی... تم کھلاؤ بچوں کو۔ میں آتا ہوں ابھی۔"

ہاتھ میں چاہے نوالہ پکڑا ہوتا' نساء کا فون آتے ہی کامران نوالہ چھوڑ کر فوراً" چل پڑتے' ساتھ ساتھ ایسے مسکراتے جاتے جیسے کسی کی دلکش ادا پر مسکرایا جاتا ہے۔

رضیہ بھی بہت قدردان رہی تھی نساء کی' اس کی چال کی' اس کے انداز کی' اس کے رکھ رکھاؤ کی۔

"یہ بڑے بڑے گلاس بھر بھر دودھ' جوس' شیک دیتی ہیں اور اتنے نئے نئے کپڑے' جوتے دے دیے ہیں۔ جس چیز پر ہاتھ رکھوں' قسم سے ہاتھ میں پکڑا دیتی ہیں۔"

ظاہر ہے' نساء سب کو خوش رکھنا جانتی تھی۔ وہ گھر سے لے کر حد نظر تک سب کو اپنا گرویدہ رکھتی۔ وہ ہر چھوٹے' بڑے' بوڑھے' جوان' لڑکی' عورت' مرد اور بچوں پر فدا رہتی۔ کیا انسان کیا جانور' وہ انہیں پالتو بنانے کا ہنر جانتی تھی۔ وہ تھکتی ہی نہیں تھی' اسے ہر شخص خود میں مبتلا چاہیے تھا۔ اسے ہر شخص درکار تھا' کیا مالک' کیا نوکر... وہ دنوں نہیں' لمحوں میں قربت پیدا کر لیتی۔

"بہت حسرت تھی ان عورتوں کو دیکھنے کی جو تخت و تاج تہ و بالا کروایا کرتی تھیں۔ جنہیں اشاروں کے ناچ پسند تھے... پوری ہو گئی وہ حسرت بھی۔"

رضیہ آئے دن نساء کی شان بڑھاتی رہتی۔

نساء کے لیے بھی رضیہ بھی "رضیہ چندا" تھی۔

"رضیہ بے شک بہت اچھا کام کرتی ہے' لیکن یہ کیا ادھر ادھر کی بات کرنی۔ کل اس نے مجھے بتایا کہ آپ میں اور بھائی صاحب میں لڑائی ہوئی ہے۔ یہ کام ٹھیک نہیں' ہم دونوں گھروں کے لیے کہ ہم ایک دوسرے کی بات کسی تیسرے سے سنیں۔ میں نے اپنے لیے کام والی کا انتظام کر لیا ہے۔" نساء نرمی سے کہہ کر خاموش ہو گئی اور رضیہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے صرف ایک دن پہلے نساء کو طنزاً" جتایا تھا کہ پہلی بار بھائی جان اور زہرہ باجی میں لڑائی ہوئی ہے۔ اس کے طنز کو نساء نے بہت اچھے سے استعمال کیا تھا۔ اس لڑائی کی وجہ بھی رضیہ ہی بنی تھی۔ وہ چپکے چپکے زہرہ کو نساء کے گھر کا حال سنایا کرتی۔ شام کو کب بھائی صاحب آئے' کب ان کا فون آیا۔ کچن میں' بیڈ روم میں' باہر ٹیرس پر' وہ چپکے چپکے ان کی نگرانی کرنے لگی' نساء کو غصہ تھا کہ اتنا کھا کر بھی رضیہ اس کی نہ بنی' مجال ہے جو اس نے ذرا بھی غصہ ظاہر کیا ہو' خود کو سادگی سے سارے قصے سے برے کر لیا۔ ویسے تو اس کا جب دل چاہتا' اپنی سادگی کی آرائش کر لیتی' اپنی مرضی کے رنگ اوڑھتی تھی وہ... رضیہ سے بات کرتے ہوئے' بھابھی کے لیے' بچوں کے لیے' اپنے پیارے طوطے کے لیے' زاہد سے فون پر بات کرنے کے لیے اور بھائی صاحب کے لیے' چہرہ نت نئے انداز اور رنگوں سے سجا رہتا' شاید وہ ایک مورت ہے۔

اور کیا کسی مورت کی پوجا کا حق ایک ہی پجاری کو ہے۔

یقیناً "نہیں ہے۔

ساعت حشر کی اذیت تک
اور کتنی اذیتیں ہوں گی
اس قیامت سے پیشتر یا رب
اور کتنی قیامتیں ہوں گی

✻ ✻ ✻

پھر بہت سی راتوں ——— کی طرح اک بار پھر ویسے ہی کامران اس کے قریب سے گزرنے لگا۔ قریب آتے ہی زہرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کامران کے لیے یہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ ڈر گیا۔

"کیسے انسان ہو تم؟"

زہرہ اٹھ کر سامنے آ کھڑی ہوئی، لیکن وہ ایسے کھڑی تھی جیسے رو رو کر قدموں میں گر جائے گی۔

"میں تمہارے لیے توبہ کے نفل پڑھتے پڑھتے تھک چکی ہوں اور تم ہو کہ تھکتے ہی نہیں۔ کیوں حلال چھوڑ کر حرام کی آگ میں جل رہے ہو؟" کامران نے اندھیرے میں اسے گھور کر دیکھا شاید وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ زہرہ ہی ہے یا اس کا وہم۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ چھوڑو میرا ہاتھ... پتا نہیں کیا الٹا سیدھا بولے جا رہی ہو... آئے دن کا تمہارا یہی مسئلہ ہے۔"

"میں تمہیں وہ الٹا سیدھا سنا رہی ہوں جو تمہیں نظر نہیں آ رہا۔ تمہیں وہ شیطان نظر نہیں آتا جو تمہارے قدموں کے نشان چومتا ہے۔ اسے ایسا کرتے میں نے دیکھا ہے۔ جو تمہارے ساتھ جھومتا ہے اور تنہائی کی سیاہی میں رقص کرتا ہے۔ تمہیں اپنے قدموں سے لپٹی آگ نظر نہیں آتی یا..."

"لمبی عبادتوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تم خود کو ولی سمجھنے لگی ہو۔" اس نے تمسخر اڑایا۔ "اپنے اس خالی دماغ میں کوئی اور بھس بھر دیا سو جاؤ۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے، وہ کون ہے؟ وہ زاہد کی بیوی ہے۔ تمہاری بیوی میں ہوں۔" زہرہ نے جیسے سرگوشی کی۔

کامران نے گھور کر اسے دیکھا۔ شاید اس نے سنا نہیں تھا۔

"ہونہہ! پرے ہٹو... اپنی یہ اول فول باتیں کسی اور کو سناؤ، رات دن تم انہی باتوں کو سوچ سوچ کر خبطی ہو گئی ہو اور مجھے بھی کر دو گی۔"

وہ کمرے سے نکل گیا، ہمیشہ کی طرح۔

زہرہ کی سانس پھر گھٹنے لگی، اس کا وجود دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ کامران اس کا شوہر تھا، اس سے محبت کرتا تھا۔ کبھی اس پر خواب میں بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ سب "کبھی" تھا۔

پتا نہیں انسان کے نفس کے وہ کون سے سوراخ ہیں جو کبھی بند نہیں ہوتے۔ وقت اور موقع ملتے ہی ان میں سے "پیپ" کیوں رسنے لگتی ہے۔

وہ جس کے بارے میں کہتے ہیں دوزخیوں کا مشروب ہو گا۔ اسی رستے ہوئے محلول کو ہی شاید فرشتے جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور پھر کہیں گے... لے پی یہ تیرے ہی گناہ سے جمع کیا گیا ہے۔

✻ ✻ ✻

اس کے لیے وہی وحشت بھرے دن تھے اور اذیت بھری راتیں نہیں۔ وہ دن رات کے اس کھیل سے اتنی تکلیف میں تھی کہ اکثر دیواروں سے سر ٹکراتی رہتی... اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کامران کے لیے آنسو بہائے یا اپنی بدقسمتی پر... آنکھیں چھلک چھلک جاتیں۔

"بچے اب سمجھ دار ہو رہے ہیں، ہمارے بھی اور نساء کے بھی۔ کم از کم اتنے تو وہ سمجھ دار ہیں کہ اکثر واقعے لفظ بہ لفظ سنانے لگتے ہیں۔"

شام کی چائے پیتے ہوئے کامران کے ہاتھ ذرا دیر کو رکے... اس نے تیز نظروں سے زہرہ کو دیکھا، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ طنز تھا یا تنبیہہ پھر حسب عادت جیسے اس نے سنا ہی نہیں، رکے ہاتھ اور چلتے چہرے کو بحال کر کے وہ پھر سے مگن ہو گیا۔

وہی نساء والا انداز... نہ لفظوں کی کہانی بناتے ہیں، نہ چہرے کی تحریریں پڑھتے ہیں۔ اپنے چہرے پر نت نئے رنگ سجاتے ہیں اور دوسروں کے چہروں سے خون نچوڑ لیتے ہیں... نہ سنتے ہیں، نہ بولنے دیتے ہیں۔

کامل اور شامل کتنی بار کمرے کے دروازے کا رونا رو چکے تھے... کتنی ہی بار وہ بند کمرے کی کہانی سناتے تھے۔

"بادل اتنے زور سے گرجے تھے کہ میں رونے لگا۔ میں نے شامل کو بھی اٹھایا لیکن یہ اٹھا ہی نہیں۔ ماما کو آوازیں دیں۔ دروازہ بھی نہیں کھل رہا تھا... اتنا زور لگایا میں نے۔ پتا نہیں اکثر دروازے کو کیا ہو جاتا ہے۔ ماما کہتی ہیں، مجھے کھولنا نہیں آتا ٹھیک سے۔ آپ بتائیں تائی امی! کیا میں دروازہ بھی نہیں کھول سکتا؟ اتنا زور لگاتا ہوں۔ اتنا بڑا ہو گیا ہوں میں اب۔"

"اکثر دروازے نہیں کھلتے بیٹا! تم تو بچے ہو۔ مجھ سے بھی نہیں کھلتے۔" زہرہ اداس ہو جاتی۔

وہ اداس بھی رہتی اور چپ بھی۔ اسے مستقل روگ نے جکڑ لیا تھا۔ یا وہ نفل پہ نفل پڑھتی یا گھنٹوں بیٹھی تسبیح کے دانے پر دانے گرائے جاتی۔ اس کی عبادت کا وہی حال ہو گیا تھا کہ کبھی رکوع نہیں کیا اور کبھی سجدہ، کبھی تین سجدے کر لیے اور کبھی ایک ہی... کبھی وہ بیڈ روم کا دروازہ کھولے لمبے لمبے ورد کیا کرتی اور دائیں طرف ایک گھر چھوڑ کر نساء کے گھر کی طرف منہ کر کے پھونکیں مارا کرتی۔ اسے لگتا تھا، یہ پھونکیں "نہیں صراط مستقیم" پر لے آئیں گی۔

اکثر وہ اتنی لمبی ٹکٹکی باندھ نساء کے گھر کی طرف دیکھتی رہتی کہ اسے گمان ہونے لگتا کہ گھر نے چلنا شروع کر دیا ہے۔ یا گھر زلزلے کی زد پر ہے یا گھر زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اسے گھر سے بلائیں نکلتی نظر آتیں۔ اس وقت اسے یقین ہونے لگتا کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔

"ننگے پاؤں آدھی رات کو اندھیرے میں ادھر ادھر گھورنا یہ کن کے کام ہیں؟ پاگلوں کے ہیں نا۔"

کامران بھی اسے یہی سمجھتا تھا۔

"خبطی... جو آئے دن وہموں کا شکار رہتی ہے۔"

ہر وقت کی تکرار۔ سوال جواب۔

یہ کامران کا خیال تھا۔ اور اس کا یہ خیال کون بدل سکتا تھا بھلا... اور کون اسے سمجھاتا کہ اگر وہ اتنی صابر اور نیک نہ ہوتی تو ہر وقت در و دیوار سے آگ برستی۔ دو بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔ نساء کبھی اس کے گھر نہ آ سکتی۔ خاندان والے اس کے ارد گرد ہوتے اور وہ نساء کے لیے عدالت لگواتی... لیکن کامران اتنا سمجھ دار ہی کہاں تھا جو یہ سمجھتا کہ زہرہ صرف اتنا ہی چاہتی ہے کہ وہ اپنے نفس کی اصلاح کر لے۔

زاہد، نساء کو یا کامران کو بتا رہا ہو تو الگ بات تھی پر جب وہ آیا تو زہرہ کو معلوم ہوا کہ وہ وہاں سات آٹھ ماہ سے بیمار تھا۔ شوگر کا مریض تو وہ تھا ہی اور اس کے ساتھ کیا کیا چلتا رہا، اسے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کندھے بوڑھوں کی طرح جھک گئے تھے۔ جسم کے ہر عضو سے بیماریاں جھلک رہی تھیں۔ زاہد کے آنے سے اسے سکون ملا تھا، مگر اسے دیکھتے ہی زہرہ مردہ سی ہو گئی۔

پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر زہرہ کو اندر ہی اندر ابہام سا ہونے لگا... شاید ایسے پل کے لیے جس کی طلب نہ ہو۔

رات کے انہی پہروں میں سے ایک پہر تھا جن میں زہرہ اٹھ کر نساء کے گھر کی طرف منہ کر کے پھونکیں مارا کرتی تھی۔

زہرہ جاگ رہی تھی۔

کامران بھی جاگ رہا تھا۔ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے وہ اپنے دفتر کی کوئی فائل پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ سوگوار زیادہ ہے یا صابر۔ اسے زاہد کی موت کا دکھ زیادہ ہے یا اس میں ضبط زیادہ ہے۔

"نساء کی عدت ختم ہو جائے گی کچھ دنوں میں۔"

آج سے پہلے کبھی زہرہ نے اتنی مستحکم آواز اور لہجے

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

میں بات نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے عجلت عیاں تھی، پر وہ سہمی ہوئی بالکل نہیں تھی۔

"ہوں۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

"وہ کچھ دنوں کے لیے میکے جائے گی پھر واپس آجائے گی۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کامران کچھ تو ظاہر کرے۔

لیکن کامران کیا سوچتا ہے اس کا چہرہ کبھی نہیں ظاہر کرتا تھا۔ وہ ویسے ہی بت بنا بیٹھا رہا جیسے جانتا ہی نہیں کہ وہ کس کی اور کیا بات کر رہی ہے۔

"اس کے والدین اسے لے کر چلے جائیں گے۔ ابھی وہ یہیں موجود ہیں۔ عدت ختم ہونے سے پہلے ہی آپ ان سے بات کر لیں۔"

"کیا بات؟"

"نساء سے نکاح کی۔"

کامران نے اپنی آنکھیں اندر کی طرف سکیڑیں جیسے دیکھ کر پہچاننا چاہتا ہو کہ "وہ زہرہ ہی ہے۔"

"یہ سب تمہیں کس نے کہا ہے کہ مجھ سے کہو۔ ابا جان نے یا تایا علاؤالدین نے یا نساء کے گھر والوں نے؟" کامران غصے سے جیسے بھڑک اٹھا۔

زہرہ کو بے انتہا حیرت ہوئی۔

"مجھ سے زیادہ کون چاہے گا کہ تم نساء سے نکاح کر لو۔ تمہارے ہی نکاح میں آنا چاہیے اسے۔" زہرہ نے قطعاً" طنز نہیں کیا تھا، مگر کامران کو لگا جیسے آگ لگا دی ہو اس نے۔

"یہ بات اگر تم نے کسی بڑے کے کان میں ڈالی تو میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا، یاد رکھنا! چپ چاپ صرف اپنے کام سے کام رکھو۔"

زہرہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ان پہروں میں بے چین رہتا تھا نا وہ۔ ایک نساء تھی... ایک بھائی صاحب تھے اور اب...

زہرہ کے چہرے کی سفیدی زرد پڑ گئی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی، لیکن چپ رہی اور پھر...

پتا نہیں کیا کیا اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔

کی گئی ہر سرگوشی اسے سنائی دینے لگی۔

کئی راتوں کے کھیل تھے جو اسے دکھائی دینے لگے۔

اس نے صرف ایک نظر کامران پر ڈالی۔

"تمہیں اس سے نکاح کرنا ہی پڑے گا۔ تمہیں اپنا راستہ سیدھا کرنا ہی ہو گا۔ یہ پچھلے دروازے والا کھیل مزید برداشت نہیں کروں گی۔ میں خاندان کے بڑوں سے بات کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کسی کو اعتراض نہیں ہو گا، جب مجھے اعتراض نہیں تو۔"

"تم کون ہوتی ہو اعتراض کرنے والی؟ جب مجھے اعتراض ہے تو۔" کامران کا چہرہ ابھی بھی بے تاثر تھا لیکن پھر بھی اسے دیکھ کر ڈر لگ رہا تھا۔

زہرہ کے لیے مقام حیرت تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نکاح والا خیال کامران کے دل میں پہلے سے ہی ہو گا۔

"یہ وہی نساء ہے، جس کے پاس تم بھاگ بھاگ کر جاتے تھے۔ میں نے تمہارے قدموں میں اپنا سر تک رکھا لیکن... یہ وہی نساء ہے، جس کی وجہ سے میں روتی اور تم تڑپتے رہے ہو۔ یہ راتوں کا کھیل اور سیاہ کاری میں مزید برداشت نہیں کروں گی۔ نکاح تو ہو گا۔"

"تم کرواؤ گی نکاح؟ ہمت ہے تم میں اتنی؟"

کامران کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس سے خوف آنے لگا جیسے وہ حواس کھو بیٹھا ہو۔

"دو کوڑی کا سمجھ رکھا ہے کیا مجھے، جو اس بدکردار، ذلیل عورت سے نکاح پڑھوا کر اس کے ساتھ شرعی ناتا جوڑ لوں؟ وہ اس گھر تک ہی ٹھیک ہے۔ سنا تم نے وہ اس گھر تک ہی ٹھیک ہے۔ اتنا بے وقعت نہیں ہے میرا نام جو اس کے نام کے ساتھ جوڑ دوں۔"

کامران غصے میں پتا نہیں کیا کیا کہتا رہا، اس نے سنا ہی نہیں۔ اس نے تو صرف یہ سنا۔

"دو کوڑی کا سمجھ رکھا ہے کیا مجھے جو اس بدکردار... دو کوڑی... بدکردار..."

اس کے آگے پیچھے دائیں، بائیں جیسے آتش فشاں پھٹنے لگے۔

وہ چپ چاپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

* * *

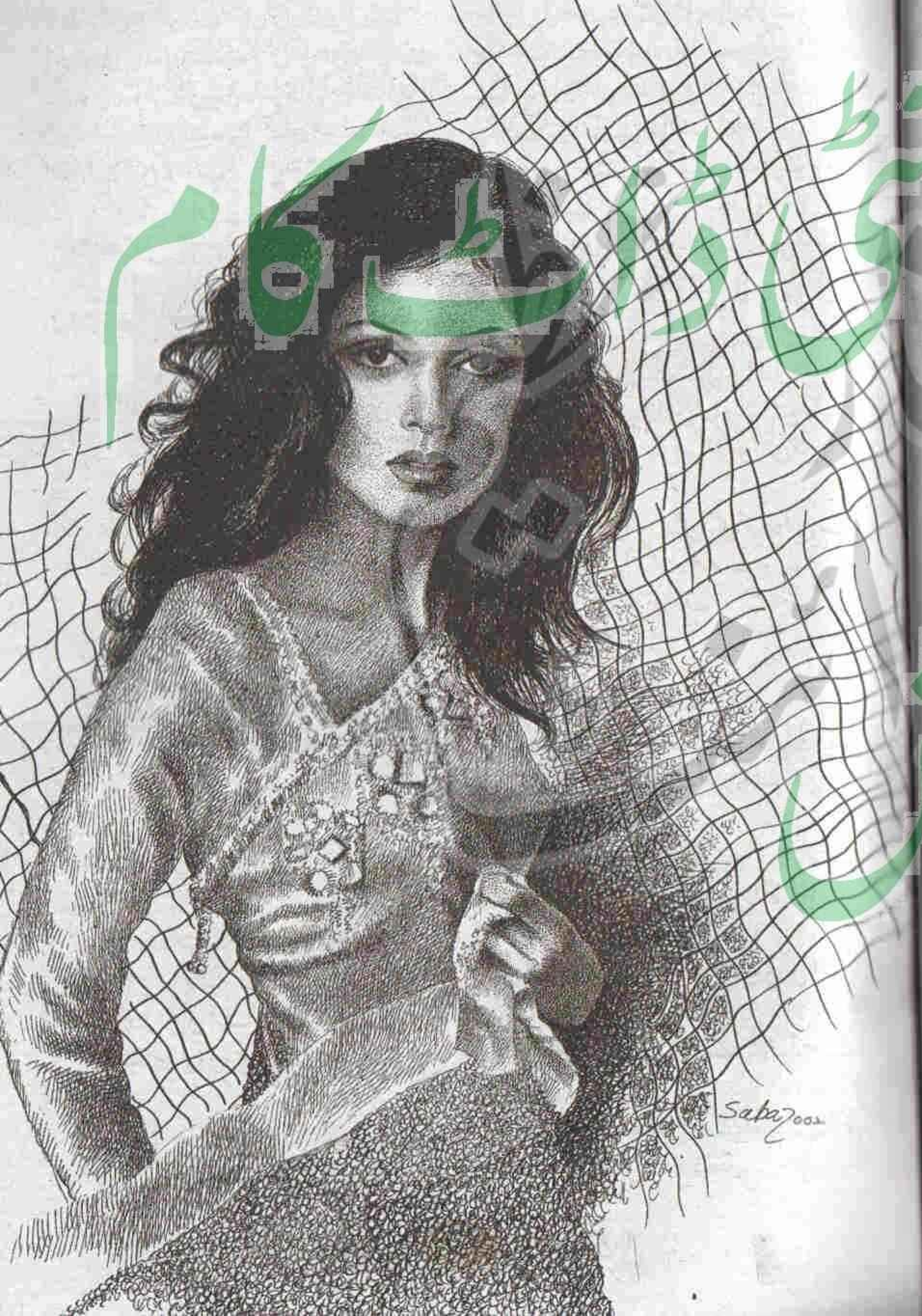

راشدہ رفعت

اب وہ محبت کرتی ہے

"صاحب! باہر بیٹھی بی بی پوچھ رہی ہیں کہ اگر آپ مصروف ہیں تو وہ پھر کسی دن تشریف لے آئیں۔" کرامت نے کمرے میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

ہادی نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ محترمہ کو ڈیڑھ گھنٹہ تو انتظار کروا دیا تھا۔ جانے والی ہوتی تو اب تک جا چکی ہوتی۔

"ٹھیک ہے یار! بھیجو انہیں۔" ہادی نے فائل بند کر کے میز پر پٹخی تھی۔ "ایک تو یہ بابا جان میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ہر دوسرے دن کسی نمونے کو اٹھا کر بھیج دیتے ہیں۔ پھر آج کل کی لڑکیاں جانے اخبار کی نوکری میں انہیں کیا کشش لگتی ہے۔ خالی خولی ڈگری لے کر سمجھتی ہیں کہ صحافت کی دنیا میں انقلاب برپا کردیں گی۔" آج اسے صحیح معنوں میں بابا جان پر غصہ آرہا تھا۔ کل رات کے کھانے پر انہوں نے سرسری سا ذکر کیا تھا۔

"محب کے جانے کے بعد جو سیٹ خالی ہوئی ہے' اس پر ایک بچی کو بھیج رہا ہوں تمہارے پاس۔ شاید کل صبح انٹرویو دینے آئے' اچھی ٹیلنٹڈ لڑکی ہے' رسمی سا انٹرویو کر لینا؟"

"رسمی سا انٹرویو... گویا آپ نے پھر کسی محترمہ کو بالا ہی بالا منتخب کر لیا ہے۔" اس نے خفگی سے انہیں دیکھا۔

ابھی اتنی مشکلوں سے تو اس نے ماہین ہمدانی سے چھٹکارا پایا تھا۔ موصوفہ کسی ریٹائرڈ بیورو کریٹ کی صاحب زادی تھیں اور بابا جان کے تعلقات کی

مکمل ناول

وسعت کے لیے شیطان کی آنت سے زیادہ کیا لفظ مناسب ہو سکتا تھا۔ تیس برس تک صحافت کی وادی کارزار میں جو کامیابیاں انہیں ملی تھیں اس میں بڑا ہاتھ ان کی پبلک ریلیشننگ کا بھی تھا۔ وہ چھاپتے وہی تھے جو سچ ہوتا تھا، لیکن یہ سچ وہ اپنے ذاتی تعلقات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے اور جب وہ سارے اختیارات ہادی کو سونپ کر عملی طور پر ریٹائر ہو چکے تھے، پھر بھی کبھی کبھار اس کے کاموں میں ایسی دخل در معقولات کر دیتے کہ وہ جھنجلائے بغیر نہ رہ پاتا۔

"مے آئی کم ان سر!" مدھم سی آواز پر اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، اپنی جھنجلاہٹ پر حتی الامکان قابو پاتے ہوئے اس نے لڑکی کو اندر آنے کی اجازت دی۔

"جی! فرمائیے۔ کس لیے جوائن کرنا چاہتی ہیں آپ ہمارا اخبار۔" اس کے ہاتھ سے فائل لے کر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پہلا سوال ہی اس انداز میں داغا کہ محترمہ حیران رہ گئی تھیں۔

"یقیناً" یہ آپ کا پیشن ہے۔ ایم آئی رائٹ؟" اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اس نے پھر سوال لڑھکا دیا تھا۔ حسب توقع جواب میں اب بھی خاموشی ہی ملی۔

"دیکھیے بی بی! بات یہ ہے کہ صحافت کے شعبے کو نوجوان نسل پیشن نہیں بلکہ فیشن سمجھ کر جوائن کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ جب آپ اس شعبے میں داخل ہو جاتے ہیں تب اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر مشکل شعبے کا انتخاب کیا ہے آپ نے، پھر جس سیٹ پر آپ نے اپلائی کیا ہے، وہ نو آموز اور ناتجربہ کار لوگوں کو تو دی ہی نہیں جا سکتی۔ محب ہاشم کا تو نام سنا ہوگا آپ نے۔ اس جگہ وہ کام کرتا تھا۔ بہت کمیٹڈ اور ٹیلنٹڈ شخص تھا۔ اب خیر وہ ٹی وی کی طرف نکل گیا، لیکن ہم۔۔۔"

"سر! آپ میرا سی وی دیکھ لیجیے۔" اس نے ہادی کی بات کاٹی تھی۔

"دیکھ لوں گا آپ کا سی وی بھی، مگر بات یہ ہے بی بی! کہ ضروری نہیں آپ کے پاس ڈگری ہے تو وہ صلاحیت بھی ہوگی جو اس جاب کے لیے ضروری ہے اور پھر برا مت مانیے گا، باصلاحیت لوگوں کو سفارش کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بائی دا وے بابا جان میرا مطلب ہے رضا ہارون صاحب سے کیا واقفیت ہے آپ کی؟" اس نے اس کی فائل کھولتے ہوئے چبھتے ہوئے انداز میں دریافت کیا تھا۔

"سوری سر! میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔" جواب دینے کے بجائے وہ یک لخت کھڑی ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اپنا سی وی لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"بیٹھیے پلیز میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ہادی جیسے ایک دم ٹھنڈا پڑا۔ موصوفہ اگر کسی بڑی شخصیت کی رشتہ دار تھیں تو بابا جان سے کھنچائی ہونا لازمی امر تھا۔

"میرا مقصد آپ کی دل آزاری کرنا ہرگز نہیں تھا۔ یہ جاب آپ کو مل سکتی ہے۔ آپ اس کی اہل بھی ہیں میں تو صرف یہ۔۔۔"

اس کی بات ابھی لبوں میں تھی کہ وہ اس کے سامنے سے اپنی فائل اٹھا کر سلام کرتے ہوئے کمرے سے باہر بھی نکل گئی۔ ہادی صرف کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

* * *

"یہ وقت ہے تمہارے گھر آنے کا؟" وہ رات ایک بجے ایک آفیشل ڈنر اٹینڈ کر کے گھر لوٹا تھا۔ بابا اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

"آپ شکی مزاج بیویوں کی طرح آدھی رات تک میرا کیوں انتظار کرتے ہیں۔" وہ ہنس پڑا تھا۔ بابا جان بھی مسکرا دیے۔

"تمہیں واقعی ایک شکی مزاج بیوی کی اشد ضرورت ہے۔ بہت بگڑ گئے ہو تم۔"

"کھانا کھا لیا آپ نے؟" اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے ایک بجے تک تمہارے انتظار میں بھوکا تو بیٹھنے سے رہا۔" وہ خفگی سے بولے۔

"اچھا ناراض کیوں ہو رہے ہیں، کہیں آوارہ گردی کر کے نہیں آرہا۔ ڈنر کا بتایا نہیں تھا آپ کو۔" وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

"ذمہ داریوں کا یہ طوق آپ نے ہی میرے گلے میں ڈالا ہے بابا جان! آج کل کمپیٹیشن کا دور ہے۔ اپنی بقا کے لیے وقت اور محنت کی قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ آپ کا وقت اور تھا، گنے چنے دو تین اخبار ملک کی اخباری صنعت پر راج کر رہے تھے، اب تو بہت سخت مقابلہ ہے۔"

"بہت تھک جاتے ہو ناں۔" بابا جان نے اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں میں سگریٹ نہیں پیتا۔" وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

بابا جان قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے۔ وہ بھی ان کی ہنسی میں شریک ہو گیا تھا۔

* * *

"اور سناؤ کیسا کام جا رہا ہے۔" بابا آج بہت دن بعد آفس آئے تھے اور اب آرام سے صوفے پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ وہ تفصیل سے انہیں مختلف دفتری امور سے آگاہ کرنے لگا۔

"سنعیہ کے آنے سے تمہارے اوپر کام کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو گیا ہوگا۔ کیسا اسسٹ کر رہی ہے تمہیں؟" انہوں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اچانک دریافت کیا۔

"کون سنعیہ۔" وہ واقعی کچھ نہ سمجھ پایا۔

"بنو مت، بلکہ بلواؤ اسے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں آج خاص طور پر اس سے ہی ملنے آیا تھا۔ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں کام کرتے ہوئے اسے کوئی پرابلم تو نہیں، تم سا اکھڑ مزاج باس کہاں بھگتا ہوگا اس بے چاری نے۔"

"کس کی بات کر رہے ہیں آپ بابا جان!" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"کیا مطلب سنعیہ نے جوائن نہیں کیا؟" انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"کہیں آپ اس لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہے جو کچھ دن پہلے انٹرویو دینے آئی تھی۔" اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"یقیناً" میں اسی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں۔" انہوں نے کاٹ دار لہجے میں کہا اور ان کی اس درجہ خفگی کم از کم اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

"انٹرویو تو میں نے لیا تھا، مگر شاید سیلری پیکیج اس کو پسند نہیں آیا تھا، اسی لیے جوائن نہیں کیا۔" ان کی ناراضی دیکھ کر اسے لہجے کو سرسری بناتے ہوئے

جھوٹ بولنا پڑا۔

”خوب تو اسے تنخواہ کم لگی تھی‘ ہائی داوے کتنی آفر کی تھی تم نے اسے۔“ بابا جان بال کی کھال اتار رہے تھے۔

”کم آن بابا جان! ایک غیر لڑکی کے پیچھے آپ مجھ سے جرح کر رہے ہیں۔ میں نے تو موصوفہ سے صرف یہ پوچھا تھا کہ آپ سے ان کی جان پہچان کیسے ہے مگر اس ذرا سی بات نے ان کی انا کو خاصی ٹھیس پہنچائی اور سوری بابا جان! میں آپ کے تعلقات مزید نہیں نبھا سکتا۔ پہلے آپ نے ماہین ہمدانی کو چپکا دیا تھا۔ اپنی جاب سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھیں محترمہ۔ کتنی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑایا ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ اب آپ ایک اور موصوفہ کو بھیج رہے ہیں‘ جانے.....“

”سنعیہ کو ماہین ہمدانی سے کمپیئر کرنے کی کوشش مت کرو ہادی!“ بابا جان نے درشتی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”وہ بچی بہت مختلف ہے۔ بہت پیاری اور بہت ہی ٹیلنٹڈ۔ تم اسے نہ رکھ کر بہت پچھتاؤ گے۔“ انہوں نے جیسے اسے وارننگ دی تھی۔

”باصلاحیت لوگوں کو سفارش کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہوتی بابا جان!“ اس بار وہ بھی قدرے چڑ کر بولا تھا۔

”بہت خوب‘ ویسے بیٹا جان! آپ اس وقت جس کرسی پر براجمان ہیں اس میں آپ کی اپنی صلاحیتوں کا کتنا دخل ہے؟“ بابا جان کا لہجہ سراسر طنزیہ تھا۔

”تو وہ لڑکی آپ کے لیے اتنی اہم ہے کہ آپ اس کے لیے مجھے میری اوقات یاد دلا رہے ہیں۔“ بابا جان کے انداز پر اسے ہنسی آگئی تھی۔

”ہاں وہ مجھے بہت عزیز ہے‘ میرے عزیز ترین مرحوم دوست کی بیٹی۔“ انہوں نے قطعیت سے جواب دیا۔

”آپ کا ایسا کون سا دوست ہے جس سے میں واقف نہیں۔“ وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

”نام بتانے سے کیا حاصل‘ تمہارے حافظے میں وہ نہیں ہو گا اور پھر اسے دنیا سے گزرے ایک مدت ہو گئی۔ عرصے بعد اس کی بیٹی سے رابطہ ہوا ہے۔ میں نے اسے کتنے یقین سے تمہارے پاس بھیجا تھا۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہادی! کیا سوچ رہی ہو گی وہ بچی اور خوددار اتنی ہے کہ مجھ سے تمہارے رویے کی بالکل شکایت نہیں کی۔ کل شام کو بھی میری اس سے فون پر بات ہوئی۔ میں اسی گمان میں اس سے بات کیے گیا کہ وہ تمہارے پاس آرہی ہے اور اس نے ہرگز بھی میری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی‘ بس ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔“ بابا جان کو ازحد قلق ہو رہا تھا۔

”سوری بابا جان! غلطی ہو گئی۔ آپ اسے ایک بار پھر بھیج دیجیے گا۔ میں اسے ایڈجسٹ کر لوں گا۔“ بابا کم ہی اتنے ناراض ہوتے تھے‘ اس نے عافیت اسی میں جانی کہ غلطی تسلیم کرے۔

”کوشش تو کروں گا‘ لیکن مشکل ہی ہے کہ اب وہ میری بات مانے گی۔“ بابا جان نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔ وہ خاموش ہی رہا۔

اور دو دن بعد وہ پھر اس کے سامنے موجود تھی۔

”جی تو مس سنعیہ کام سمجھ لیا آپ نے؟“

روایتی پیشہ ورانہ انداز میں اس نے سنعیہ کو گائیڈ لائن دی تھی۔ وہ سنجیدہ سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔ ہادی کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ نہ ہو پایا کہ کام اس کی سمجھ میں آیا بھی ہے یا سر پر سے گزر گیا ہے۔

”اینی کونسچن مس سنعیہ!“ ہادی نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے استفسار کیا۔

اس دن کی ملاقات تو بہت مختصر ہی تھی۔ جانے کیوں آج اس لڑکی کے نقوش بہت مانوس اور دیکھے بھالے سے لگ رہے تھے لیکن بہت غور کرنے پر بھی وہ اندازہ نہ لگا پایا تھا کہ سامنے بیٹھی لڑکی کس کی شباہت لیے ہوئے ہے۔ خیر‘ دنیا میں بہت سے چہرے ملتے جلتے لگتے ہی ہیں۔ اس نے اس کے نقوش کھوجنے کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ سنعیہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے‘ جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو‘ مگر کہہ نہ پا رہی ہو۔

”جی مس سنعیہ۔“ ہادی نے اسے بات کرنے کا حوصلہ دیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ سر! کہ میں پہلی بار انٹرویو دینے آئی تھی‘ تب رضا انکل نے مجھے بتایا تھا کہ ویکینسیز نکلی ہوئی ہیں‘ میں بھی اپلائی کر دوں۔ آئی ایم سوری‘ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے خاص طور پر بغیر کسی ضرورت کے بھیجا گیا ہے‘ اب بھی مجھے رضا انکل کی وجہ سے مجبوراً آنا پڑا ہے۔ ان کے حد درجہ اصرار کے سامنے مجھے اپنا مسلسل انکار بدتہذیبی لگا‘ میں نے کئی جگہوں پر اپلائی کر رکھا ہے‘ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جیسے ہی.....“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ہادی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ محترمہ ضرورت سے زیادہ لمبی ناک کی مالک تھیں۔

”بات یہ ہے مس سنعیہ کہ اگر آپ کا کام ہمارے معیار کے مطابق ہوا تو آپ چاہیں گی بھی تو ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”میں کوشش کروں گی سر!“ وہ بھی دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

⁂

”یار صابر! بندہ سارا دن کا تھکا ہارا شام کو گھر آتا ہے۔ کچھ ڈھنگ کا پکا لیا کرو۔“ بدمزا سا سالن کھاتے ہوئے وہ صابر سے شکوہ کیے بنا نہ رہ پایا۔

”صاب! پانچ سال پہلے صابر اس گھر میں ڈرائیور کے طور پر آیا تھا۔ اب صابر کھانا بھی پکاتا ہے۔ ملازمہ کے سر پر کھڑے ہو کر صفائی بھی کرواتا ہے۔ لانڈری سے کپڑے بھی دھلواتا ہے اور آپ دونوں گھر میں نہ ہوں تو گھر کی چوکیداری بھی کرتا ہے۔ یعنی صابر ڈرائیوری کے علاوہ ہر کام کرتا ہے تو جس بندے کے سر پر اتنے کام ہوں تو وہ کھانا ایسا ہی بنا سکتا ہے۔“

پشتو لہجے میں اردو بولتا سرخ و سپید رنگت والا صابر آج کافی ناراض سا تھا۔

”خیر ہے خان صاحب اتنی برہمی۔“ ہادی نے مسکراتے ہوئے پوچھا‘ جبکہ بابا جان خلاف توقع کھانے میں کوئی نقص نکالے بغیر بڑی رغبت سے کھانا کھا رہے تھے‘ جیسے اس گفتگو سے انہیں کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

”یہ آپ اپنے بابا جان سے پوچھو۔ صابر اس گھر کے لیے چوبیس گھنٹے جان مارتا ہے۔ اس ہڈ حرام پینو سے چیخ چیخ کر سارے گھر کی صفائی کرواتا ہے اور آپ کا بابا صاحب کالونی کے بچوں کو بلا کر گھر میں کرکٹ میچ کرواتا ہے۔ سارے گھر میں بچے وہ اودھم مچاتے ہیں کہ اللہ توبہ۔ فریج میں گھس کر چیزیں چٹ کر جاتے ہیں۔ لان کا ستیاناس کر دیتے ہیں‘ اب آپ ہی بتاؤ صابر غصہ نہ کرے تو کیا کرے۔“

”بالکل کرے۔ غصہ کرنا صابر کا حق بنتا ہے۔“ ہادی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”غصہ کرنا صابر کا حق بنتا ہے اور اپنے حقوق و فرائض کا کچھ خیال ہے میاں۔“ بابا جان تنک کر بولے۔

”کیوں‘ اب میں نے کیا کر دیا؟“ اس نے بے چارگی سے پوچھا۔

”کب سے کہہ رہا ہوں شادی کر لو‘ تم بڈھے ہوتے جا رہے ہو اور میں بڈھا ترین۔ پوتے‘ پوتیاں کھلانے کی آرزو لیے ہوئے۔ تمہاری ماں دنیا سے رخصت ہوئی‘ اب تم چاہتے ہو کہ میں بھی یہ حسرت لیے مر جاؤں؟“ وہ جذباتی ہوئے تھے۔ صابر مسکراتے ہوئے واپس مڑ گیا‘ اس نے بڑے صاحب کو ان کی مرضی کی پچ تیار کر کے دے دی تھی۔

”اللہ کا نام لیں بابا جان! ممی کے انتقال کے وقت میری عمر بمشکل انیس بیس سال تھی‘ وہ کہاں سے میری شادی کی حسرت لیے رخصت ہوئی ہیں۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو اب تو تمہاری عمر انیس بیس سال نہیں ہے نا۔ شادی کے لیے یہ ہی عمر مناسب ہوتی ہے۔ کتنا

عرصہ ہو گیا ہے تمہیں مجھے ٹالتے ہوئے۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔" انہوں نے دو ٹوک لہجے میں باور کروایا۔

"شادی تو میں کرلوں بابا جان! لیکن شادی کے لیے ایک عدد لڑکی کا ہونا بھی ضروری ہے اور مجھے فی الحال کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی‘ جس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد میں اپنا دل دے بیٹھوں۔"

"اپنا دل اپنے پاس سنبھال کر رکھو‘ وہ شادی کے بعد بھی دیا جا سکتا ہے اور حیرت ہے کہ اتنے میچور ہو کر بھی تم پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہو۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ جھینپ کر ہنس پڑا۔

"خیر تمہارا مطلب جو بھی تھا میرا مطلب صرف یہ ہی ہے کہ اب تم سنجیدگی سے شادی کے متعلق کوئی فیصلہ کر لو‘ اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں سے تمہاری علیک سلیک ہے۔ کیا کوئی بھی بھلی نہیں لگتی۔" وہ اب دوستانہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"میں نے کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"تو اب دیکھ لو اور مجھے لگتا ہے کہ تمہاری نزدیک کی نظر کچھ کمزور ہے۔"

"کیا مطلب بابا جان! آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔" اس نے الجھ کر پوچھا‘ وہ مسکرا دیے۔

"میں فی الحال تم سے یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ اگر تم اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تو کیا مجھے اختیار دو گے کہ میں تمہارے لیے کچھ سوچ سکوں؟ باپ ہوں تمہارا آخر‘ جو سوچوں گا تمہارے بھلے کا ہی سوچوں گا۔"

"آف کورس بابا جان! آپ میری زندگی سے متعلق تمام فیصلوں کا اختیار رکھتے ہیں‘ میں نے کب آپ کو انکار کیا۔ کوئی لڑکی آپ کو اچھی لگی ہے تو مجھے بتائیں‘ کون ہے وہ‘ میں ضرور اس کے بارے میں سوچوں گا۔" وہ بابا جان سے لڑکی اگلوانا چاہ رہا تھا‘ مگر وہ بھی اپنے نام کے ایک تھے۔

"لڑکی تمہارے آس پاس ہی ہے‘ اسے تمہیں خود کھوجنا ہے۔ میرے خیال میں تو ایک عورت میں تین خوبیاں ہوں تو اسے شریک سفر بنایا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہو‘ باشعور ہو اور پروقار ہو۔ اور جو لڑکی میں نے تمہارے لیے سوچی ہے‘ ان تین خوبیوں کے ساتھ خوب صورتی اس کی ایک اضافی خوبی ہے‘ بہت جچے گی وہ تمہارے ساتھ۔"

"آخر آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔" اس کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کہا تو ہے اپنے آس پاس دیکھو‘ کچھ تو دماغ لڑاؤ‘ ناکام ہوئے تو میں بتا دوں گا۔"

"تو گویا آپ میرے ساتھ کسوٹی کھیل رہے ہیں۔" وہ ہنسا۔

"جو بھی سمجھ لو۔" بابا جان مسکرائے۔

"اوکے باس! کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ مسکراتا ہوا دوبارہ صابر کے بنے بدمزا کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا کہ خالی پیٹ تو دماغ بھی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی سر! سنڈے میگزین کے لیے ثاقب مراد کا فیچر ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔" سنعیہ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"ہاں ثاقب کا فون آیا تھا ابھی‘ تھوڑی دیر میں فیچر سمیت پہنچ رہا ہے۔" اس نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں ہٹا کر ایک لمحے کو اسے دیکھا تھا۔ وہ جواب سن کر واپس پلٹ گئی۔

"مس سنعیہ۔" اس نے اچانک ہی اسے پکارا۔

"جی۔" وہ پھر مڑی۔

"آپ یہاں سیٹ ہیں نا‘ میرا مطلب ہے کوئی پرابلم تو نہیں۔" وہ شاید اپنی تسلی چاہ رہا تھا۔

سچ تو یہ تھا سنعیہ نے چند دنوں میں ہی اپنا ٹیلنٹ ثابت کر کے دکھا دیا تھا۔ بظاہر چپ چاپ کام کیے جانے والی اس لڑکی میں بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ چند ہی دنوں میں اس کی زیرک نگاہوں نے یہ صلاحیتیں بھانپ لی تھیں۔ اسے آج بھی افسوس تھا کہ پہلے دن وہ اس سے مس بی ہیو کر گیا تھا‘ یوں تو وہ خود کو زیادہ قصوروار نہ گردانتا تھا کہ بابا جان کی سفارشی لڑکیوں کا اکثر و بیشتر فرسٹ فلور خالی ہوتا تھا۔ البتہ سنعیہ کا کیس بالکل مختلف تھا۔ شاید پہلی بار بابا جان نے کسی کی تعریف کرتے ہوئے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ اس تعریف کی حق دار تھی۔

"نہیں سر! مجھے یہاں کوئی پرابلم نہیں ہے۔" وہ شائستگی سے جواب دے کر پلٹ گئی تھی۔

وہ لڑکیوں کی اس کلاس سے تعلق نہیں رکھتی تھی جن سے کوئی فالتو بات چیت کی جا سکے۔ ہادی دل ہی دل میں خود کو اس کے احترام کے لیے مجبور پاتا تھا۔ سنعیہ جیسی باوقار لڑکی سے اس کا کم ہی پالا پڑا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی‘ محنتی اور باصلاحیت۔

"تھینکس بابا جان! زندگی میں پہلی بار آپ نے کسی ڈھنگ کے بندے کی سفارش کی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا‘ پھر دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ایس خان کون صاحب ہیں۔ دو دن سے کالم لگ رہا ہے ان کا‘ مجھے تو کوئی منجھا ہوا کالم نویس لگتا ہے‘ لیکن نام پہلے کبھی نہیں سنا۔" بابا ناشتے کی میز پر اس سے مخاطب تھے۔

"پتا نہیں بابا! شمسی ہی نئے نئے کالم نگاروں کو دریافت کر رہا ہے۔ آفس جاؤں گا تو پوچھوں گا اس سے۔" وہ بخار اور فلو کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ دو دن سے گھر پر ہی بستر سنبھال رکھا تھا۔

"بہت شان دار لکھا ہے‘ طنز و مزاح کی آمیزش کی وجہ سے سنجیدہ موضوع بھی ہلکا پھلکا ہو گیا ہے‘ حالانکہ قلم میں کاٹ بہت ہے۔"

بابا کی اتنی تعریفوں پر اس نے ان کے ہاتھ سے اخبار لیا۔ ابھی تو سرسری سا ہی پڑھا تھا۔ چند دنوں سے اخبار میں نو آموز کالم نگاروں کے لیے ایک گوشہ مختص کیا گیا تھا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی نیا نام چھپ رہا ہوتا‘ مگر اس سلسلے کا فیڈ بیک کچھ خاص نہیں مل رہا تھا‘ نئے لکھنے والے کالم نویسی کے تقاضوں پر پورے نہیں اتر رہے تھے۔ کالم کے بجائے مضمون کا گمان ہوتا‘ لیکن آج جس کالم کی بابا تعریفیں کر رہے تھے اس میں یقیناً کوئی خاص بات تو ہونی تھی اور واقعی غور سے پڑھا تو آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔ طنز و مزاح کی آمیزش لیے، بہت پختہ انداز تحریر تھا۔

"اچھی دریافت ہے۔" اس نے شمسی کے انتخاب کو سراہا۔

"آئندہ اس کالم کو نمایاں جگہ پر لگانا۔" بابا نے ہدایت کی۔

"آپ کہیں تو ایڈیٹوریل پیج پر لگا دوں؟" وہ ہنسا۔

"خیر وہ وقت بھی دور نہیں جب یہ ایڈیٹوریل پیج پر بھی آجائے گی۔"

"آجائے گی؟" اس نے اچنبھے سے دریافت کیا۔

"یار! بس مذکر‘ مونث کی غلطیاں نکالتے رہا کرو‘ صابر کے ساتھ رہتے اتنے برس بیت گئے‘ زبان پر تو اثر پڑے گا نا۔" بابا جان کچھ سنبھلتے ہوئے بولے لیکن ہادی نے ان کی بات غور سے سنی ہی نہ تھی۔

"آج سوچ رہا ہوں آفس کا چکر لگا لوں‘ لیکن ہمت نہیں پڑ رہی۔" بچپن سے اس کی یہ عادت نہیں بدلی تھی۔ ذرا سی بیماری بھی نڈھال کر دیتی تھی۔

"ایک دن کا ریسٹ اور کر لو۔" بابا جان نے مشورہ دیا۔

"کرنا ہی پڑے گا‘ جسم ٹوٹ رہا ہے اور سر میں شدید درد۔" اس نے خود پر نقاہت طاری کی۔

"اب بوڑھا باپ تمہارا سر دباتا اچھا لگے گا کیا۔ اسی لیے تو کہتا ہوں شادی کر لو۔" بابا جان کی تان آج کل اسی بات پر ٹوٹتی تھی۔ وہ بنا جواب دیے مسکرا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔"

سنعیہ اس سے مزاج پرسی کر رہی تھی، یہ اور بات کہ جملے کے دوران ہی وہ دو دفعہ چھینک چکی تھی۔

"میں تو اب بہتر ہوں مس سنعیہ، لیکن شاید اب آپ فلو کی لپیٹ میں آگئی ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"فلو؟ مس سنعیہ کو پچھلے دو دنوں سے شدید ٹمپریچر بھی ہے، کل بھی میں نے انہیں زبردستی ہاف لیو پر گھر بھیجا تھا، ورنہ یہ تو قائداعظم کے مقولے پر یقین رکھتی ہیں، کام، کام اور صرف کام۔" شمسی بھی اس وقت کمرے میں تھا، اس نے گفتگو میں حصہ لیا۔

ہادی نے ایک نگاہ سنعیہ کے چہرے پر ڈالی، اس وقت بھی اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، شاید بخار اب بھی نہ اترا تھا۔ ہادی دل ہی دل میں شرمندہ ہوا، وہ طبیعت خرابی کو جواز بنا کر تین دن گھر بیٹھا رہا اور یہاں یقیناً" کام کی زیادتی کی وجہ سے سنعیہ کو آفس آنا پڑ رہا تھا۔

"مس سنعیہ! آپ ایک، دو دن ریسٹ کرلیں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"آج تو آ ہی گئی ہوں سر! طبیعت نہ سنبھلی تو کل کا آف لے لوں گی۔" اس نے ٹشو سے ناک رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ ایک چھوڑ، بے شک دو دن کا آف لیں، لیکن کالم کا آف ہرگز نہ ہوگا، کالم تو آپ کو گھر بیٹھ کر بھی لکھنا پڑے گا۔" شمسی نے گویا اسے پیشگی آگاہ کیا۔

"کیسا کالم۔" ہادی شمسی کی بات سمجھ نہ پایا۔

"سر! آپ نے مس سنعیہ کا کالم نہیں پڑھا۔ بہت اچھا بلکہ حیران کن حد تک اچھا رسپانس ملا ہے ہمیں۔" شمسی نے خوش ہو کر بتلایا۔

"ایس خان یعنی...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر بے یقینی سے سنعیہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکان پھیلی ہوئی تھی۔

"امیزنگ سنعیہ! آپ نے واقعی بہت اچھا لکھا۔ کیپ اٹ اپ۔" اس نے دل سے اس کی تعریف کی تھی۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں سر! آپ لوگ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

وہ جھینپ گئی تھی اور پھر فوراً ہی اس نے دفتری امور سے متعلق کوئی بات چھیڑ کر موضوع بھی بدل دیا تھا۔ ہادی زیر لب مسکرا دیا تھا۔ اب اس لڑکی کی عادتوں کے متعلق وہ کچھ کچھ جاننے لگا تھا۔

* * *

"مجھے لگتا ہے بابا! میں اس لڑکی سے متاثر ہوتا جا رہا ہوں۔" رات کو کھانے کی میز پر اس نے بابا کے سامنے اعتراف کیا۔

"سنعیہ ہے ہی اس قابل کہ اس سے متاثر ہوا جائے۔"

"آپ کو کیسے پتا میں سنعیہ کی بات کر رہا ہوں۔" وہ حیران ہوا۔

"تم بے شک نہ کرو، مگر میں تو سنعیہ کی ہی بات کر رہا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"آپ کو پتا ہے وہ کالم جو آپ کو بہت پسند آیا تھا، وہ سنعیہ نے لکھا تھا۔" اس نے اپنی دانست میں انہیں حیران کن بات بتائی۔

"میں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا، اس لڑکی میں بہت پوٹینشل ہے۔"

"یعنی کہ آپ اس روز مجھے بے وقوف بنا رہے تھے، یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے آپ کو پتا ہی نہیں کہ کالم کس نے لکھا ہے۔" اس نے انہیں خفگی سے دیکھا۔

"ہاں! تمہیں بے وقوف تو بنایا، لیکن اس کام میں مجھے زیادہ محنت نہیں پڑی۔" انہوں نے اسے ہنستے ہوئے چھیڑا، وہ بھی ہنس پڑا۔

"ویسے بابا! سچی بات تو یہ ہے کہ یہ لڑکی ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے حیران کیے دے رہی ہے۔ ٹیلنٹڈ تو ہے، مگر شخصیت میں عجیب سا گریس ہے، دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔" اس نے تسلیم کیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے تمہاری قریب کی نظر میں بہتری آتی جا رہی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

ہادی نے یک دم سر اٹھا کر انہیں دیکھا، جو وہ سمجھا تھا کیا ان کا مطلب وہی تھا۔

"بابا! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ اس روز آپ جو کسوٹی کھیل رہے تھے کیا آپ مجھ سے سنعیہ کی شخصیت بجھوا رہے تھے۔" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"بیس سالوں میں تو نہیں، لیکن بیس دنوں میں تم صحیح جواب تک پہنچ ہی گئے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولے، لیکن وہ حیران پریشان سا بیٹھا رہا۔

اس روز بہت دماغ لڑانے کے بعد بھی اسے اپنے قرب و جوار میں کوئی ایسی لڑکی سجھائی نہ دی جس پر اسے گمان گزرتا کہ بابا اسے سوچے بیٹھے ہیں، اس نے بابا کی بات کو سراسر ایک مذاق سمجھا تھا۔ شاید وہ اسے اپنے آس پاس جاننے والی لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی ڈھونڈنے کی تحریک دلوانا چاہتے تھے۔ اس دن اس نے بابا کی بات کو سنجیدگی سے ہی نہ لیا تھا۔ سوچ کے تھوڑے سے گھوڑے دوڑانے کے بعد اس نے ان کی بات کو مذاق کے کھاتے میں ڈال کر مزید سوچ بچار کی زحمت نہ کی تھی۔ اسے ہرگز اندازہ نہ ہوا کہ بابا اس روز سنعیہ کا ذکر کر رہے تھے۔

وہ لڑکی جس کو اس کے آفس میں داخل ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے، وہ اسے اس کی زندگی میں شامل کرنے کا پلان بنائے بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا، کیا میری تجویز کردہ شخصیت تمہیں بری لگی؟" بابا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"سچی بات تو یہ ہے بابا کہ ابھی میرا دماغ آپ کی تجویز کردہ شخصیت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ فی الحال تو میں صرف حیران ہوں کہ آپ کے ذہن میں یہ بات آئی بھی کیسے۔ آپ کب اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔" وہ واقعی حیران تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے ہادی! کہ کسی کو جاننے کے لیے بعض اوقات عمر بھی کم پڑ جاتی ہے اور بعض اوقات دو چار ملاقاتیں بھی کسی کے متعلق درست اندازہ لگانے کا سبب بن جاتی ہیں اور دوسری بات یہ کہ تم پر کوئی زور زبردستی نہیں۔ تم اپنا ہر فیصلہ کرنے میں خود مختار ہو، ہاں مجھے وہ بچی دیکھنے کے ساتھ ہی بہت اچھی لگی، دل چاہا کہ ایسی سلجھی ہوئی بچی کو ہی تمہارا شریک سفر ہونا چاہیے اور میں کون سا ابھی اس کے گھر تمہارا رشتہ لے کر جا رہا ہوں، وہ تمہارے ساتھ کام کر رہی ہے۔ دیکھو، پرکھو، دل مانے تو مجھے بتاؤ اور اگر تمہیں کوئی اور لڑکی لائف پارٹنر کے طور پر پسند آتی ہے تو مجھے اس پر بھی قطعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" بابا جان رسانیت سے بولے، وہ محض سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

* * *

اسے اے پی این ایس کی میٹنگ کے لیے ایک، دو دن کے لیے کراچی جانا پڑا تھا اور آج آفس آکر آج کے اخبار کا تفصیلی مطالعہ کیا تو متین زبیری کے کالم کے اوپر ادارتی نوٹ پڑھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

متین زبیری صف اول کا کالم نویس تھا اور شاید ان کے اخبار کا سب سے مہنگا کالم نویس بھی۔ بعض نام ایسے ہوتے ہیں جنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے اور متین زبیری ایسا ہی کالم نگار تھا۔ ایجنسیوں سے روابط کی وجہ سے وہ اکثر اندر کی بات باہر نکالتا تھا اور اسی لیے اس کا کالم شوق سے پڑھا جاتا تھا، ورنہ نظریاتی طور پر اس کا قبلہ کہاں جا ملتا تھا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ غیر ملکی سفارت خانوں کی تقریبوں میں جن صحافیوں کو خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا، ان میں متین زبیری سرفہرست ہوتا تھا۔ سرحد کے دونوں اطراف کے نام نہاد دانشوروں نے جو ادبی تنظیم قائم کر رکھی تھی، وہ اس کا بھی روح رواں تھا۔

آج کے کالم میں اس نے حسب معمول پاکستان کی نظریاتی اساس پر اپنے مخصوص ڈھکے چھپے انداز میں سوال اٹھائے تھے لیکن آج اس کے کالم کے اوپر جلی حروف میں درج تھا "ادارے کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔"

ایک قد آور کالم نگار کے لیے یہ ایک بہت بڑا

طمانچہ تھا کہ اس کا اپنا اخبار ہی اس کے لکھے کی حمایت کرنے سے انکار کردے۔ ہادی یہ کیپشن پڑھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ نئے اخباروں نے بھاری معاوضوں کے عوض بہت سے کالم نویسوں کو پہلے ہی اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ یہ دو چار نام بچے تھے جن کی وجہ سے اخبار کی ساکھ برقرار تھی اور اب یہ کیپشن جما کر گویا متین زبیری کو بھی ناراض کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے فوراً ”شمسی کو بلا بھیجا۔

”شمسی! یہ کیا حماقت ہے۔“ اس نے اخبار شمسی کے سامنے میز پر پھینکا۔

”مجھے بھی جب پتا چلا تو دیر ہو چکی تھی سر! اور یہ ہمت میں نے نہیں مس سنعیہ نے کی ہے۔“ اس کا غصہ دیکھ کر شمسی نے صاف صاف بتا دیا۔

”بلائیے مس سنعیہ کو۔“ وہ لب بھینچتے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ دو منٹ بعد ہی وہ آگئی تھی بالکل پُرسکون

”جی سر! آپ نے بلایا مجھے؟“ وہ شاید جانتے بوجھتے انجان بن رہی تھی۔

”مس سنعیہ! آپ نے جو حماقت کی ہے جانتی ہیں ہمیں اس کا کتنا خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا ہے؟“ ہادی نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کاٹ دار لہجے میں مخاطب کیا۔

”سر! آپ کالم پڑھ کر تو دیکھیں کیا بکواس کی گئی ہے اس میں۔“ سنعیہ کو اس کا ردِعمل دیکھ کر افسوس ہوا تھا۔ اس نے اخبار کھول کر ہادی کے سامنے پھیلایا۔

”یہ دیکھیں سر! قائداعظم کی گیارہ اگست والی تقریر کو لے کر اس شخص نے نہ صرف بانیٔ پاکستان کی شان میں ہرزہ سرائی کی ہے بلکہ دو قومی نظریے کا بھی کھلم کھلا مذاق اڑایا ہے اور دیکھیں تو سہی سقوطِ ڈھاکہ کا ذکر کتنے تمسخر آمیز انداز میں کیا ہے۔ کالم پڑھ کر لگتا ہی نہیں کہ کسی پاکستانی صحافی کا نقطۂ نظر پڑھ رہے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ یہ کسی پرو ہندوستانی شخص کا تحریر کردہ ہے۔ دل تو کررہا تھا کہ اس کالم کا جواب بالکل اس کے سامنے والی جگہ پر کالم لکھ کر دوں لیکن پھر سوچا کہ فی الحال تو اس کیپشن سے کام چلاتی ہوں کہ ادارہ مضمون نگار کی رائے سے متفق نہیں بعد میں کالم۔۔۔“

”مس سنعیہ! آپ ادارہ نہیں ہیں۔“ ہادی نے اس کی بات کاٹ کر جتانے والے انداز میں کہا۔ سنعیہ نے ایک نگاہ اس کے برہم چہرے پر ڈالی اور نگاہیں جھکا لیں۔

”آپ محض اس ادارے کی ایمپلائی ہیں اور دو چار کالم لکھ کر آپ سمجھ رہی ہیں کہ آپ بہت بڑی انٹلیکچوئل بن گئی ہیں اور ہر معاملے میں آپ کی رائے حرفِ آخر ہو گئی ہے تو یہ غلط فہمی ہے آپ کی۔ ہمیں ہر نقطۂ نظر کے لوگوں کو اہمیت دینی پڑتی ہے۔ صحیح غلط کا فیصلہ کرنا ہمارا نہیں۔ قارئین کا کام ہے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اگر آئندہ آپ اپنی حُب الوطنی اور جذباتیت اپنے تک ہی محدود رکھیں گی۔ حد سے زیادہ اعتماد آپ کو تو نقصان پہنچائے گا مگر میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کا خمیازہ ہمارے اخبار کو بھگتنا پڑے۔“ اس نے سنعیہ کو ٹھیک ٹھاک قسم کی جھاڑ پلادی تھی۔

”سوری سر!“ وہ بمشکل بولی تھی۔ شدید غصے اور بے عزتی کے احساس سے اس کا چہرہ دہک اٹھا تھا، اس کا چہرہ دیکھ کر ہادی کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔

”جاسکتی ہیں آپ۔“ اس نے کہہ کر ایک فائل کھول لی۔

سنعیہ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر واپس پلٹ گئی تھی۔ کئی لمحوں تک اس کے سُتے ہوئے چہرے اور لرزتی پلکوں کا تصور ہادی کو مضطرب کرتا رہا تھا۔

”اس احمق لڑکی کو بابا میرے لیے سوچے بیٹھے ہیں۔“ اس نے بابا کی تجویز کو ناقابلِ عمل گرداننا چاہا تھا لیکن دھیان بھٹک بھٹک کر سنعیہ کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کی طرف جارہا تھا۔ سنعیہ کو جو ”ڈوز“ ابھی پلائی تھی، اس میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا پھر جانے کیوں دل کچھ غلط ہونے کی گھنٹی بجا رہا تھا، دل ودماغ کی ان متضاد کیفیتوں پر وہ جھنجلا سا گیا، فائل پٹخ کر اس نے ٹائم دیکھا۔ ذرا دیر بعد چیف منسٹر کے ساتھ مدیران کی میٹنگ تھی۔ اس نے ڈرائیور کو فون کرکے گاڑی نکالنے کا کہا تھا۔

* * *

”بیٹا جان! عملی زندگی میں انسان کو جذبات کے ساتھ کچھ مصلحتوں اور مجبوریوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

وہ دو گھنٹے بعد لوٹا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے لگا تو بابا جان کی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ کس کو سمجھا رہے تھے۔ ہادی اندازہ لگا سکتا تھا اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ بابا جان کے پاس سنعیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”خیریت بابا جان! صبح تو آپ کے آنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔“ اس نے انہیں سلام کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”پروگرام بنتے کیا دیر لگتی ہے۔“ بابا جان نے اسے خفگی سے دیکھا تھا، ہادی نے بمشکل مسکراہٹ دبائی۔ سنعیہ کی روئی روئی آنکھوں اور گلابی ہوتی ناک نے یہ حقیقت آشکار کردی تھی کہ وہ اس کے بابا سے اس کی شکایت کا فریضہ سرانجام دے چکی ہے۔

”مس سنعیہ نے آپ کو چائے بھی پلائی یا منگواؤں؟“ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں بس میں چل رہا ہوں۔ احد کی طرف جانا ہے۔ نوشابہ بھابھی نے ہمایوں کی شادی کے متعلق کچھ ڈسکس کرنا ہے۔“ بابا جان سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئے تھے۔

”اور سنعیہ کو اس کے گھر ڈراپ کررہا ہوں۔ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے اسے مطلع کیا پھر سنعیہ کو مخاطب کیا تھا۔ ”اٹھو بیٹا!“

ان کی بات سن کر وہ ایک لمحے کو ہچکچائی تھی مگر پھر اٹھ گئی۔

”میں اپنا بیگ لے آؤں انکل؟“ اس نے ہادی سے رسمی اجازت لینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور دھیرے سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

”آپ میرے آفس کا ڈسپلن خراب کررہے ہیں سر!“ اس نے مصنوعی خفگی جتاتے ہوئے بابا جان کو مخاطب کیا۔ انہوں نے سگار سلگا لیا گویا اس کی بات کو سنا ہی نہ ہو۔ ہادی ان کی بے نیازی پر ہنس پڑا تھا۔

* * *

”کیا ہوا تھا صبح۔“ شام کو آفس سے واپسی پر حسبِ توقع بابا کی عدالت میں بیٹھا ہوا تھا۔

”صبح۔۔۔ ہاں چیف منسٹر کے ساتھ میٹنگ تھی۔ وہی اپنے کارنامے بتانے کے لیے بریفنگ کا اہتمام تھا کوئی نئی بات۔۔۔“

”سنعیہ کو تم نے کیوں ڈانٹا تھا۔“ بابا جان نے اس کی بات کاٹ کر خفگی سے پوچھا۔

”ڈانٹنے والی بات پر ہی ڈانٹا تھا۔“ وہ کچھ چڑ کر بولا۔ ”اور بہت کوئیک سروس ہے محترمہ کی فٹ آپ سے میری شکایت لگادی۔“

”اس نے کوئی تمہاری شکایت نہیں لگائی میں اتفاقاً وہاں جا نکلا تھا، زاروقطار رو رہی تھی بے چاری۔ شمسی نے بتایا تھا مجھے۔“ انہوں نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

”تو آپ کو میرا ڈانٹنا نظر آگیا۔ اس کی غلطی نظر نہیں آئی۔ آپ جانتے تو ہیں بابا جان کہ دوسرے اخباروں کے مقابلے میں ہماری سرکولیشن کتنی محدود ہوتی جارہی ہے۔ نام کا قومی اخبار رہ گیا ہے ورنہ مقامی سطح کا اخبار لگتا ہے۔ اپنے محدود ترین بجٹ میں ہم متین زبیری جیسے دو تین بڑے ناموں کو اکاموڈیٹ کرتے ہیں اور محترمہ کی خواہش ہے کہ ہر لکھنے والا ان کی طرح ضمیر کی آواز پر لبیک کر کے لکھے۔“

”ایسے ہی لوگ زمین کا حسن ہوتے ہیں ہادی! سچے، من کے اجلے، اور نڈر۔ اس کا باپ بھی ایسا تھا، ہم مصلحت پسندوں کی دنیا میں چند ایک ایسے سرپھروں کی ضرورت ہے ہادی!“ بابا جان کھوئے کھوئے سے انداز میں بولے۔

"آپ ریٹائر ہو کر گھر بیٹھ گئے ہیں' اس لیے آپ کو ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں' مگر میں نے اخبار چلانا ہے۔" اس نے انہیں حقیقت جتلائی۔

"ہاں غلط تم بھی نہیں ہو۔" بابا جان نے گہرا سانس لیتے ہوئے تسلیم کیا۔ "لیکن پھر بھی میں یہ ہی کہوں گا کہ تمہیں سنعیہ کو اس درشتی سے نہیں ڈانٹنا چاہیے۔ بچی ہے اور بہت حساس بھی۔" بابا جان نے رسانیت سے کہا۔

"مانتا ہوں بابا! مگر اسی کی وجہ سے ہی آج شام میں متین زبیری سے ٹیلی فونک جھڑپ بھی ہو گئی ہے۔ سنعیہ صحیح کہہ رہی ہے یہ بندہ اب بکواس کے سوا کچھ نہیں لکھتا مگر۔۔۔ اور سچ بتاؤں تو اگر سنعیہ کے ہرٹ ہونے سے آپ کو تکلیف ہوئی ہے تو اس کی گلابی آنکھوں کو دیکھ کر کم ڈسٹرب میں بھی نہیں ہوا۔" اس نے جیسے بے پروائی سے اعتراف کیا تھا اور بابا جان تو خوشی سے بے حال ہو گئے۔

"تم سچ کہہ رہے ہو ہادی؟" ان کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"کیا متین زبیری سے جھڑپ والی بات؟ آف کورس بابا جان!"

"اُفوہ متین زبیری کو گولی مارو۔" وہ جھنجلائے۔

"ماردی!" اس نے مسکراہٹ دبائی۔

"سنعیہ تمہیں واقعی اچھی لگنے لگی ہے۔" وہ "فوراً" سے پیشتر تصدیق چاہتے تھے۔

"لگتا تو یہی ہے بابا جان! لیکن میں نہیں چاہتا کہ وقتی پسندیدگی کے تحت کوئی قدم اٹھالوں۔ مجھے ابھی کچھ وقت چاہیے' زندگی کے اتنے بڑے فیصلے یوں اچانک نہیں ہوتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ لڑکی واقعی خاص ہے یا مجھے خاص لگنے لگی ہے یا پھر شاید یہ آپ کی برین واشنگ کا اثر ہے۔ آئی ایم ٹوٹلی کنفیوزڈ۔" اس نے سچائی سے اپنے دل کی کیفیت بتا ڈالی۔

"کچھ وقت گزرنے دو' تمہارے دل کے جذبے خود بخود واضح ہو جائیں گے۔" انہوں نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیٹس سی۔" ہادی نے کندھے اچکا دیے تھے۔

* * *

آج ہمایوں کی مہندی تھی۔ ہمایوں نہ صرف اس کا بہترین دوست تھا' بلکہ اس کے مرحوم والد بابا کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھے۔ یہ ہی دوستی اگلی نسل میں منتقل ہوئی تھی۔ نوشابہ آنٹی' ہمایوں' تانیہ' فراز پوری فیملی سے اس کی بے حد بے تکلفی تھی اور مہندی کے فنکشن کو فضولیات گردانے کے باوجود وہ ان سب کے بے حد اصرار پر یہاں آنے پر مجبور ہوا تھا' البتہ بابا جان نے مہندی کے فنکشن کو بچوں کا فنکشن کہہ کر شرکت سے معذرت کرلی تھی۔ ہاں شادی اور ولیمہ میں ان کی شرکت لازمی تھی۔

اس وقت ہمایوں ولا کے وسیع وعریض لان میں رنگ و بو کا سیلاب اُمڈا ہوا تھا۔ ہمایوں اس وقت اسٹیج پر بیٹھا اپنے سسرالیوں کے نرغے میں تھا۔ وہ دور بیٹھا اس کی درگت بنتے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اچھا بھلا فارن کوالیفائیڈ انجینئر گلے میں پیلا دوپٹہ ڈالے عجیب بغلول لگ رہا تھا۔

"ہنس لیں ہنس لیں ہادی بھائی! یہ وقت کبھی نہ کبھی آپ پر بھی آئے گا۔" تانیہ نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔ ہمایوں کی چھوٹی بہن تانیہ اسے بھی بہنوں کی طرح ہی عزیز تھی۔

"ایسی حماقتیں میری پرسنالٹی سے میچ نہیں کرتیں یار! ہم صرف شادی اور ولیمہ کا فنکشن منعقد کر کے سنت مسنونہ پوری کریں گے۔" وہ ہنسا تھا۔

"گریٹ ڈویلپمنٹ ہادی بھائی! آج پہلی بار آپ کے منہ سے شادی کا نام سنا' گویا شادی پر راضی ہو گئے ہیں آپ۔" تانیہ چہکی تھی' وہ اس کی چالاکی پر ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے سامنے نگاہ پڑی تو مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔

وہ سوفی صد سنعیہ ہی تھی مگر اس محفل میں اس کی موجودگی نے اسے حیران کر دیا تھا۔ اس نے تانیہ کو مخاطب کر کے اس سے پوچھنا چاہا تھا مگر اس سے پہلے ہی تانیہ کسی کے پکارنے پر چلی گئی تھی۔

ہادی دوبارہ سنعیہ کی جانب متوجہ ہوا' وہ کافی مختلف اور پیاری لگ رہی تھی۔ ہادی کو عموماً" لڑکیوں کے حلیے اور ڈریسنگ سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا' کسی لڑکی کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھنے کے بعد بھی وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے' لیکن سنعیہ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر اس کو پتا چل گیا تھا کہ وہ آج زرد رنگ کے جوڑے میں ملبوس ہے۔ اس کے بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا اور ہاتھوں میں گجرے' ہادی نے چند سیکنڈوں میں ہی اس کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا' اس کی مختصر ترین تعریف یہ ہو سکتی تھی' خوب صورت مگر باوقار' بابا کی پسند کا جواب تھی۔ وہ اتنی دیر کس لیے کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا' تھوڑی ہی دیر میں وہ منظر سے غائب ہو گئی تھی' ہادی کو تقریب کے رنگ ماند لگنے لگے۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تلاشنے کے بجائے ہادی نے تقریب سے رخصت ہونے میں ہی بہتری جانی۔ ویسے بھی رات کافی بیت چکی تھی' اس نے اسٹیج پر جا کر ہمایوں سے "اظہار ہمدردی" کیا پھر رخصت کی اجازت چاہی۔

"ٹھیک ہے یار! مصروف بندے ہو' نہیں روکتے تمہیں۔" ہمایوں اٹھ کر گلے ملا تھا۔

"جا رہے ہو بیٹا؟" اتنے میں نوشابہ آنٹی بھی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ادھر آنکلیں۔

"جی آنٹی! اب چلوں گا۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"ممّا! یہ فراز کا بچہ جانے کہاں چلا گیا۔ عینی آپی کو چھوڑنے جانا تھا۔" اتنے میں ہی تانیہ بولتے ہوئے قریب آئی تھی۔

"تو ہادی ڈراپ کردے گا نا عینی کو' راستے میں ہی تو پڑے گا عینی کا گھر۔" نوشابہ آنٹی نے اطمینان سے کہا تھا اور وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ رات کے اس پہر جانے کس محترمہ کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری سونپی جا رہی تھی۔

وہ انکار کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہا تھا کہ نوشابہ آنٹی نے کسی کو پکار بھی لیا۔

"عینی' عینی بیٹا!" اور چند لمحوں بعد جو صورت قریب آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہادی کو آج کی تاریخ میں حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا تھا۔

"السلام علیکم سر!" سنعیہ کی بھی اس پر نگاہ پڑ گئی تھی' جب ہی سلام کیا' پھر نوشابہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہاں بیٹا! میں کہہ رہی ہوں کہ تم ہادی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں' یہ ڈراپ کردے گا تمہیں۔" نوشابہ آنٹی کو سنعیہ کے سلام کرنے پر حیرت نہیں ہوئی تھی گویا وہ جانتی تھیں کہ سنعیہ اسی کے آفس میں کام کرتی ہے۔ لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ وہ نوشابہ آنٹی کی فیملی اور سنعیہ کے تعلق سے کیوں واقف نہ تھا۔ آج سے پہلے اس نے سنعیہ کو کبھی ان کی فیملی تقریبات میں نہیں دیکھا تھا اور نوشابہ آنٹی کے کہنے پر سنعیہ کے چہرے پر ایک لمحے کو تذبذب کے آثار نمودار ہوئے تھے لیکن پھر اس نے سرہلا کر اقرار کرلیا۔

نوشابہ آنٹی اور تانیہ سے گلے مل کر وہ ہادی کی ہمراہی میں آگے بڑھ گئی تھی۔

* * *

گاڑی سبک خرامی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ایڈریس بتانے کے بعد سنعیہ نے چپ سادھ لی تھی۔ ویسے بھی اس روز والے واقعے کے بعد سنعیہ آفس میں بھی چپ چاپ کام کیے جاتی۔ بے تکلفی تو خیر پہلے بھی کبھی نہ تھی لیکن اب اس کی خاموشی میں جھلکتی خفگی ہادی کو زیر لب مسکرانے پر مجبور کردیتی تھی۔ اگر بابا کی خواہش کے مطابق اس لڑکی سے کوئی رشتہ استوار ہوا تو روٹھنے منانے کے سلسلے کی پریکٹس کرنی پڑے گی۔ اپنے پہلو میں سنعیہ کی موجودگی آج بہت سے لطیف احساسات کو بیدار کر رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد سفر کا اختتام ہوا تھا۔

ہادی نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی۔

سناٹے اور تاریکی کی وجہ سے اس نے فوراً" ہی گاڑی بھگا لے جانا مناسب نہ سمجھا سنعیہ بیل دے کر گیٹ کھلنے کی منتظر تھی اور ہادی اس کے اندر جانے کا۔ دو تین منٹ کے انتظار کے بعد گیٹ کھل گیا تھا۔ ہادی نے مطمئن ہو کر گاڑی اسٹارٹ کردی لیکن حیرت انگیز طور پر سنعیہ دروازے کے اندر جانے کے بجائے واپس پلٹی۔

"امی کہہ رہی ہیں' آپ چائے پی کر جائیے گا۔" ہادی کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ کہنا تو چاہتا تھا کہ بی بی لگتا ہے آپ کی امی نے یہ مینرز آپ کو نہیں سکھائے۔

وہ مسکراتے ہوئے گاڑی سے اترا' سنعیہ کی امی سے ملنے میں کوئی حرج تو نہ تھا۔ اس کے پیچھے گھر میں داخل ہو کر اس نے دائیں طرف کھڑی خاتون کو سلام کیا تھا' وہ یقیناً" سنعیہ کی امی تھیں۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو۔" انہوں نے بہت شفقت سے سلام کا جواب دیا۔

"میں نے ابھی نوشابہ کو فون کیا تھا اس نے بتایا عینی کو ہادی ڈراپ کرے گا' میں نے سوچا چلو اس بہانے تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے تو بہت مصروف بندے ہو تم' آنے کی فرصت نکالنا مشکل ہے۔"

وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی تھیں اور اب ہنستے ہوئے اس سے مخاطب تھیں۔ ان کے بے تکلف انداز پر ہادی نے حیرت سے انہیں دیکھا اور اندر روشنی میں آنے کے بعد اسے اس مانوس لب و لہجے والی شخصیت کے نقوش کھوجنے میں چند پل بھی نہ لگے تھے۔

"آمنہ آنٹی!" وہ خوش گوار حیرت میں گھر گیا۔

"پہچان لیا؟" وہ مسکرائیں۔

"آپ کو تو پہچان لیا لیکن حیرت ہو رہی ہے کہ میں ان محترمہ کو نہیں پہچان پایا۔" وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

"چودہ' پندرہ سال کم عرصہ تو نہیں ہوتا' تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بچپن کی عینی اور اب کی سنعیہ کو پہچاننے میں غلطی کر جاتا۔ بلکہ اگر عینی بھی تمہیں کہیں سرراہ دیکھتی تو ہرگز نہ پہچان پاتی۔ ماشاء اللہ کتنے بڑے ہو گئے ہو تم۔ بالکل رضا بھائی کی جوانی کا عکس۔" وہ اسے محبت سے دیکھتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

"لیکن آپ بہت بوڑھی ہو گئی ہیں آمنہ آنٹی! اتنی کمزور' مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

"تمہارے سکندر انکل کے انتقال کے بعد میں نے اتنی تو ہمت کرلی کہ زندگی کو گھسیٹ کر یہاں تک لے آئی۔ اگر عینی نہ ہوتی تو جینے کی کوئی امید ہی نہیں بچی تھی۔" آمنہ آنٹی کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

ہادی ایک لمحے کو چپ ہو گیا' اس کے ذہن کے پردے پر سولہ' سترہ برس پہلے والی آمنہ آنٹی کی شبیہ لہرانے لگی۔ خوب صورت' اسمارٹ' زندہ دل اور ہنس مکھ ان کی اور سکندر انکل کی بے مثال جوڑی تھی ٹوٹ کر محبت کرتے تھے دونوں' اسے سکندر انکل شدت سے یاد آئے۔ بابا کے عزیز از جان دوست' انہیں بچھڑے ایک مدت بیت گئی تھی پھر بھی بابا کی یادوں میں وہ زندہ تھے۔

"بچے جوان ہو جائیں تو ماں باپ بوڑھے ہی لگتے ہیں۔" اسے سوچوں میں گم دیکھ کر آمنہ آنٹی نے مسکرا کر پھر مخاطب کیا۔ وہ بھی جیسے ایک دم چونکا۔

"ناقابل یقین سی بات ہے آمنہ آنٹی! آخر آپ کی آمد مجھ سے کیوں چھپائی گئی اور کہاں ہے وہ آپ کی چالاک بیٹی۔ کتنا عرصہ اس نے مجھے بے وقوف بنائے رکھا۔" اس نے اردگرد نگاہ دوڑا کر سنعیہ کو کھوجنا چاہا۔

"ان بلیوایبل۔" (ناقابل یقین) اس نے ایک بار پھر خود کلامی کے سے انداز میں سر جھٹکا تھا۔ "سنعیہ مجھ سے اتنی اجنبی اور انجان بن کر کیوں ملی آمنہ آنٹی! آپ لوگوں کی آمد کو خاص طور پر میرے لیے ہی راز کیوں رکھا گیا۔ ابھی ہم احد انکل کی طرف سے آرہے ہیں۔ وہ لوگ بھی باخبر ہیں۔ بابا بھی یقیناً" سب کچھ جانتے تھے لیکن انہوں نے بھی مجھے صرف یہ ہی بتایا تھا کہ سنعیہ ان کے کسی مرحوم دوست کی بیٹی ہے۔ سکندر انکل! "کسی مرحوم دوست" کی فہرست میں نہیں آتے تھے آمنہ آنٹی! جن کا نام میری یادداشت سے محو ہونے کی بنا پر بابا نے ان کا تذکرہ ضروری نہ سمجھا ہو۔ سکندر انکل تو بابا کے بھائیوں جیسے دوست تھے۔ ان کے انتقال حتیٰ کہ آپ لوگوں کے ابوظہبی شفٹ ہونے کے باوجود بھی بابا نے ہمارے سامنے یادوں کے سہارے انہیں ہمیشہ زندہ رکھا۔ میرے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے آفس میں کام کرنے والی سنعیہ درحقیقت سکندر انکل کی عینی ہے۔ سچ بتاؤں تو سکندر انکل کی عینی میرے ذہن میں ہمیشہ سات' آٹھ برس کی عینی ہی آتی تھی' اس کا اصل نام سنعیہ تو شاید ڈاکومنٹس کے لیے ہی تھا۔ میرے ذہن سے یہ نام محو ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنی شناخت مجھ سے کیوں چھپائی؟"

وہ حیران تھا قدرے ناراض اور الجھا ہوا بھی۔ ذرا دیر پہلے آمنہ آنٹی کو اچانک دیکھ کر ملنے والی خوشی پر خفگی کا رنگ غالب آرہا تھا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں ہادی! بہت لمبی ناک ہے میری بیٹی کی۔ وہ ہرگز کسی سفارش کے بل پر جاب حاصل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ وہ تو رضا بھائی سے بھی اس بات پر بھی ناراض ہو گئی تھی کہ انہوں نے اسے تمہارے سامنے اپنے کسی دوست کی بیٹی بھی ظاہر کیوں کیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر وہ اپنی پہچان ظاہر کردے گی تو اسے اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع نہیں ملے گا۔ سکندر کا حوالہ اس کے لیے خود بخود آسانیاں پیدا کردے گا۔"

"اور آپ اور بابا جان بھی اس کی بے وقوفی میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔" اس نے کچھ خفگی سے انہیں دیکھا۔

"مجبوری تھی بیٹا! ایک بات ہم نے اس کی مانی تو ایک اسے ہماری ماننی پڑی۔ ہمیں یہ تو اطمینان ہو گیا کہ تمہارا اخبار ہی جوائن کر رہی ہے ورنہ جیسی سرپھری اور جذباتی وہ ہے' جانے اس کی بے وقوفیوں کے کیا نتائج ہمیں بھگتنے پڑتے۔" آمنہ آنٹی کے کہنے پر وہ مسکرا دیا' وہ خود بھی تو اسے اس کی بے وقوفیوں سمیت بھگت رہا تھا۔ "لیکن آج جب مجھے پتا چلا کہ تم اسے چھوڑنے آرہے ہو تو مجھ سے رہا نہیں گیا' آخر کب تک تم سے نہ ملتی۔" آمنہ آنٹی نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں سنعیہ بھی چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔ ہادی نے ایک نگاہ اس کے خفا سے چہرے پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس پیاری سی لڑکی سے کتنا قریبی تعلق نکل آیا تھا لیکن گزرے ہوئے ماہ و سال نے اتنا تو فاصلہ پیدا کر ہی دیا تھا کہ وہ بے تکلفی سے اسے عینی کہہ کر مخاطب نہ کر پایا۔

"جی تو مس سنعیہ! آپ سمجھ رہی تھیں کہ آپ کی شناخت مجھ سے چھپی رہے گی؟" اس نے ہادی کو چائے کا کپ تھمایا تو وہ اسے مخاطب کرنے سے خود کو روک نہ پایا۔ وہ جیسے زبردستی مسکراتے ہوئے چپ چاپ ماں کے پہلو میں جا کر بیٹھ گئی۔

"اتنے عرصے تک میں آپ کے کالم پڑھ کر ناحق متاثر ہوتا رہا۔ اب پتا لگ رہا ہے کہ آپ کا طرز تحریر کچھ جانا پہچانا سا کیوں لگتا تھا' بالکل سکندر انکل جیسا انداز' وہی اسلوب' فقروں میں ویسی ہی کاٹ۔ اب پتا چلا کہ اس میں آپ کا تو کوئی کمال نہیں بلکہ یہ تو سکندر انکل کی طرف سے آپ کو وراثت میں ملی صلاحیت ہے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا کچھ بولنے پر اکسا رہا تھا۔

"اگر آپ کو میرے طرز تحریر میں ابو کی جھلک ملتی ہو تو اٹس آ کمپلیمنٹ فار می سر!" سنعیہ نے اس کا داؤ الٹ دیا تھا۔

وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑا' آمنہ آنٹی بھی مسکرا دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات گئے وہ گھر لوٹا تھا' بابا کے کمرے میں جھانکا' وہ

کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔

"ٹائم دیکھا ہے آپ نے، اب تک سوئے کیوں نہیں۔" اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"ہاں بس سونے ہی لگا تھا۔ تم سناؤ بہت دیر لگادی، پورا فنکشن بھگتا کر آئے ہو کیا؟" بابا نے حیرانی سے استفسار کیا، اپنے بیٹے کی طبیعت کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ ایسے ہنگاموں سے اس کی جان جاتی تھی۔

"نہیں بابا! فنکشن سے تو جلد ہی اٹھ گیا تھا، پھر عینی کو چھوڑنے گھر چلا گیا وہاں آمنہ آنٹی سے گپ شپ میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" اس نے نارمل سے انداز میں جواب دیا تھا، لیکن بابا کا چونکنا فطری امر تھا۔

"اوکے بابا! گڈ نائٹ آرام کریں، رات بہت ہوگئی ہے میں بھی خاصا تھک چکا ہوں، اب سوؤں گا۔"

اس سے پیشتر بابا کوئی بات کرتے انہیں بولنے کا موقع دیے بغیر ہی وہ پلٹ گیا تھا۔ اس کا یہ نارمل انداز شدید ترین خفگی کا مظہر تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر کھجانے لگے۔ اب باقی رات بیٹے کو منانے کا طریقہ سوچنا تھا۔

* * *

رضا، احد اور سکندر تینوں بہت گہرے دوست تھے۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی، وقت گزرنے کے ساتھ دوستی کا رشتہ مزید اٹوٹ ہوگیا۔ حالانکہ تینوں کی فیلڈز بالکل الگ تھیں۔ احد سول سروس میں چلے گئے۔ رضا کے والد پبلشر تھے، رضا نے کاروبار میں نیا تجربہ کیا، مقامی سطح پر اخبار کا اجرا کیا جو جلدی ہی قومی سطح پر چھپنے لگا تھا اور سکندر تو خیر بھرپور شباب میں ملک کی جانی پہچانی شخصیت بن گئے تھے۔ تین خوش قسمت دوستوں کی ٹولی میں وہ عزت اور شہرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئے تھے۔ کھرے، نڈر اور بے باک صحافی لیکن اپنے وطن سے محبت کے معاملے میں حد سے زیادہ جذباتی، جس اخبار میں جاتے اس کی سرکولیشن بڑھ جاتی مگر ڈیکلریشن منسوخ ہونے کا خطرہ ہو جاتا سو حکومتی دباؤ پر اخباری مالکان عوام کے اس ہر دل عزیز لکھاری کو اخبار بدر کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ رضا نے بہت دفعہ انہیں اپنے پاس بلایا مگر وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتے۔

"دوستی کو آزمائش میں ڈالنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔"

"تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں۔" رضا انہیں آنکھیں دکھاتے۔

"تم پر تو ہے خود پر نہیں، تھک گیا ہوں یار! جوانی میں جوش تھا، کچھ کر گزرنے کا جذبہ لیکن اب گھٹن بہت بڑھ گئی ہے، مایوسی چاروں طرف سے گھیر رہی ہے۔ امید کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا۔"

وہ آئیڈیلسٹ تھے، ملک کے جن حالات کو سدھارنے کا عزم لے کر قلم تھاما تھا ہر کوشش، ہر کاوش، رائیگاں جاتی دیکھ کر دل برداشتہ ہوتے جارہے تھے۔

کتنے برسوں سے وہ ملک کے بنیادی ستونوں سے جو کھی لڑ رہے تھے۔ کبھی طنز و مزاح کا سہارا لے کر کبھی کاٹ دار انداز میں، کبھی انتہائی دردمندی سے ملک کی باگ دوڑ سنبھالنے والے ہاتھوں کو سمجھا رہے ہوتے ان کے قلم نے انہیں عوام کے دلوں کی دھڑکن تو بنا دیا تھا لیکن "خواص" کے لیے وہ درد سر بنتے جارہے تھے۔ رضا اور احد دونوں انہیں سمجھانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے رہتے۔

"دیکھو میاں! تم جو اپنی لیلیٰ کے لیے مجنوں بنے پھر رہے ہو، اس میں اتنی شدت پسندی ٹھیک نہیں۔" احد انہیں سمجھاتے۔ "لیلیٰ" سے ان کی مراد پاکستان ہوتا تھا۔

"ملک کے حالات ٹھیک ہونا، صحیح قیادت ملنا، نظریاتی طور پر اسے درست ڈگر پر چلانا، نئی نسل کو نظریۂ پاکستان سے روشناس کروانا، بہت غور طلب مسائل ہیں اور تم اپنے طور پر اپنا فرض ادا کر رہے ہو۔ لیکن خدا کے لیے اتنی ٹینشن نہ لیا کرو۔"

"اور میں تو کہتا ہوں کہ تم جیسے دانش ور جو گیلی لکڑی کی طرح سلگتے رہتے ہیں، یہ محض ناشکری کی علامت ہے۔ جب اپنا پیٹ بھرا ہوا ہو تو بندہ ادھر ادھر کے مسائل پر سوچ بھی سکتا ہے اور کڑھ بھی سکتا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کیا کرو اتنی اچھی بیوی ملی جو تم جیسے خبطی انسان کے ساتھ گزارا کر رہی ہے۔ اتنی پیاری بیٹی ہے۔ اگر گھریلو سکون نصیب نہ ہوتا تو کاہے کو ملک کے مسئلوں کو لے کر آدھی آدھی رات تک ٹہلتے سگریٹ پھونکتے۔" رضا بھی ان پر گرم ہوتے۔

"کہتے تو تم صحیح ہو۔" وہ بہت محبت سے آمنہ اور عینی کو دیکھتے۔

"ویسے آمنہ بھابھی! اپنے شوہر پر کڑی نگاہ رکھا کریں۔ کہتا تو یہ اپنے آپ کو بڈھا ہے لیکن اس کی ڈاک چیک کریں لڑکیاں مرتی ہیں اس پر۔" رضا انہیں چھیڑتے۔

"میری بیوی کو ورغلاؤ مت، یہ جانتی ہے میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" سکندر ہنستے ہوئے ان سے مخاطب ہوتے۔

"جی! میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میں دنیا کی واحد بیوی ہوں، جس کو لو میرج کرنے کے باوجود شادی کی پہلی رات یہ سننے کو ملا کہ تم میری دوسری محبت ہو۔" آمنہ مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے شکوہ کرتیں۔

سب ہنس پڑتے۔ جانتے تھے سکندر کی پہلی محبت کون ہے اور سکندر خان اپنی اسی پہلی محبت پر قربان ہوگئے تھے۔

بظاہر یہ ایک کار حادثہ تھا لیکن ان کے چاہنے والوں کو یقین ہی نہ آسکتا تھا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ جس انداز میں ان کی کار کو ٹکر ماری گئی تھی۔ شفاف تحقیقات کی جاتیں تو شاید ملکی سطح پر ایک بڑے کرپشن اسکینڈل کے مرکزی ملزمان تک کھرے جا ملتے رضا اور احد نے تو سازش بے نقاب کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن آمنہ نے ساتھ نہ دیا۔

"رضا بھائی! میں اپنا سہاگ کھو چکی ہوں، مزید کچھ کھونے کی ہمت نہیں۔" وہ غموں سے چور چور تھیں۔

پھر کچھ ہی عرصے بعد وہ اپنے والد کے پاس ابوظہبی چلی گئی تھیں ایک ہنستا بستا گھر یوں اجڑا تھا جیسے کبھی روئے زمین پر اس کا وجود ہی نہ تھا۔ رضا نے بچھڑے دوست کی یادوں کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔

زندگی یوں ہی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ کبھی مذاق مذاق میں ایک دوسرے کو بڈھا کہنے والے سچ مچ بوڑھے بوڑھے سے لگنے لگے لیکن جب اولاد جوان اور سعادت مند بھی ہو تو بوڑھے وجود میں بھی جوانوں جیسی توانائیاں بھر جاتی ہیں۔ ان کا اثاثہ ان کا بیٹا ہادی رضا ان کی ساری ذمہ داریاں بخوشی اپنے کندھوں پر منتقل کرچکا تھا۔ چند برس پہلے اپنی رفیقہ حیات کو کھونے کے بعد دونوں باپ بیٹا ہی ایک دوسرے کے لیے سب کچھ تھے۔

احد کے بچے بھی جوان ہوچکے تھے اور وہ بھی بہت قابل نکلے تھے لیکن احد بھی اولاد کی خوشیاں دیکھنے سے پہلے ہی دل کے دورے کے باعث دنیا سے منہ موڑ گئے۔

تین دوستوں کی تکون تو کب کی ٹوٹ چکی تھی، لیکن اتنے پیاروں کی جدائی کا صدمہ سہنے کے بعد رضا کا خود بھی زندگی پر سے اعتبار اٹھنے لگا تھا۔ وہ جلد از جلد ہادی کا گھر بسا کر اس کی خوشیاں دیکھنا چاہتے تھے اور ویسے بھی عملی زندگی کی ذمہ داریوں سے فراغت پاکر ان کے پاس کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ پوتے، پوتیاں کھلانے کی خواہش ہر گزرتے دن کے ساتھ قوی سے قوی تر ہوتی جارہی تھی، لیکن ہادی تھا کہ ہمیشہ سنی ان سنی کر دیتا۔ رضا جانتے تھے کہ وہ اپنے لیے لڑکی پسند کرنے کی فرصت بھی نہیں نکال پائے گا، سو یہ ذمہ داری انہوں نے از خود اپنے کندھوں پر منتقل کرلی، لیکن سچ تو یہ تھا کہ بیسیوں لڑکیوں کو اس نظر سے دیکھنے کے باوجود کوئی بھی لڑکی انہیں اپنے قابل بیٹے کے قابل نہ لگی، وہ بہت سلجھا ہوا شخص تھا اور یقیناً "کسی بہت پیاری اور سلجھی ہوئی لڑکی کا حق دار تھا۔ اپنی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد جب وہ مایوس ہونے

لگے تو قدرت ان کی مدد کو آئی۔

پندرہ برس بعد ان کے عزیز از جان دوست کی بیٹی ان کے سامنے تھی۔ سنعیہ سکندر خان، جو ان سب کی پیاری عینی تھی۔

کل کی بات لگتی تھی، جب وہ سرخ و سپید رنگت والی گول مٹول سی بچی جو اپنے رضا انکل کے کندھے سے جھول کر اپنی فرمائشیں پوری کراتی تھی۔ اپنے جگری دوست کی بیٹی کو، اس کی نشانی کو اتنے برسوں بعد اپنے سامنے دیکھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے برسوں پرانے منظر پھرنے لگے تھے۔ کتنی بڑی، کتنی پیاری ہو گئی تھی، اس کی شخصیت میں وہی وقار اور تمکنت تھی جو ان کے بچھڑے دوست کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

ابوظہبی میں اتنے برس گزارنے کے بعد آمنہ بیٹی کو لے کر بالآخر وطن لوٹ آئی تھیں۔ ان کے شفیق والد طبعی عمر گزار کر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ بھائی اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن تھے۔ والد اپنی جائیداد کا بڑا حصہ بیٹی اور نواسی کے نام منتقل کر گئے تھے۔ جس کی وجہ سے بھائیوں کے رویے میں مزید بیگانگی اتر آئی تھی۔ اجنبی سرزمین ہر گزرتے دن کے ساتھ اجنبی ترین ہوتی جا رہی تھی، پھر عینی تھی جس کو وطن کی محبت وراثت میں ملی تھی۔ جیسے جیسے وہ شعور سنبھالتی گئی، وطن واپسی کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ آخر عینی کی ضد اور حالات کے جبر کے تحت آمنہ پھر پاکستان آ گئی تھیں۔ والد کے ترکے میں ملے ہوئے مکان میں منتقل ہونے اور از سر نو اس سرزمین پر سیٹ ہونے میں انہیں کس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑتا، اگر احد کی بیگم نوشابہ، ان کے بچوں اور خصوصاً" رضا صاحب کا تعاون شامل حال نہ ہوتا۔

رضا نے ہادی سے ان کی آمد چھپائی تو صرف اور صرف سنعیہ کی ضد کی وجہ سے۔ وہ سکندر کے حوالے کے بغیر اپنی صلاحیتیں منوانا چاہتی تھی اور رضا اس پیاری سی بیٹی کی بات ٹال نہ سکے۔ اس روشن پیشانی والی بچی کو انہوں نے تصور ہی تصور میں کئی بار ہادی کے پہلو میں کھڑا کر کے دیکھا تھا اور ہر بار یہ خوش کن تصور ان کے دل کو بے پناہ مسرتوں سے ہمکنار کر دیتا۔ وہ اگر سکندر کی بیٹی نہ ہوتی تب بھی ایک آئیڈیل لڑکی تھی اور اب تو اس کی ذات سے جڑا حوالہ ہی اتنا مضبوط تھا کہ انہیں اپنے عزیز بیٹے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی نہ لگتی۔ انہیں ہادی کی توجہ اس کی جانب مبذول کروانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ وہ اتنی پیاری شخصیت رکھتی تھی کہ ہادی کا دل بھی خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگا تھا اور اب وہ موقع آن پہنچا تھا کہ رضا ہادی کو حقیقت حال سے باخبر کر دیتے کہ وہی ہوا، جس کا انہیں خدشہ تھا۔

احد کے بیٹے ہمایوں کی شادی میں ہادی پر حقیقت کھل گئی تھی، وہ خفا تھا۔ بے حد خفا اور یہ خفگی اس کا حق تھی، لیکن رضا جانتے تھے کہ یہ عارضی خفگی بہت جلد دور ہو جائے گی اور اگلی صبح ناشتے کی میز پر انہوں نے بیٹے کو منانے کا آغاز کر دیا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اتنے عرصے تک آپ نے اس کی شناخت مجھ سے چھپائے رکھی، آخر کیوں بابا!" بہت دیر تک خاموشی سے منہ پھلائے رکھنے کے بعد آخر اس کی خفگی پر افسوس کا رنگ غالب آگیا تھا۔

"مجبوری تھی یار! اس نے تمہارے اخبار کو جوائن کرنے کی واحد شرط یہ ہی رکھی تھی اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ میرے مرحوم دوست کی واحد نشانی کسی مشکل یا مصیبت میں گرفتار ہو۔ وہ جذباتی ترین شخص کی اولاد ہے اور بالکل اپنے باپ کا پرتو۔ میں اسے کہیں اور کیسے بھیج جا سکتا تھا اور پھر جلد یا بدیر تمہیں پتا لگنا ہی تھا۔ میں نے سوچا، چلو اس بہانے تمہاری یادداشت کا امتحان ہو جائے۔"

"جی اور بری طرح فیل ہو گیا ہے آپ کا بیٹا یادداشت کے اس امتحان میں۔" وہ چڑ گیا۔ بابا جان ہنس پڑے تھے۔

"بالکل بدل گئی ہے بابا!" اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"بہت پیاری ہو گئی ہے نا۔" وہ شرارت سے مسکرائے۔

"پیاری تو خیر بچپن میں بھی بہت تھی۔" اس نے ان کی شرارت بھری نگاہیں قصداً" نظر انداز کی تھیں۔

"پھر اس پیاری لڑکی کی ماں سے بات کر لوں تمہارے لیے؟" وہ گھما پھرا کر بات وہیں لے آئے، ہادی ہنس پڑا تھا۔

"آپ ہتھیلی پر سرسوں جما کر دم لیں گے بابا! ابھی مجھے تھوڑا سا تو وقت دیں، اس شاک سے سنبھلنے دیں کہ سنعیہ در حقیقت عینی ہے۔ آمنہ آنٹی اور سکندر انکل کی عینی۔ جس کو بچپن میں دیکھا کرتا تھا، تب وہ دو پونیاں بنائے فراک پہنے گڑیا سے کھیلتی تھی۔ ذہن کو یہ ساری صورت حال قبول کرنے کے لیے ذرا سا تو وقت دیں۔" وہ رسانیت سے بولا۔

"اب ایسی بھی کوئی انوکھی صورت حال نہیں ہے جس کو تمہارا ذہن قبول نہیں کر رہا، لیکن چلو خیر جیسے تمہاری مرضی۔" بابا نے گویا ہتھیار ڈال دیے تھے۔

* * *

"اور سنائیے رضا بھائی! اب آپ ہادی کی شادی کے لڈو کب کھلا رہے ہیں۔" نوشابہ آنٹی بابا سے مخاطب تھیں۔ آج ہمایوں کا ولیمہ تھا۔ تقریب میں سب ہی شریک تھے، جب نوشابہ نے رضا کی توجہ اس جانب مبذول کروائی۔

"کیا پوچھتی ہیں بھابھی! کب سے اس نالائق پر زور ڈال رہا ہوں میری مانے بھی تو۔ مجھے تو لگتا ہے اپنے دوستوں کے پاس جانے کی باری بس آنے والی ہے۔ پوتے، پوتیاں کھلانے کی خواہش لیے ہی رخصت ہو جاؤں گا۔" انہوں نے زبردستی کے جذبات خود پر طاری کیے۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں رضا بھائی! اللہ آپ کو سلامت رکھے اور اولاد کی خوشیاں دکھائے۔" سب سے پہلے آمنہ ہی اس جذباتی گفتگو کے اثر میں آئیں۔

"رضا بھائی کہہ ٹھیک رہے ہیں۔ بچے ہمارے سمجھانے میں کب آتے ہیں۔ ہمایوں کو دیکھیے پچھلے تین چار سال سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ شادی کے لیے ہاں کر دے۔ ہمیشہ ٹال مٹول کرتا رہا، لیکن جب خود کو لڑکی پسند آ گئی تو تین مہینے بھی صبر نہ ہو سکا۔ جھٹ پٹ شادی کروالی۔" نوشابہ کے لہجے میں ہلکا سا گلہ جھلک رہا تھا۔

ہادی کو ہنسی آگئی، دل ہی دل میں ہمایوں کی بیوی پر ترس بھی آیا۔ نوشابہ آنٹی ذرا تیکھے مزاج کی خاتون تھیں۔ آثار بتاتے تھے کہ وہ ٹھیک ٹھاک قسم کی ساس ثابت ہوں گی۔

"بس بھابھی! بچے دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کے اپنے فیصلے، اپنی پسند، اپنی مرضی چلتی ہے۔" بابا جان نے بھی نوشابہ آنٹی کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"واقعی بچے تو دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو جاتے ہیں۔" نوشابہ آنٹی نے ان کی تائید کی اور اسی لمحے ان کی نگاہ کچھ فاصلے پر کھڑی سنعیہ پر پڑی تھی، ان کے لبوں پر پیار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اور بچیاں دیکھتے ہی دیکھتے کتنی پیاری ہو جاتی ہیں۔ ماشاء اللہ اپنی عینی کو دیکھیے۔" نوشابہ آنٹی کے کہنے پر سب نے ہی اس جانب دیکھا تھا۔

ہادی کی اس سے آج سلام دعا ہو چکی تھی۔ کچھ دیر آمنہ آنٹی اور بابا کے پاس بیٹھنے کے بعد اسے ثانیہ نے اپنی دوستوں سے ملوانے کے لیے بلا لیا تھا۔ اب بھی وہ ثانیہ کی کزنز اور دوستوں کے پاس کھڑی تھی۔ ہادی چند لمحوں کے وقفے سے نگاہیں اس کی طرف اٹھانے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔ اس کے چہرے پر کتنی ملائمت، کتنی معصومیت، کتنی پاکیزگی تھی۔ پتا نہیں وہ باقی لڑکیوں سے واقعی مختلف تھی یا صرف اسی کو لگ رہی تھی، لیکن اب نوشابہ آنٹی بھی تو کچھ اسی قسم کی بات کر رہی تھیں۔ وہ واقعی سب سے پیاری، سب سے مختلف تھی۔ سنعیہ پر ایک اور نگاہ ڈالنے کے بعد ہادی کو اعتراف کرنا پڑا تھا۔

"اور ہاں آمنہ بھابھی! اس روز مہندی کی تقریب

میں تو آپ آئی نہیں تھیں‘ میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ انی مسز بیگ بہت دلچسپی لے رہی تھیں عینی میں۔ آج ابھی تک وہ نظر نہیں آئیں‘ ورنہ میں ملواتی آپ کو ان سے‘ کیا ہینڈسم ہے ان کا بیٹا‘ سی ایس ایس کرکے فارن سروس میں گیا ہے‘ اسی کے لیے لڑکی ڈھونڈتی پھر رہی ہیں‘ کوئی ایسی ویسی لڑکی تو ان کی ناک کے نیچے آتی بھی نہیں‘ لیکن انی عینی....."

نوشابہ آنٹی جانے کیا کچھ بتا رہی تھیں‘ ہادی نے بے چین ہو کر پہلو بدلا‘ اسی لمحے بابا پر نگاہ پڑی‘ وہ بھی آنکھوں میں خفگی سموئے اسی کو تک رہے تھے۔ واقعی مزید دیر کرنا مناسب نہ تھا‘ وہ دل ہی دل میں بابا کی بات سے متفق ہو گیا تھا۔

* * *

"پلیز بابا! مجھے دو چار دن کی مہلت مزید دے دیں‘ اس سے پہلے آپ آمنہ آنٹی سے بات کریں‘ میں خود ایک بار سنعیہ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ اتنا عرصہ باہر رہی ہے‘ وہاں کسی دوست‘ اپنے کسی کزن سے اس کی کوئی کمٹمنٹ تو نہیں۔"

گھر آکر حسب توقع بابا نے یہ ہی موضوع چھیڑا تھا‘ جب اس نے رسانیت سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ذرا سی مہلت چاہی تھی۔

"تم اس پر شک کر رہے ہو‘ وہ بچی ہرگز ایسی نہیں۔" بابا جان کو غصہ آگیا تھا اور ان کی بات سن کر اسے ان سے زیادہ غصہ آگیا تھا۔

"کیسی بات کر رہے ہیں آپ بابا۔ میں اس پر شک نہیں کر رہا‘ محض اپنا اطمینان چاہ رہا ہوں کہ کہیں انجانے میں سنعیہ کے ساتھ زیادتی نہ ہو جائے۔ آمنہ آنٹی آپ کے احترام اور لحاظ میں یہ رشتہ جوڑ دیں‘ جبکہ سنعیہ اس پر راضی نہ ہو۔ شادی زندگی بھر کا بندھن ہے اور یہ معاملے یکطرفہ پسندیدگی سے طے نہیں کیے جاتے۔"

"اچھا بابا‘ کرلو اپنی تسلی‘ لیکن جو کچھ پوچھنا ہے جلد پوچھ ڈالو۔" اگر بیگ صاحب نے اپنے بیٹے کے لیے پیام ڈال دیا تو آمنہ بھابھی سوچ میں پڑ جائیں گی‘ بہت قابل اور لائق ہے ان کا بیٹا۔" بابا جان نے اسے جتایا۔

"میں بھی کچھ اتنا نالائق نہیں سر۔" وہ کچھ خفا ہو گیا‘ بابا جان ہنس پڑے تھے۔

* * *

اور دو‘ چار دن کی مہلت گزرے بھی چار‘ چھ دن ہو چکے تھے۔ وہ اب تک سنعیہ سے اس موضوع پر بات نہ کر پایا تھا‘ روز آفس میں آمنا سامنا ہوتا تھا‘ لیکن اتنا خود اعتماد سا بندہ اس معاملے میں خود کو لاچار پاتا تھا۔ دل میں مضمون باندھنے لگتا‘ مگر سنعیہ کے صبیح چہرے پر نظر پڑتے ہی الفاظ گم ہو جاتے۔

بابا کئی بار استفسار کر چکے تھے اور وہ خجالت سے سر کھجا کر رہ جاتا‘ لیکن آج اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا‘ چاہے کچھ بھی ہو جائے‘ وہ سنعیہ سے دوٹوک بات کرے گا اور جانے وہ کیا پوچھنے آئی تھی کہ ہادی نے اسے روک لیا۔

"رکیے سنعیہ! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"جی سر! کہیے۔" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"شاید آپ کو لگے کہ میں پرسنل ہو رہا ہوں‘ لیکن اگر آپ کچھ دیر کے لیے بھول جائیں کہ میں آپ کا باس ہوں‘ اگرچہ آپ نے صرف یہ ہی تعلق استوار کر رکھا ہے‘ پھر بھی ہمارے فیملی ٹرمز مد نظر رکھے جائیں تو میں ایک انتہائی ذاتی نوعیت کا سوال پوچھنا چاہوں گا۔" اس نے بے ربط سی تمہید باندھی۔

"پوچھیے سر!" وہ ذرا سا مسکرائی تو ہادی کی ہمت بندھی تھی۔

"آپ کہیں کمیٹڈ تو نہیں؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔ سنعیہ نے فوراً" نفی میں گردن ہلا دی۔ چند لمحوں کے لیے ہادی کو اگلی بات نہ سوجھ سکی۔

"اب میں جاؤں سر؟" سنعیہ نے کچھ لمحوں کے انتظار کے بعد پوچھ ڈالا۔

"سنعیہ! ہر انسان کے ذہن میں لائف پارٹنر کے لیے ایک خاکہ ہوتا ہے‘ آپ کے ذہن میں کوئی خاص سوچ‘ کوئی خاکہ....." ہادی نے سنعیہ کا سوال سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر! میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا تھا۔ ہادی نے نکارا بھرا۔ چند لمحوں کے لیے دونوں کے بیچ پھر خاموشی در آئی تھی۔ سنعیہ اس کے اگلے سوال کی منتظر تھی۔

"یہ جاب آپ کا پیشن ہے سنعیہ۔ ایم آئی رائٹ؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ایبسلیوٹلی رائٹ سر۔" مختصر جواب آیا۔

"کوئی ایسا شخص جس کی ہمراہی میں آپ قلم سے تعلق توڑے بغیر....."

وہ جانے کس بات کی تمہید باندھ رہا تھا۔ مدھم سی مسکراہٹ نے سنعیہ کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ ہادی کی زیرک نگاہوں سے وہ مسکراہٹ پوشیدہ نہ رہ پائی تھی‘ اس سے پہلے وہ کسی قسم کا استفسار کرتا‘ سنعیہ نے اپنا گود میں دھرا ہاتھ اس کے سامنے کیا تھا۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں خوب صورت سی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہادی کا دماغ الجھ گیا۔

"کل شام رضا انکل ہمارے گھر آئے تھے۔ کچھ دن پہلے انہوں نے امی کے سامنے آپ کا پروپوزل پیش کیا تھا اور کل شام میری رضامندی جان لینے کے بعد انہوں نے مجھے یہ انگوٹھی پہنا دی۔" اس نے اطمینان سے آگاہ کرتے ہوئے ہاتھ دوبارہ پیچھے ہٹا لیا۔ ہادی کی اپنی باندھی ساری تمہیدیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔

"اب میں جاؤں سر؟" وہ بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"جی۔" ہادی اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا تھا۔

* * *

"بہت دیر سے آئے بیٹا! آج صابر نے کمال کر دیا‘ ایسا شان دار ڈنر تیار کیا ہے کہ کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے‘ بس جلدی سے فریش ہو جاؤ‘ میں کھانا لگواتا ہوں۔" آفس سے واپسی پر بابا اس سے مخاطب تھے۔

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے سپاٹ سے انداز میں جواب دیا‘ بابا نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے‘ کچھ خفا خفا سے لگ رہے ہو۔"

"کیوں‘ کیا خفا ہونے کا حق بھی نہیں مجھے۔" وہ مزید روکھا ہوا۔

"حق تو ہے‘ مگر وجہ بھی تو پتا چلے۔" بابا نے رسانیت سے پوچھا۔

"کل آپ آمنہ آنٹی کے ہاں گئے تھے۔"

"اوہ....." بابا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی‘ بیٹے کی خفگی کی ساری وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔

"ہاں بس اتفاقاً" کل شام وہاں چلا گیا تھا۔"

"اور اتفاقاً" ہی میرا رشتہ پیش کر دیا۔" اس نے ناراضی سے پوچھا۔

بابا نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گویا اس کی بات سے مکمل اتفاق ہو۔

"اور اتفاقاً" ہی آپ کی جیب سے انگوٹھی بھی برآمد ہو گئی‘ جو آپ نے جھٹ سے سنعیہ کی انگلی میں پہنا بھی دی۔" اس نے طنز کیا۔ بابا اس بار اپنی ہنسی نہ روک پائے۔

"اچھا تو ساری ناراضی اس بات پر ہے کہ انگوٹھی میں نے کیوں پہنائی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

"پلیز بابا ہنسیے مت‘ آپ کو نہیں پتا کہ آج مجھے آپ پر کتنا شدید غصہ آیا تھا۔ سنعیہ کو اپنے آفس بلا کر آدھے گھنٹے تک بات کی تمہید باندھتا رہا اور آخر میں اس نے مزے سے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ آگے کرکے دکھا دیا۔ سخت چغد محسوس کر رہا تھا‘ میں اس وقت اپنے آپ کو۔" اسے وہ وقت یاد کر کے نئے سرے سے خفت محسوس ہوئی تھی۔

"غلطی واقعی میری ہے‘ لیکن تم خود سوچو میں کب تک تمہارے آسرے پر بیٹھا رہتا‘ وہاں مسز بیگ باقاعدہ رشتہ مانگنے آنے والی تھیں اور تمہیں سنعیہ کی

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

رضامندی درکار تھی۔ اس کی رائے جانے بغیر تم کوئی فیصلہ نہ کرپا رہے تھے' تو بس اس کی رائے میں نے جان لی۔ اس نے آمادگی دکھائی' تب ہی انگوٹھی پہنا کر آیا ہوں اسے۔" بابا نے اسے تسلی دی تھی۔

"بڑی مہربانی آپ کی۔" وہ جل کر بولا تھا۔

"اچھا اب چہرے کے بگڑے زاویے درست کرلو' تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا' لوگوں کو پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"

"جی کیونکہ سب کے بابا آپ کی طرح کو آپریٹو جو نہیں ہوتے۔" اس بار وہ بھی ہنس پڑا تھا۔

کچھ بھی تھا سنعیہ کا خود سے منسوب ہونے کا تصور اتنا خوش کن تھا کہ زبردستی کی طاری کی گئی خفگی رخصت کرنی پڑ گئی' بابا نے بھی اس کی بات سن کر جاندار قہقہہ لگادیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آمنہ آنٹی نے آج ہمایوں اور اس کی نئی نویلی دلہن کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا' احد انکل کی فیملی کے ساتھ بطور خاص اسے اور بابا کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ بات طے ہونے کے بعد وہ پہلی بار آمنہ آنٹی سے ملنے جارہا تھا۔ اپنی ڈریسنگ پر آج اس نے خصوصی توجہ دی تھی' تیار ہوکر آیا تو بابا نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے توصیفی کلمات سے نوازا تھا۔

"آپ کا بیٹا ہوں' ڈیشنگ تو لگنا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے تعریف وصول کی۔

آمنہ آنٹی کے ہاں پہنچا تو انہوں نے بہت محبت سے پیشانی چوم کر دعا دی تھی۔

"تقریب کے دولہا تو تم لگ رہے ہو۔" ہمایوں نے بھی اسے دیکھتے ہی ہنس کر چھیڑا تھا۔

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ متلاشی نگاہیں سنعیہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر کولڈ ڈرنکس پیش کرنے کے لیے وہ نمودار ہو ہی گئی۔ ہلکے رنگ کے اسٹائلش سوٹ میں وہ اپنے معمول کے سادہ سے حلیے کے برعکس کچھ مختلف اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"السلام علیکم سر۔" نگاہوں کا تصادم ہوا تو سنعیہ کو سلام کرتے ہی بنی ورنہ اس کی مسکراتی نگاہوں سے آج وہ کچھ کنفیوز ہو رہی تھی۔

"ابھی بھی سر! حد ہے عینی!" ہمایوں نے اسے ٹوکا۔

"ہمایوں بھائی پلیز!" اس نے آنکھوں میں التجا سمو کر اسے دیکھا' گویا مزید چھیڑ چھاڑ سے باز رکھنا چاہ رہی ہو' لیکن آج تو سب ہی بہت موڈ میں تھے۔ ہمایوں' اس کی بیوی رداجو چند ملاقاتوں میں ہی سنعیہ کی بہت اچھی دوست بن چکی تھی۔ اور تو اور اس سے چند برس چھوٹی تانیہ بھی۔ سب ہی مستقل ہلکے پھلکے انداز میں دونوں کو چھیڑنے میں لگے ہوئے تھے۔

ہادی تو خیر یہ سب بہت انجوائے کررہا تھا۔ مگر سنعیہ کی جان پر بن آئی تھی۔ کہاں پرسوں آفس میں وہ گھبرایا گھبرایا سا تمہیدیں باندھ رہا تھا اور سنعیہ لطف لے رہی تھی' لیکن آج معاملہ بالکل برعکس تھا' وہ آفس والا سنجیدہ مزاج سا ہادی تو لگ ہی نہ رہا تھا۔ اس کی لو دیتی آنکھیں مسلسل سنعیہ کو گھیرے ہوئے تھیں۔ بہت حاضر جوابی سے وہ ہمایوں وغیرہ کے فقرے لوٹا رہا تھا' بڑوں کی محفل دوسرے کمرے میں جمی تھی' شاید اسی لیے سب اتنے چہک رہے تھے۔

اللہ اللہ کرکے ڈنر اختتام کو پہنچا تھا اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ مہمان بس اب رخصت ہوا چاہتے ہیں' رضا انکل نے ایک اور شوشا چھوڑ دیا۔

"آج سب لوگ اکٹھے ہیں' آمنہ بھابھی کیا خیال ہے' منگنی کی باضابطہ رسم نہ ادا کرلی جائے۔" اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا ابھی چار دن پہلے تو وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر گئے تھے' لیکن آمنہ نے بھی اقرار میں سرہلا کر خوش دلی سے رضامندی دے دی تھی۔

"لیکن انکل۔" وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال ایک اور نفیس سی انگوٹھی برآمد کرچکے تو اس نے ہچکچا کر ان سے کچھ کہنا چاہا۔

"عینی آپی! آپ کو کیا اعتراض ہے' بیٹھے بٹھائے دو

قیمتی انگوٹھیوں کی مالک بن رہی ہیں۔" تانیہ نے اس کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔

"ہاں عینی! ایک ہی بندے کے نام کی دو انگوٹھیاں پہننا شرعی اور قانونی طور پر جائز ہے۔" ہمایوں نے بھی مسکراہٹ دباتے ہوئے چھیڑا۔

"او ہادی! وہاں کھڑے کیا منہ دیکھ رہے ہو۔" رضا صاحب نے بیٹے کو پکارا۔

"جی بابا۔" وہ فرماں برداری کے ریکارڈ توڑتا قریب آیا تھا۔

انہوں نے اسے انگوٹھی تھماتے ہوئے سنعیہ کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس کی تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی۔ سنعیہ کو گردن جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہ بچا تھا۔ ہادی کے کلون کی مہک اطراف میں پھیل گئی تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھ چکا تھا۔ تانیہ موبائل ہاتھ میں پکڑے ان کے بالکل سامنے تصویر اتارنے تیار بیٹھی تھی، لیکن اس کے بار، بار کہنے کے باوجود سنعیہ سے گردن نہ اٹھائی گئی۔

"شرماتے ہوئے اچھی لگ رہی ہیں آپ۔" ہادی نے دھیرے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہناتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

مبارک سلامت کا شور مچ گیا تھا۔ سنعیہ دل کی دھڑکن سنبھالنے میں ناکام ہوئی جارہی تھی۔ محض چند دن پہلے جب رضا انکل ہادی کا پروپوزل لے کر آئے تھے تو آمنہ کی بے پناہ خوشی اور طمانیت دیکھ کر اس نے ہاں کردی تھی۔ اس کے دل کے اوراق بالکل کورے تھے، ماں اس کے مستقبل کے حوالے سے کتنی پریشان رہتی تھی، وہ بخوبی آگاہ تھی، پھر زندگی کسی نہ کسی کے ساتھ تو بسر کرنی تھی۔ ہادی دیکھا بھالا تھا۔ اتنے دن اس کے ساتھ گزارنے کے بعد بھی اس کی شخصیت کی کوئی ایسی خامی سامنے نہ آئی تھی، جس کو بنیاد بنا کر وہ انکار کرتی، پھر اس کی سب سے بڑی اضافی خوبی یہ تھی کہ وہ رضا انکل کا بیٹا تھا۔ رضا انکل جو اس کے پاپا کے عزیز ترین دوست تھے اور پاپا کے حوالے سے ہی وہ اسے کتنا عزیز رکھتے تھے، بالکل ایک شفیق کی باپ کی طرح۔ سنعیہ نے ماں کے فیصلے پر دل کی آمادگی کے ساتھ سر جھکایا تھا، لیکن چار دنوں میں ہی دل کی آمادگی بڑھ کر پسندیدگی بن گئی تھی اور اب ہادی کے پہلو میں بیٹھے بیٹھے تو دل دھڑک کر ایسے شور مچا رہا تھا کہ وہ خود بھی حیران تھی، شاید جب سے اس نے ہادی کی آنکھوں میں اپنے لیے مچلتے جذبے دیکھے تھے تو دل کے کورے کاغذ پر محبت کی تحریر ابھرنے لگی تھی، کچھ بھی تھا وہ خوش تھی اور بے انتہا مطمئن۔

* * *

وہ جانے اس سے کیا معاملہ ڈسکس کرنے آئی تھی، لیکن ہادی کی متبسم نگاہیں مسلسل اس پر مرکوز تھیں۔ پتا نہیں وہ دھیان سے اس کی بات سن بھی رہا تھا یا نہیں۔

"آپ مجھے کنفیوز کررہے ہیں سر!" آخر اس نے روہانسی ہو کر اسے ٹوک ہی دیا۔

"میری بات سنو سنعیہ! اگر آئندہ تم نے مجھے سر کہا تو میں یہ پیپر ویٹ اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گا۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ وہ بے چارگی سے بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اچھا بتایئے کیا پوچھ رہی تھیں۔" ہادی کو جیسے اس پر ترس آگیا۔ سنعیہ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے دوبارہ مسئلہ اس کے گوش گزار کیا تھا۔

"تم نے میری پہنائی ہوئی انگوٹھی کیوں اتار دی۔" وہ چپ ہوئی تو ہادی نے پوچھا تھا۔ اس بار سنعیہ کا جی چاہا اس کا یا اپنا کسی ایک کا سر پیٹ لے۔

"اچھا سوری بھئی، ویسے ہی ایک بات پوچھ لی تھی، ناراض کیوں ہو رہی ہو۔" ہادی کو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہنسی آگئی تھی۔

"ہادی! پلیز آفس کے ڈسپلن کا خیال رکھیں اور جہاں تک انگوٹھیوں کی بات ہے تو میں بیک وقت دو انگوٹھیاں پہن کر آفس نہیں آسکتی، باری لگالوں گی۔ آج رضا انکل والی انگوٹھی پہنی ہے، کل آپ والی پہن آؤں گی۔" اس نے کچھ خفگی، کچھ سنجیدگی سے

جواب دیا تھا اور پہلی بار اس کے لبوں سے اپنا نام سن کر ہادی کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا، لیکن سامنے بیٹھی لڑکی کے تیور اتنے خطرناک سے تھے کہ خوشی کے اظہار کو دل میں دباتے ہوئے اسے سنجیدگی سے اس کی بات سننی پڑی تھی، اگرچہ دل آفس کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ مگر دماغ کے ڈانٹنے پر دل کو اپنی ہی باتیں کرنے کی خواہش سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔

* * *

آج بہت دنوں بعد آفس میں ماہین ہمدانی کی آمد ہوئی تھی۔ کچھ عرصے تک وہ میگزین ایڈیٹر کے طور پر یہاں کام کرچکی تھی۔ اس کے والد ریٹائرڈ بیورو کریٹ تھے۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جتنا عرصہ یہاں کام کیا کام سے زیادہ ہادی میں دلچسپی لیتی رہیں موصوفہ۔ ہادی کے خشک رویے سے دل برداشتہ ہو کر اس نے نوکری ہی چھوڑ دی تھی۔ آج کل ایک نجی چینل پر فیشن اور اسٹائل پر ایک پروگرام کی میزبانی کررہی تھی اور اس وقت بھی وہ جس طرح ٹائٹ جینز پہنے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ہادی کے عین سامنے براجمان تھی، تو وہ سوچے بنا نہ رہ پایا کہ اب وہ بالکل صحیح فیلڈ میں قسمت آزمائی کرنے گئی ہے۔

"بہت دن ہوگئے تھے آپ سے ملاقات کیے ہوئے۔ آج میری ریکارڈنگ کا آف تھا، میں نے سوچا، آج آپ سے ہائے ہیلو کرلی جائے۔"

"آپ کے آنے کا شکریہ! لیکن شاید میرا سیل نمبر ہے آپ کے پاس۔" اس نے بہت شائستگی سے باور کروادیا تھا کہ ہیلو ہائے ٹیلی فون پر بھی کی جاسکتی تھی۔

ماہین ہمدانی نے واضح طور پر پہلو بدلا تھا۔ اس بندے کا یہی گریز، یہی رکھائی جہاں اس کے دماغ کا میٹر گھمانے کا باعث بنتی تھی، وہیں اس ناقابل حصول چیز کی کشش کچھ مزید بڑھ جاتی تھی۔

"نمبر، ہاں نمبر تو تھا میرے پاس لیکن جانے پرانی سم کہاں ڈال دی۔ دراصل فینز اتنا تنگ کرتے ہیں کہ آئے روز سم بدلنی پڑ جاتی ہے۔" اس نے تراشیدہ بالوں میں نزاکت سے انگلیاں چلاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں واقعی آج کل کی ینگ جنریشن کے پاس فالتو ٹائم بہت ہوتا ہے۔" ہادی نے سر ہلا کر جیسے اس کی بات کی تائید کی۔

اسی لمحے سنعیہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ماہین ہمدانی سے کوئی شناسائی نہ ہونے کے باوجود سلام کرکے اخلاقیات نبھائی تھی، پھر ہادی سے کوئی بات پوچھی تھی۔ جتنی دیر تک سنعیہ اور ہادی نے بات کی تھی، ماہین مسلسل سنعیہ کا جائزہ لینے میں مصروف رہی تھی۔

"اتنے خوب صورت چہرے جانے اخبار کے دفتر میں کیا کررہے ہیں۔" سنعیہ کے کمرے سے جانے کے بعد ماہین نے خود کلامی سی کی تھی۔ ہادی نے اس پر صرف ایک نگاہ غلط ڈالنے پر اکتفا کیا۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس لڑکی کو اپروچ کرلوں۔ ہمیں فریش چہروں کی بڑی تلاش رہتی ہے اور میرے پروگرام میں ایک سگمنٹ کچھ اسی ٹائپ کا ہے، ہم ایسے نئے چہرے سامنے لاتے ہیں جو گرومنگ کے بعد سپر ماڈل تک بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ لڑکی فیس اور فگر کے لحاظ سے مجھے بہت فوٹو جینک لگی ہے۔" ماہین ہمدانی نے اس بار اپنے مطلب کی ایک نارمل سی بات کی تھی، اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہ بات ہادی کو اتنی ناگوار گزرے گی۔ اس کے ماتھے پر ابھرتی شکنیں ماہین کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائی تھی۔

"آپ شاید مائنڈ کرگئے۔"

"میں نے تو کیا مائنڈ کرنا ہے، اگر یہ آفر آپ سنعیہ کو کرتیں، تب آپ کو پتا چلتا کہ مائنڈ کرنا کسے کہتے ہیں۔" ہادی نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر طاری کرتے ہوئے اسے جتایا تھا۔

"ارے نہیں، یہ آپ کا وہم ہے ہادی! آپ کو کیا پتا کہ آج کل کی لڑکیاں ایسی آفرز کو کتنی خوش دلی سے قبول کرتی ہیں۔" ماہین نے اسے ہنستے ہوئے جھٹلایا تھا۔

”اپنے اپنے رجحان اور ذوق کی بات ہے ماہین! ضروری نہیں کہ ٹی وی اسکرین پر نظر آنا آپ کی طرح ہر لڑکی کا خواب ہو اور کم از کم سنعیہ کا تو ہرگز نہیں، اس کا انٹلیکچوئل لیول عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے، مجھے تو زندگی میں پہلی بار اتنی جینئس لڑکی سے واسطہ پڑا ہے اور آپ کی نظر سے شاید کبھی سنعیہ کا کالم نہیں گزرا، ورنہ آپ کی رائے بھی مجھ سے مختلف نہ ہوتی۔“

ہادی نے کتنے آرام سے اسے یعنی ماہین ہمدانی کو جو ایک مشہور سیلیبریٹی بنتی جا رہی تھی کو عام لڑکیوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا۔ وہ تلملائے بغیر نہ رہ پائی تھی۔ لیکن چہرے پر یہ تلملاہٹ ظاہر نہ ہونے دی تھی، بلکہ ایک بہت دلکش مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ہادی کو مخاطب کیا تھا۔

”میں نے پہلی بار آپ کے منہ سے کسی لڑکی کی تعریف سنی ہے، خیریت تو ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں ہادی کو مخاطب کیا تھا، شاید مقصد اسے مزید تپانا تھا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہادی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے کے بجائے مسکراہٹ سے نوازا تھا۔

”لڑکی اگر منگیتر بھی ہو تو اس کی تعریف کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے مس ماہین۔“ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا اور ماہین ہمدانی کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہونے میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا تھا۔

* * *

وہ اس وقت رضا انکل کے کچن میں کھڑی اپنی ڈش کو اختتامی شکل دے رہی تھی۔ کتنی بار رضا انکل اس سے شکوہ کر چکے تھے کہ وہ کبھی بھی گھر نہیں آتی۔

”بیٹے اور کچھ نہیں تو کم از کم کبھی کبھار آ کر اس صابر کو ہی کچھ پکانا سکھا جایا کرو۔ جب تک تم رخصت ہو کر نہیں آتیں کھانا تو صابر کے ہاتھ کا ہی ہے، لیکن سچ کہوں تو جب سے آمنہ بھابھی اور تمہارے ہاتھ کا کھانا شروع کیا ہے، صابر کے کھانے مزید بدمزا لگتے ہیں، حلق سے نیچے ہی نہیں اترتے۔“

انکل کے کہنے پر وہ ہر بار مسکرا کر ہامی بھر لیتی، لیکن ابھی تک یہ وعدہ وفا کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ آفس کے بعد ہادی بھی سیدھا گھر ہی جاتا تھا اور اس کی موجودگی میں وہ وہاں جانے کی ہمت نہ کر پائی تھی۔ لیکن آج ہادی کا شیڈول ایسا تھا کہ وہ باآسانی رضا انکل سے ملنے جا سکتی تھی۔ ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کے بعد اس نے ایک ایم پی اے کے بھائی کی دعوت ولیمہ بھی اٹینڈ کرنی تھی، یعنی اس کی واپسی رات گئے متوقع تھی۔ اس نے آمنہ کو فون کر کے بتا دیا کہ آفس سے وہ سیدھی رضا انکل کے جائے گی۔

حسب توقع رضا انکل اس کی سرپرائز آمد پر بے پناہ خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی صابر کو اس کے لیے پرتکلف سی چائے کے اہتمام کا آرڈر دیا تھا۔

”نہیں انکل! چائے کی بالکل طلب نہیں ہے، البتہ بھوک لگ رہی ہے۔ میں کچن میں جا کر کچھ مزے دار سا تیار کرتی ہوں پھر دونوں مل کر ڈنر کریں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

”میرے بیٹے کو جب علم ہو گا کہ میں نے آتے کے ساتھ ہی تمہیں کچن میں گھسا دیا تو خوب خفا ہو گا مجھ پر لیکن چلو خیر ہے تمہارے ہاتھ کے مزے دار سے کھانے کے بعد اس کی ڈانٹ کھانا اتنا مہنگا سودا نہیں۔“ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے گویا اسے کچن میں جانے کی اجازت دی تھی۔

وہ ہنستے ہوئے کچن میں آ گئی۔ جو بے تحاشا شفقت اور محبت رضا انکل اس پر لٹاتے تھے کچھ اس کا بھی تو فرض تھا، انہیں خوش کرنا اور سچ تو یہ تھا کہ وہ خود ان سے بے حد محبت کرنے لگی تھی، وہ اسے پاپا کا دوسرا روپ لگتے تھے۔ ان کی تنہائی کا اسے بخوبی احساس تھا۔ اگر ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید رومانٹک ہونے والے اپنے منگیتر کا خیال دامن گیر نہ ہوتا تو وہ ہر دوسرے تیسرے دن رضا انکل سے گپ شپ لگانے آ سکتی تھی۔ آفس سے بمشکل دس منٹ لگتے تھے

یہاں آنے میں لیکن ہادی کی موجودگی کی وجہ سے جھجک آڑے آ جاتی تھی۔ آج چونکہ ہادی کی غیر موجودگی یقینی تھی، سو وہ اطمینان سے یہاں آ گئی۔

ضرورت کی ہر چیز فریج سے برآمد ہو گئی تھی، صابر سے مسالوں وغیرہ کے بارے میں تھوڑی سی رہنمائی لے کر اس نے اسے بھی کچن سے بھیج دیا۔ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے، آستینیں موڑے وہ بہت مگن ہو کر کھانا پکا رہی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے میں رضا انکل پانچ چھ بار آ کر کچن میں جھانک چکے تھے۔

”اتنی مزے کی خوشبو آ رہی ہے، کچھ چکھا ہی دو۔“ ان کے منہ میں پانی بھر بھر آ رہا تھا۔

”آپ ڈائننگ ٹیبل پر جا کر بیٹھیں، میں ابھی کھانا لگاتی ہوں۔“ اس نے انہیں اطمینان دلایا، لیکن دو منٹ بعد ہی قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دی۔ رضا انکل سے واقعی صبر نہ ہو رہا تھا، اسے ہنسی آ گئی۔

”یہ لیں جناب! کھانا واقعی تیار ہو گیا اور میرے حساب سے تو سب کچھ بالکل پرفیکٹ بنا ہے۔ اگر آپ کو بھی پسند آیا تو آپ سے منہ مانگی چیز لوں گی۔“ اس نے بہت مان اور بے تکلفی سے انہیں مخاطب کیا تھا۔

”سب سے قیمتی چیز، میرا دل تو لے ہی چکی ہیں آپ، مزید کیا لینا چاہتی ہیں۔“ متبسم لہجے پر اس نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ سینے پر ہاتھ لپیٹے بہت محبت بھری نگاہوں سے وہ اسے تک رہا تھا۔

”میں سمجھی رضا انکل ہیں۔“ وہ قدرے بوکھلائی۔

”اگر رضا انکل ہوتے تو ان کا بھی تو چھ فٹ کا بیٹا اپنے قابو میں کر بیٹھی ہیں، اب اور کیا چاہیے؟؟“

”آپ کو تو اس ٹائم عطا الٰہی صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی میں موجود ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے ہادی کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔

”خاتون! میرے آفس میں کام کرنے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں آپ۔ میرا ٹائم ٹیبل اگر آپ کے علم میں ہوتا ہی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ میری غیر موجودگی غنیمت جان کر یہاں کا رخ کریں۔ آفس میں کوئی کام کی بات کرنے نہیں دیتیں اور اب گھر آئی ہیں تو وہ بھی چھپکے سے۔“

”آپ کے شکوے میری سمجھ سے باہر ہیں ہادی!“ سنعیہ کو ہنسی آ گئی۔

”بہت اچھا لگ رہا ہے، تمہیں یوں اپنے گھر میں دیکھ کر۔“ ہادی نے بہت محبت اور محویت سے اسے دیکھا تھا۔

”اچھا بس اب راستہ دیں، انکل کو بہت بھوک لگی تھی، میں میز پر کھانا لگا رہی ہوں۔“ سنعیہ نے اپنے دل کی منتشر ہوتی دھڑکن سنبھالی تھی۔ ہادی مسکراتے ہوئے ایک طرف ہٹ گیا، لیکن دل میں سوچ لیا تھا کہ بابا سے کہے گا کہ وہ اس پیاری سی لڑکی کو اس گھر میں مستقل طور پر لانے کا بندوبست کریں۔

* * *

”پھر سنعیہ کیا سوچا ہے آپ نے؟ سوچ لیں ایسے گولڈن چانس بار بار نہیں ملتے۔“ اپنے بالوں میں مخصوص اسٹائل سے انگلیاں چلاتے ہوئے یہ ماہین ہمدانی تھی جو اس وقت سنعیہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔

”دیکھیں ماہین! میں فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکتی، مجھے سوچنے کا ٹائم چاہیے۔“ اس نے رسانیت سے کہا۔

”سوچنے کا ہی تو ٹائم نہیں ہے مس سنعیہ! ہمیں جلد از جلد ایک اینکر پرسن کی ضرورت ہے۔ صباحت گل کو ہم نے بمشکل دو، چار پروگراموں کے لیے روک رکھا ہے۔ مہینے کے آخر میں ان کا امریکہ جانا کنفرم ہے۔ آپ کے کالم کی تیکھی زبان، عوام میں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور پسندیدگی ہمیں آپ کی طرف کھینچ لائی، ورنہ ایک چلتا ہوا پروگرام نئے ہوسٹ کو سونپنا بہت بڑا رسک ہے، لیکن ہم یہ رسک لینے کو تیار ہیں۔“ ماہین ہمدانی کے ساتھ بیٹھے آصف شاہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ ٹی وی کا ایک مشہور

پروڈیوسر تھا۔

"آپ کی بات صحیح ہے، لیکن پھر بھی مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا تو ٹائم چاہیے۔" وہ متذبذب تھی۔

"مس سنعیہ! میں آپ کو یہی تو سمجھا رہا ہوں۔" آصف شاہ نے دوبارہ کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن ماہین ہمدانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"او کے سنعیہ! آپ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں، ہمیں ایسی بھی کوئی ایمرجنسی نہیں۔" اس نے مسکراہٹ چہرے پر سجائی تھی۔ سنعیہ بھی سر ہلاتے ہوئے مسکرادی۔

* * *

"میں تمہارے عشق میں ایسی بھی کوئی مری نہیں جا رہی تھی ہادی رضا! عام سے بندے تھے تم، میری نظر نے تمہیں خاص بنا دیا، لیکن ماہین ہمدانی اتنی عام نہیں تھی جتنی تم سمجھ بیٹھے۔ ہاں تمہیں حاصل کرنا چاہا تھا میں نے۔ تمہیں پانے کے لیے، اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے میں نے کوشش ضرور کی تھی، لیکن جانے تمہیں اپنی شخصیت، اپنی وجاہت پر کیسا زعم تھا کہ ماہین ہمدانی کی توجہ اور التفات کو تم نے درخور اعتنا نہ جانا۔ وہ عام سی لڑکی تمہارے لیے خاص الخاص بن گئی، جس کا انٹلکچوئل لیول بہت بلند ہے اور وہ ان عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے، ٹی وی اسکرین پر نظر آنا جن کا خواب ہوتا ہے۔ میرا خود سے وعدہ ہے ہادی رضا! کہ اس لڑکی پر تمہارا بے پناہ مان توڑ کر رہوں گی، چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی حربہ آزمانا پڑے۔"

* * *

"پھر بتایئے نا امی! آپ کا کیا خیال ہے۔" اس نے آمنہ کے سامنے ماہین ہمدانی کا پروپوزل رکھا تھا۔

"میں کیا بتاؤں بیٹا تم اپنے رضا انکل اور ہادی سے مشورہ کرلو۔" آمنہ نے جو رائے مناسب سمجھی دے دی۔

"ظاہر ہے ان سے بھی مشورہ کروں گی، لیکن فی الحال تو میں یہ آفر قبول کرتے ہوئے خود بھی ڈبل مائنڈڈ ہو رہی ہوں، اخبار میں کالم لکھنا اور بات ہے اور کیمرے کا سامنا کرنا میرے لیے کافی مشکل کام ہے، پھر سوچتی ہوں کہ اپنے مقصد کے لیے الیکٹرونک میڈیا کی طاقت استعمال کرنے کا نادر موقع ہے۔ پاپا کے زمانے میں میڈیا آزاد نہیں تھا، لیکن اب میڈیا بہت پاورفل ہے۔ خصوصاً" الیکٹرونک میڈیا اور میں اس کی پاور استعمال کرتے ہوئے حق اور سچ کی جنگ لڑنا چاہتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے بیٹی! تم اس لڑکی کو انکار کردو۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ سیدھا سا پروگرام ہوگا، سیاست دانوں سے انٹرویو وغیرہ کرنے ہوں گے، لیکن بی بی تمہارے ارادے تو خطرناک ہیں۔" آمنہ کے انداز پر اسے ہنسی آگئی تھی۔

"اوہ امی! محاورتاً" کہا ہے، ایسا بھی میں کوئی خودکش دھماکہ نہیں کرنے جارہی۔"

"تمہارے پاپا بھی ایسے ہی محاورے بولتے تھے۔" آمنہ کی آنکھیں مرحوم شوہر کو یاد کرکے نم ہوگئی تھیں۔

"پاپا واقعی بہت جی دار تھے امی! جان ہتھیلی پر رکھ کر جینے والے، لیکن میں ہرگز بھی پاپا جتنی بہادر نہیں۔ شاید لڑکی ہوں اس لیے۔ جان سے زیادہ عزت پیاری ہے۔" اس نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا۔

"اچھا جو بھی ہے، ہادی کی اجازت اور مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرنا۔" آمنہ دور اندیش ماں تھیں۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ وہ واپس آجائیں ان سے پوچھ کر ہی فائنل فیصلہ کروں گی۔" اس نے ماں کو تسلی دی۔ ہادی آج کل ایک سرکاری ڈیلی گیشن کے ساتھ ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کی واپسی پر ہی اس سے تفصیلی بات کرے گی۔ دو، دن بعد اس کی واپسی تھی۔

* * *

آج شام کو کوئی سرکاری مصروفیت نہ تھی۔ اس نے اپنے وفد کے ساتھ خوب سیر سپاٹا کیا تھا، رات گیارہ بجے تھک ہار کر وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچا تھا۔ چینج کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل فون بجنے لگا۔ دوسری طرف ماہین ہمدانی تھی۔

"جی ماہین خیریت کیسے یاد کیا۔" اس نے سنجیدگی اور حیرت سے دریافت کیا۔

"سوری ہادی! آپ کو ڈسٹرب کیا، اصل میں مجھے سنعیہ کا نمبر چاہیے تھا، جو نمبر اس نے مجھے دیا وہ آف جارہا ہے، میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے آپ کے پاس اس کا کوئی دوسرا کانٹیکٹ نمبر ہو تو آپ سے لے لیتی ہوں۔"

"آپ کو سنعیہ کا نمبر کیوں چاہیے؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ سنعیہ نے آپ سے ذکر تو کیا ہوگا، ہماری آفر سے متعلق۔"

"کیسی آفر۔" وہ واقعی الجھ گیا تھا۔

"اوہ یعنی اس نے ابھی تک آپ سے ذکر نہیں کیا۔ دراصل آصف شاہ کو اپنے پروگرام کے لیے ایک اینکر پرسن کی ضرورت ہے، صباحت گل پروگرام کر رہی تھی، لیکن وہ امریکہ جا رہی ہے، شاید مستقل طور پر ہی۔"

"تو پھر؟" ہادی نے ٹھنڈے لہجے میں دریافت کیا۔

"دراصل آصف شاہ بہت متاثر ہوا ہے سنعیہ سے، اس کے کالمز باقاعدگی سے پڑھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ سنعیہ میں نہ صرف پروگرام بہت اچھی طرح چلانے کی صلاحیت ہے بلکہ اس کا سب سے پلس پوائنٹ یہ ہے کہ اس کا چہرہ بہت فوٹوجینک ہے، ایک عجیب سی سادگی اور معصومیت ہے اس میں، آصف کہہ رہا تھا کہ تیز طرار اور خرانٹ قسم کی اینکرز دیکھ کر عوام اوب چکے ہیں سنعیہ کی صورت میں لوگوں کو بالکل فریش چہرہ دیکھنے کو ملے گا، ایک دم پریٹی اور انوسنٹ۔" ماہین ہمدانی بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا چناؤ کر رہی تھی۔ تصور کی آنکھ سے وہ ہادی کا غصے سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ کتنا لطف آرہا تھا اسے اس وقت۔

"سنعیہ نے آپ کو کیا جواب دیا۔" ہادی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ تو تقریباً" راضی ہے، کل جب میں اور آصف شاہ اس کے گھر گئے تھے تو زبانی بات ہوئی تھی، آج اس سے پوچھنا تھا کہ وہ ایگریمنٹ کب سائن کرے گی، لیکن اس کا نمبر ہی آف جا رہا تھا۔"

"سنعیہ کا ایک ہی نمبر ہے، آپ پھر ٹرائی کرلیجیے گا۔" ہادی نے خشک لہجے میں کہہ کر موبائل آف کردیا تھا۔

* * *

"میں نے آپ سے کہا تو تھا کہ ہادی واپس آجائیں تو میں ان سے مشورہ کرکے آپ کو جواب دوں گی۔ فون پر مجھ سے کھل کر بات نہیں ہو پاتی۔ ان شاء اللہ کل وطن واپس پہنچ جائیں گے۔ پھر میں آپ کو بتا دوں گی۔" اس نے رسانیت سے جواب دیا۔

"دیکھو سنعیہ، تم نے انکار کرنا ہے تو کردو۔ ہادی کو بیچ میں کیوں لا رہی ہو، میں جانتی ہوں وہ تمہیں ہرگز اجازت نہیں دے گا۔ وہ میل شاؤنزم پر یقین رکھنے والا شخص ہے، ہرگز نہیں چاہے گا کہ اس کی منگیتر اس کی سرپرستی کے بغیر اپنی الگ سے شناخت بنائے۔"

"ارے نہیں ماہین! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔" سنعیہ ہنس پڑی تھی، جواباً" ماہین اس سے زیادہ زور سے ہنسی۔

"ایسی کوئی بات نہیں، ہادی بہت لبرل شخص ہیں۔" اس نے نرمی سے اس کی تردید کی تھی۔

"اچھا چلو بات کرکے دیکھ لو اس لبرل شخص سے جو کہ میرے خیال میں تو فضول ہی ہے۔ اینی وے مائنڈ مت کرنا، میں لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہیں، جو دل میں ہوتا ہے وہ ہی منہ پر آجاتا ہے۔ ہادی کے متعلق جو رائے تھی وہ میں نے ظاہر کردی، اگر تمہیں برا لگا تو سوری۔"

"نہیں مجھے برا نہیں لگا، لیکن کاش میں آپ کی غلط

فہمی دور کرسکتی۔“

”غلط فہمی میری نہیں ڈیر! تمہاری دور ہوگی‘ اوکے چلتی ہوں‘ ٹیک کیئر۔“ ماہین ہمدانی کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی تھی۔

* * *

ہادی یقیناً گھر پہنچ چکا ہوگا‘ وہ آفس سے واپسی پر سیدھی رضا انکل کے ہاں چلی گئی‘ مقصد رضا انکل اور ہادی سے مشورہ کرنا تھا۔ حسب توقع ہادی گھر پر ہی تھا۔ دونوں باپ‘ بیٹا لان میں چائے پی رہے تھے۔ رضا انکل اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ البتہ ہادی کے تاثرات کچھ عجیب سے تھے‘ بہت سنجیدگی سے اس نے سلام کا جواب دیا تھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ وہ پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

”ہاں طبیعت کو کیا ہونا ہے۔“ اس نے سپاٹ سے انداز میں کہا۔ رضا انکل نے بھی اس کے اس انداز پر گھور کر دیکھا تھا۔ البتہ بولے کچھ نہیں۔ سنعیہ ہادی کو اس کی غیر موجودگی میں ہونے والے دفتری امور سے آگاہ کرنے لگی۔

”ماہین ہمدانی آصف شاہ کو لے کر تمہارے پاس آئی تھی۔“ ہادی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

”جی‘ میں اصل میں آپ سے اور رضا انکل سے اس بارے میں ہی مشورہ کرنے آئی تھی‘ وہ لوگ کہہ......“

”اوکے‘ میرا مشورہ یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے فون کرکے انہیں انکار کردو۔“ ہادی نے جس تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی‘ وہ اس کے انداز پر ششدر رہ گئی۔

”لیکن ہادی! آپ میری پوری بات تو سنیں۔“ اس نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا۔

”تم نے مشورہ مانگا تھا‘ میں نے دے دیا۔“ ہادی کا اس کی بات سننے کا قطعاً کوئی موڈ نہیں تھا۔

”یہ مشورہ نہیں حکم ہے۔“ وہ روہانسی ہوکر بولی۔

”اگر یہ حکم ہے تو تم بھی تو مشورہ مانگنے کی فارمیلٹی پوری کرنے آئی ہو۔ سارے فیصلے تو کرچکی ہو تم۔ کنٹریکٹ سائن کرنے کے لیے کہاں بلایا ہے انہوں نے۔“

”ہادی! یہ تم سنعیہ سے کس لہجے میں بات کررہے ہو؟“ صورت حال کا پوری طرح علم نہ ہونے کے بعد اس بار رضا صاحب نے بیٹے کو ڈپٹ دیا تھا۔

”بابا پلیز! جب آپ کچھ جانتے ہی نہیں تو بولیے بھی مت۔“ وہ غصے کے عالم میں شدید بدلحاظ ہوگیا تھا۔

”میں جارہی ہوں انکل۔“ سنعیہ کی آنکھیں پانی سے لبریز ہوگئی تھی۔ رضا انکل اسے روکتے رہ گئے‘ مگر وہ نہ رکی تھی۔

”آپ جانتے ہیں نا آصف شاہ کس قماش کا آدمی ہے‘ اس کا پروگرام صباحت گل جیسی لڑکی تو کرسکتی ہے جو اس کے سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگائے۔ میں ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ سنعیہ اس جیسے آدمی کا پروگرام کرے‘ اگر اسے کوئی ٹاک شو کرنا ہی تھا تو مجھے کہتی‘ میں کسی معیاری چینل پر کام دلوا دیتا اسے۔ آپ کو اس چینل اور اس بندے کی شہرت کا اچھی طرح علم ہے تو اور محترمہ سارے معاملات خود طے کرکے ایگریمنٹ سائن کرنے لگی ہیں۔“ سنعیہ کے جانے کے بعد وہ بابا کے سامنے برس پڑا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ وہ ایگریمنٹ سائن کرنے لگی ہے؟“ بابا نے تحمل سے پوچھا۔

”آف کورس ماہین ہمدانی سے پتا چلا۔ وہ بھی اسی چینل پر ایک گھٹیا سا پروگرام کررہی ہے‘ کل رات اسی نے مجھے فون کرکے بتایا تھا‘ آج دن میں پھر اسی کا فون آیا تھا۔“

”تم اسے تحمل سے سمجھاتے‘ کیوں نہیں سمجھتی تمہاری بات۔ کتنا روڈلی بی ہیو کیا تم نے اس کے ساتھ‘ وہ بھی میرے سامنے۔“ بابا کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس کے کان مروڑ دیں۔

”سوری بابا! لیکن مجھے غصہ آگیا تھا اس پر‘ میں ملک سے باہر گیا تھا۔ دنیا سے تو نہیں‘ وہ ایک بار فون پر ہی مجھ سے مشورہ کرلیتی‘ میں جانتا ہوں کہ محض ٹی وی اسکرین پر نظر آنا‘ سنعیہ کے لیے کوئی چارمنگ نہیں ہے وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ یہ فورم استعمال کرکے اپنے نظریات اپنی بات زیادہ مؤثر طریقے سے عوام تک پہنچا پائے گی‘ خصوصاً ”پوری پاکستانی یوتھ کے نظریاتی قبلہ کی دوستی کی ذمہ داری محترمہ نے از خود اپنے کندھوں پر عائد کررکھی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ جن لوگوں کو وہ جوائن کررہی ہے ان کا سرے سے کوئی نظریہ ہی نہیں‘ ان کا واحد مقصد پیسہ کمانا ہے اور پھر وہ آصف شاہ ایک نمبر کا بلیک میلر صحافی ہے۔ پہلے جس اخبار سے تعلق تھا تب بھی سیاست دانوں کی کمزوریاں قابو کرکے انہیں پریشرائز رکھتا تھا اور اب ٹی وی پر بھی یہی کام کررہا ہے۔ وہ سنعیہ کو استعمال کرے گا‘ اس کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائے گا‘ اس کے منہ سے اپنی مرضی کی باتیں کہلوائے گا وہ خود کیمرے کے پیچھے ہوتا ہے۔ سنعیہ خوا مخواہ مقتدر حلقوں میں معتوب ٹھہرے گی۔ اس چینل کا کوئی معیار ہے نہ اخلاقی ساکھ۔“ وہ جو بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی گیا۔

”سنعیہ بے چاری کو کہاں ان سب باتوں کا علم ہوگا۔“ بابا کی نظروں میں وہ اب بھی بے قصور تھی۔

”تو میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اسے یہاں کے لوگوں‘ یہاں کی چیزوں کے بارے میں ابھی کچھ علم نہیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو اسے ہوئے نہیں یہاں آئے ہوئے‘ اسے یہاں کے لوگوں کی خصلت کا علم ہی نہیں‘ وہ سب کو اپنی طرح سمجھتی ہے سچا اور کھرا۔“

”تم اسے نرمی سے سمجھاؤ وہ مان جائے گی‘ مجھے تمہاری باتوں سے اتفاق ہے لیکن تمہارے رویے سے اختلاف ہے تم نے بچی کو بہت ہرٹ کیا۔“

”مانتا ہوں۔“ دل کی بھڑاس نکال لینے کے بعد اسے بھی اپنے رویے کی درشتی کا احساس ہوگیا تھا۔

”میں سوری کرلوں گا اس سے۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں بابا کو یقین دہانی کروائی تھی۔

* * *

”اگر ہادی اجازت نہیں دے رہا تو کوئی ضرورت نہیں ایگریمنٹ سائن کرنے کی۔“ آمنہ نے اس دوٹوک انداز میں باور کروادیا تھا۔

”پلیز امی! آپ تو ایسی بات نہ کریں۔ ابھی میری صرف اینگیجمنٹ ہوئی ہے۔ زندگی کے فیصلے فی الحال خود کرنے کا اختیار رکھتی ہوں میں۔“ وہ ہادی کے رویے سے بہت دل برداشتہ ہوئی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی زندگی کا مالک بن بیٹھا ہے۔ پیار‘ محبت کے سابقہ دعوے لفاظی کے سوا کچھ نہ لگ رہے تھے۔

”ہادی کبھی بھی تمہارے لیے غلط نہیں سوچے گا۔ اس کی رائے کا احترام کرو سنعیہ!“ آمنہ اسے سمجھانے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جارہی تھیں۔ وہ اس بار چپ رہی نہ ماں کو تسلی دی کہ وہ ان کی بات مان لے گی اور نہ بات ماننے سے انکار کیا اور آمنہ اس کی خاموشی پر متوحش اور متفکر تھیں۔

* * *

”پھر اپنا فائنل فیصلہ بتاؤ سنعیہ! ہم مزید انتظار نہیں کرسکتے آصف شاہ تو پہلے ہی اتنی دیر کرنے پر تپا پڑا ہے۔ اس نے تمہارے بابا کے حوالے سے چینل پر خبر بھی چلوادی ہے کہ ماضی کے نامور صحافی سکندر خان کی صاحبزادی بہت جلد ہمارا چینل جوائن کررہی ہیں اب اگر تم انکار کروگی تو اس سے ہماری کریڈیبلٹی متاثر ہوگی۔“ ماہین ہمدانی اس پر دباؤ ڈال رہی تھی۔

”دیکھیے ماہین! میرے اقرار سے پہلے آپ لوگوں کو ایسی کوئی خبر چلانی ہی نہیں چاہیے تھی میرا اس میں کوئی دوش نہیں۔“ وہ ماہین ہمدانی کے دباؤ میں نہ آئی تھی۔

”ویل تو تمہاری طرف سے انکار ہے۔“ ماہین ہمدانی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”جی بالکل میرے لیے یہ آفر قبول کرنا مشکل ہے۔ آپ اپنے چینل والوں سے معذرت کرلیجیے

گا۔" سنعیہ کا چہرہ ستا ہوا تھا ماہین ہمدانی نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

"مجھے پتا تھا تمہارا جواب یہی ہو گا ان فیکٹ تمہارے اس کھڑوس منگیتر کی آمد کے بعد تو مجھے یقین تھا کہ تم کبھی بھی ہاں نہیں کرو گی' وہ بہت اروگینٹ (حکم چلانے والا) شخص ہے میں اسے جانتی ہوں اچھی طرح۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ماہین! دراصل مجھے میری مدر نے پرمیشن نہیں دی۔" اس نے ہادی کا بھرم رکھنا چاہا۔

"فار گاڈ سیک سنعیہ! پردے مت ڈالو مجھ سے زیادہ اس بندے کی نیچر کون سمجھتا ہو گا' دوہری شخصیت ہے اس کی۔ مجھے تم سے ایسی باتیں کہنی تو نہیں چاہئیں آخر منگیتر ہے تمہارا لیکن میں کیا کروں چند ملاقاتوں میں ہی تم سے اپنائیت کا عجیب سا رشتہ استوار ہو گیا ہے' یہ جو تمہارے چہرے کی معصومیت ہے اس میں کچھ ایسی کشش ہے' جو ہر کسی کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہادی رضا تم جیسی معصوم اور انوسنٹ لڑکی ڈیزرو ہی نہیں کرتا۔"

"آپ میری تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہیں اور ہادی بھی یقیناً" ایسے نہیں ہیں ان کے متعلق آپ کو اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی ہے' کسی معاملے میں اختلاف رائے ہونا الگ بات ہے لیکن بائے نیچر وہ بہت اچھے انسان ہیں۔" وہ شدید ناراضی کے باوجود ماہین ہمدانی کے سامنے ہادی کی برائی نہ کر پائی۔

"خدا کے لیے سنعیہ! اس بندے کی اتنی تعریفیں کم از کم میرے سامنے نہ کرو۔ اس کا ظاہر باطن کیسا ہے' میں ہی کیا اس کے ساتھ کام کرنے والی ہر لڑکی ہی چند دنوں میں جان جاتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ کوئی بھی لڑکی یہاں ٹک کر کام نہیں کر سکی۔ موصوف پہلے بہت ریزروسی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ویری ڈیسنٹ اینڈ ریزن ایبل پھر جب اعتبار اور احترام کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو اپنی اصلیت دکھاتے ہیں۔ تم مائنڈ مت کرنا لیکن سچ یہی ہے میری یہاں سے جاب چھوڑنے کی وجہ یہ ہی تھی کہ موصوف ڈورے ڈالنے لگے تھے مجھ پر اور جب میں نے حوصلہ افزائی نہ کی تو خار کھانے لگے مجھ سے۔ اللہ جانے تمہارے ساتھ معاملہ منطقی انجام تک کیسے پہنچا شاید تم لوگوں کے فیملی ٹرمز ایسے تھے کہ اسے منگنی کروانی پڑ گئی یا پھر اس نے سوچا کہ کب تک افیئرز لڑا کر کام چلے گا' شادی بھی تو کرنی ہے پھر تم جیسی انوسنٹ لڑکی اور کہاں سے ملتی اسے پریٹی اور بے وقوفی کی حد تک سادہ' جس کی ناک کے نیچے کچھ بھی کرتے رہو اسے پتا نہیں چلتا۔"

ماہین ہمدانی نے اس بار بالکل دوسرا پتا پھینکا تھا اگر دونوں کے درمیان غلط فہمی پروان چڑھ جاتی تو زبردست اور اگر بات چیت کر کے وہ اپنی غلط فہمی دور کر لیتے تو بھی اس کی بلا سے۔ اس نے اپنی طور پر دونوں کو ایک دوسرے سے بدگمان کرنے کی بھرپور کوشش تو کر ڈالی تھی۔

اور سنعیہ کتنی دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"تمہیں یقین نہیں آئے گا سنعیہ!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری "اور یقین آ بھی نہیں سکتا' بہرحال میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں اور ہاں یہ آفر اب بھی برقرار ہے' میں تمہیں سوچنے کا آخری موقع دے رہی ہوں۔ اس بندے کے پیچھے تم اپنے کیریئر کا یہ گولڈن چانس کیوں مس کرو' کل تک مجھے اپنے حتمی جواب سے آگاہ کر دینا۔" وہ کہہ کر اٹھ گئی تھی سنعیہ چپ چاپ اسے جاتا دیکھتی رہی' اتنے میں سامنے سے آتا ہادی اسے دیکھ کر ٹھٹکا تھا ماہین ہمدانی بھی رک گئی۔

"بائی دا وے کس لیے تشریف لائی ہیں آپ؟" اس کی شوخ سے ہیلو کے جواب میں ہادی نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"ایکچوئلی سنعیہ کو ایگریمنٹ کا ڈرافٹ دکھانے آئی تھی۔ ایک دو باتوں سے اسے اختلاف ہے آئی مین سیلری وغیرہ۔۔۔ میں نے کہا چلو شام کو تمہارے گھر آ کر ڈسکس کر لوں گی یا وہ میرے دفتر آ کر سائن کر دے گی' فی الحال تو مجھے اپنی ریکارڈنگ پر پہنچنا ہے میں آل ریڈی کافی لیٹ ہو چکی۔"

وہ ایک ادا سے بائے کہہ کر کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی تھی۔ ہادی سیدھا سنعیہ کے کیبن میں جا پہنچا' وہ اس سے سوری کرنے اور سمجھانے کے ارادے سے اس کے پاس ہی آ رہا تھا لیکن اس لڑکی کی خود سری نے اس کا دماغ الٹ دیا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ اتنی ہٹ دھرم ثابت ہو گی۔ وہ دستک دے کر سنعیہ کے کیبن میں داخل ہوا۔ وہ دونوں بازو میز پر رکھے اس پر اپنا سر ٹکائے بیٹھی تھی' ہادی کی آمد پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مس سنعیہ! میں آپ سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ بہت شوق سے اپنا چینل جوائن کر لیجیے بھلے سے جو مرضی کریں لیکن پہلی بات کہ آئندہ یہ لڑکی ماہین ہمدانی مجھے اس دفتر میں نظر نہ آئے اور دوسری بات کہ آپ نے یہ اخبار جوائن کرتے ہوئے بھی ایک کانٹریکٹ سائن کیا تھا جس کی رو سے آپ بیک وقت دو اداروں میں کام نہیں کر سکتیں' اپنے فیصلے سے مجھے تھوڑی دیر میں آگاہ کر دیجیے گا۔" اس نے کٹیلے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ سنعیہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تھے مگر اس کے لب صرف کپکپا کر رہ گئے' ہادی رضا کمرے سے جا چکا تھا۔

وہ صرف اس کی وجہ سے اپنی خواہش سے دستبردار ہونے جا رہی تھی لیکن ہادی کا رویہ کتنا تضحیک آمیز تھا' اتنی بے اعتباری' اتنی اجنبیت اتنی رکھائی' اس کی سنے بغیر' اس کی رائے جانے بغیر اس نے خود ہی ایک مفروضہ قائم کر لیا اور پھر اس مفروضے کے تحت اسے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ ہادی نے اسے غلط سمجھا تھا یا وہ ہادی کو سمجھنے میں غلطی کر بیٹھی تھی۔ ابھی تو وہ ماہین ہمدانی کے انکشافات کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہادی آ کر صرف اسے ایک باس کی حیثیت سے یہ باور کروا گیا تھا کہ وہ کانٹریکٹ کی رو سے صرف یہاں کام کرنے کی پابند ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے سنعیہ اور اپنے تعلق کو کتنی آسانی سے فراموش کر دیا تھا۔ یہ وہ ہادی نہ تھا جس کے نام کی انگوٹھی وہ اپنے ہاتھ میں سجائے بیٹھی تھی۔ یہ تو کوئی اجنبی تھا اور اجنبیوں کے درمیان کوئی تعلق کیسے قائم رہ سکتا ہے۔

* * *

"یہ میرا استعفیٰ ہے سر! اور یہ آپ کی انگوٹھی۔" بہت دیر بعد وہ خود کو کمپوز کر کے ہادی کے کمرے میں گئی تھی لیکن اپنے اندر اٹھتے جوار بھاٹا کو قابو نہ کر پائی تھی۔

اپنی انا' اپنا وقار اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا' اس خود پسند شخص کی ہمراہی میں زندگی کے ہر قدم پر رونے سے بہتر تھا کہ وہ ابھی یہ تعلق ختم کر دے۔ غصے کے اٹھتے ابال نے اس سے یہ فیصلہ کروا لیا جو شاید کچھ دیر گزرنے کے بعد وہ کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی فی الحال اسے نہ آمنہ کی ناراضی کا خیال تھا نہ رضا انکل کی خفگی کا' صرف ہادی کی آنکھوں کی اجنبیت نے اس سے یہ فوری فیصلہ کروا لیا تھا' استعفیٰ اور انگوٹھی اس کے سامنے رکھ کر وہ پلٹ گئی تھی۔ اب بے یقینی سے ساکت بیٹھے رہ جانے کی باری ہادی کی تھی۔

* * *

"تم نے اس سے اس فیصلے کی وجہ پوچھی؟" بابا اس سے مخاطب تھے۔

"وہ اپنے ہر فیصلے میں خود مختار ہے' مجھے کیوں وجوہات سے آگاہ کرنے لگی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا تھا۔

"اور آپ جاتے تو رہتے ہیں وہاں خود ہی وجہ پوچھ لیجیے گا محترمہ سے۔"

اس نے تھکے ہارے انداز میں بابا کو مخاطب کیا۔

"میرے جانے کا اب کوئی جواز ہی نہیں بچا ہادی! جب تم دونوں خود ہی یہ رشتہ برقرار رکھنے میں سنجیدہ نہیں ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" اس نے بابا کی بات پر حیرت سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو' صحیح کہہ رہا ہوں میں۔ یہ

زندگی بھر کا معاملہ ہے اگر تم دونوں کی طرف سے اسے نبھانے میں سنجیدگی نہیں ہے تو ابھی بھی وقت ہے خوب سوچ سمجھ لو۔ یہ رشتہ بہت کمپرومائز کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر اپنی اناؤں کے دائرے میں قید رہنا ہے تو بہتر ہے اس فیصلے پر نظرثانی کرلو۔" بابا بھرپور سنجیدگی سے مخاطب تھے ان کا ردِعمل اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا وہ یہ سوچے بیٹھا تھا کہ بابا پہلے تو اس پر خفا ہوں گے اسے سمجھائیں گے پھر سنعیہ کو سمجھانے منانے اس کے گھر جائیں گے لیکن انہوں نے تو صاف ہری جھنڈی دکھادی تھی۔

بابا کے کمرے سے جانے کے بعد وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ دل و دماغ سنعیہ سے دستبرداری کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ اس کی ذرا سی خفگی بھی سنعیہ سے برداشت نہ ہوئی، حالانکہ کم از کم خفا ہونے کا حق تو رکھتا تھا وہ، کتنی آسانی سے اس نے تعلق توڑنے کا یکطرفہ فیصلہ کرلیا۔ غلطی سنعیہ کی تھی وہ خود سے کیسے جھلکتا، دل و دماغ میں عجیب سی کشمکش برپا تھی۔

* * *

"یہ سب کیا ہوگیا رضا بھائی!" ٹیلی فون کے دوسری طرف آمنہ ازحد پریشان تھیں۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں بھابھی! سب ٹھیک ہوجائے گا۔" رضا صاحب بالکل پرسکون تھے۔

"مجھے سنعیہ سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی لیکن وہ خود بھی کمرے میں بند روئے جارہی ہے۔ میں اسے مزید کیا کہوں۔"

"بچے ہیں بھابھی! جذباتی اور کم عقل اور ہمارے سمجھانے بجھانے سے وقتی طور پر تو مان جائیں گے لیکن جو گرہ ان کے دلوں میں پڑچکی ہے وہ نہیں کھلے گی۔ فی الحال آپ کو اور مجھے اس معاملے سے لاتعلق رہنا ہے۔ ان دونوں کو اپنی حماقت اور جذباتیت کا خود سے احساس ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ان کے مستقبل کے تعلق کی پائیداری کے لیے ضروری ہے۔ ہم کب تک ان کے جھگڑے نمٹانے کو موجود ہوں گے۔ انہیں خود یہ فیصلہ کرنے دیجئے کہ ان کے درمیان غلط فہمی کیونکر پروان چڑھی۔ کون اس کا زیادہ ذمہ دار ہے یہ جاننے کا موقع دیجئے کہ یہ ایک دوسرے کے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب انہیں خود احساس ہوجائے گا تو اپنی حماقت پر نہ صرف پچھتائیں گے بلکہ آئندہ ایسی کسی حماقت کا سوچیں گے بھی نہیں۔"

رضا صاحب پرامید تھے آمنہ ماں تھیں، متفکر تھیں تاہم انہوں نے رضا صاحب کی بات سے اتفاق کرلیا تھا۔

* * *

"سوری ماہین! میرا جواب اب بھی وہی ہے۔" ماہین کی کال وصول کرتے ہی اس نے چھوٹتے ہی انکار کردیا تھا۔

"اوکے اوکے میں اصرار نہیں کروں گی تمہاری مجبوری سمجھتی ہوں جانتی ہوں تمہارے منگیتر صاحب کی ضد کی وجہ سے۔"

"ہی از نو مور مائی فیانسی ماہین۔ (وہ اب میرے منگیتر نہیں رہے)" اس نے دھیرے سے اس کی بات کاٹی تھی اور ساتھ ہی کال بھی...... دوسری طرف موبائل ہاتھ میں لیے ماہین ہمدانی کے لبوں پر بہت مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ حسب خواہش سنعیہ کو ٹی وی اسکرین پر لانے میں تو کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی خواہش سے بڑھ کر تھا۔

"امی! اب آپ ریسٹ کرلیں باقی کام میں سمیٹ لیتی ہوں۔" وہ کچن میں آکر آمنہ سے مخاطب تھی، آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ ان کے دل کو کچھ ہوا تھا لیکن انہوں نے اپنی اندرونی کیفیات چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیں تھیں۔

"نہیں رہنے دو کام ہی کتنا رہ گیا ہے، میں کرلوں گی، تمہیں پتا تو ہے کہ مجھ سے فارغ نہیں بیٹھا جاتا۔" سپاٹ سے انداز میں جواب دے کر وہ پھر ہانڈی میں ڈوئی گھمانے لگی تھیں۔ سنعیہ چند لمحے

کھڑی انہیں دیکھتی رہی پھر بے بسی سے لب کچلتی واپس پلٹ گئی تھی۔

* * *

"تمہاری لو اسٹوری میں اتنی جلدی یہ ڈرامائی موڑ ہوگیا، میری سمجھ سے تو یہ بات باہر ہے۔" ہمایوں اور ہادی اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے لنچ کررہے تھے بلکہ ہمایوں ہی تھا جو لنچ کررہا تھا، ہادی محض چمچ کانٹے سے کھیل رہا تھا۔

"تم اسے ڈرامائی موڑ کہہ رہے ہو؟" ہادی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

"اوکے ٹریجک موڑ کہہ لو۔" ہمایوں نے رشین سلاد کا چمچ بھر کر منہ میں ڈالا۔

"مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ سنعیہ ایسا ری ایکٹ کرے گی۔ میں اس کی زندگی میں اتنی تو اہمیت رکھتا تھا کہ وہ میرے مشورے اور رائے سے کوئی قدم اٹھاتی۔ اس کے بھلے کو تو ہی منع کررہا تھا میں اور جب اس کی من مانی پر تھوڑا سا ری ایکٹ کیا میں نے تو وہ اوور ری ایکٹ کرگئی۔ اس نے بہت زیادتی کی میرے ساتھ۔ اپنے ساتھ۔" وہ ازحد ملول اور دل گرفتہ تھا۔

ہمایوں کو ہنسی آگئی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو اور ملگجے سے حلیے میں وہ واقعی مجنوں کا جانشین لگ رہا تھا۔

"ہنس لو، اڑالو میرا مذاق۔" اس کی ہنسی ہادی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائی تھی۔ وہ مزید خفا ہوا۔

"اوکے اوکے نہیں ہنس رہا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ جس سنعیہ کو میں جانتا ہوں وہ ہرگز ایسی نہیں ہے ہٹ دھرمی اور خودسری نہ اس کے خمیر میں شامل ہے نہ تربیت میں۔ ہاں ناک خاصی اونچی ہے، اپنا وقار اور بھرم عزیز رکھتی ہے لیکن یار! میں پھر یہ ہی کہوں گا کہ تم لوگوں کے درمیان کمیونیکیشن گیپ پیدا ہوا ہے کوئی بہت بڑی غلط فہمی۔ تم دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پائے اور نہ ہی اپنا مؤقف سمجھا پائے ہو۔" ہمایوں رسانیت سے بولا تھا۔

"مؤقف سمجھانے کی نوبت آتی تب نا۔ محترمہ استعفیٰ کے ساتھ انگوٹھی بھی میرے منہ پر مار گئی ہیں۔"

"واقعی منہ پر ماری، پھر تو بڑی چوٹ لگی ہوگی۔" ہمایوں نے مصنوعی تاسف طاری کیا، ہادی نے ایک بار پھر اسے گھورا تھا۔

"اچھا اب یہ نظروں کے تیر مت چلاؤ اور کھانا کھاؤ۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔" ہمایوں نے بھی صرف تسلی پر ٹرخا دیا تھا۔ ہادی پھر چمچ کانٹوں سے کھیلنے لگا تھا۔

* * *

"پھر کب سے شروع ہورہا ہے تمہارا پروگرام؟" ہمایوں نے چائے کا سپ پیتے ہوئے اطمینان سے دریافت کیا۔

"کیسا پروگرام ہمایوں بھائی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ ہمایوں اور ردا اس وقت اس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ آمنہ پڑوس میں میلاد میں گئی ہوئی تھیں سنعیہ نے ہی ان کی خاطر کا سامان کیا تھا۔

"بھئی ہم تو مشتاق اور منتظر تھے کہ سنعیہ صاحبہ جلد ہی ٹی وی اسکرین پر نمودار ہوکر اپنے پروگرام میں شریک مہمانوں پر تابڑتوڑ سوال کرکے ان کے چھکے چھڑایا کریں گی۔" ردا نے بھی اسے ہنستے ہوئے مخاطب کیا۔

"خیر ردا بھابھی! اگر میں پروگرام کرتی بھی تو وہ روایتی پروگرام ہرگز نہ ہوتا محض پروگرام میں گرما گرمی پیدا کرکے ریٹنگ بڑھانا مقصد نہ ہوتا میرا، یہ وقت سب کو ایک نکتے پر متحد کرنے کا ہے نہ کہ منتشر کرنے کا۔" وہ آزردہ سے لہجے میں بولی۔ کچھ بھی تھا اس نے اس حوالے سے سوچ تو بہت کچھ لیا تھا اگرچہ خواہش تشنہ رہ گئی تھی اور اس بے ضرر سی خواہش کا جو خمیازہ بھگتنا پڑا تھا، اسے سوچ کر اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئی تھیں۔ ردا اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دوبارہ اس کو۔

"میں نے تو سنا تھا کہ تم نے ایگریمنٹ سائن

کرلیا؟" ہمایوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ نے جس سے سنا ہے یا جس نے آپ کو بھیجا ہے انہیں جا کر بتا دیجئے کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ان کی رائے، ان کی مرضی کے بغیر میں کوئی قدم کیسے اٹھا سکتی تھی۔" وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولی ہمایوں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دیکھو لڑکی! غلط فہمی دور کرلو نہ ہم نے کسی سے کچھ سنا نہ کسی نے ہمیں بھیجا بلکہ شاید اس کے بجائے میرا تم سے زیادہ قریبی رشتہ ہے۔ وہ دوست ہے اور تم بہن۔ کم از کم بہن کو بھائی پر شک نہیں کرنا چاہیے۔"

ہمایوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ اتنا سا سہارا پا کر بکھر گئی تھی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اسے یوں روتا دیکھ کر ہمایوں اور ردا دونوں پریشان ہو گئے تھے۔

"بس کرو سنعیہ! میری جان، بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے۔" ردا نے اسے بازوؤں میں بھرا۔

"ردا بھابھی! سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"کچھ ختم نہیں ہوا اور خبردار جو اب ایک آنسو بھی بہایا۔" ہمایوں نے اسے ڈپٹا تھا۔

"اور اب شروع سے آخر تک سب کچھ بتاؤ۔" ہمایوں کو کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ صورت حال اس نہج پر کیسے پہنچی۔ اس نے ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ ہادی کی ساری زیادتیاں بتا دیں۔

"میں ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرنے لگی تھی۔ انہوں نے خود ہی مفروضہ قائم کر لیا کہ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

"اتنا آسان کیس؟ یہ تو ایک ہی نشست میں حل ہو گیا یار! مجھے تو انجینئر کے بجائے ڈیٹیکٹو ہونا چاہیے تھا۔" سنعیہ کی بات سننے کے بعد ہمایوں کے لبوں پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ماہین ہمدانی کو مجھ سے بہتر اور کون جانتا ہے۔ ممی کی سیکنڈ کزن کی بیٹی ہے۔ یونیورسٹی میں میری کلاس فیلو بھی رہی ہے۔ وہ واقعی ایک سائیکی کیس ہے۔"

ردا نے بھی سر ہلایا۔

"اوہ یعنی تم بھی مجرم تک پہنچ گئیں۔" ہمایوں نے حیرانی سے بیوی کو دیکھا۔

"ظاہر ہے کوئی بچہ بھی دونوں طرف کے بیان سے "مجرم" تک پہنچ سکتا ہے آپ نے ایسا کون سا کمال کر دیا۔"

ردا نے ہمایوں کو گھورا وہ کھسیا گیا تھا۔ "اس نے بہت ہوشیاری سے دونوں کے درمیان غلط فہمی کا پہاڑ کھڑا کیا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کھل کر بات ہی نہ کر سکے ورنہ اگر اس روز ہادی بھائی سنعیہ کو سن لیتے تو معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے۔" ردا نے دوبارہ ہمایوں کو مخاطب کیا۔ سنعیہ ہکا بکا دونوں کی گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی جو اسے بالکل فراموش ہی کر چکے تھے۔

"ہاں اصل گھامڑ تو وہ ہادی ہی ثابت ہوا نا۔ چلو یعنی تو ماہین سے ناواقف تھی اس کی نیچر نہ سمجھ سکی لیکن ہادی تو پہلے سے ہی اس کا ڈسا ہوا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا نا کہ کس طرح محترمہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی تھیں۔ رضا انکل کی جان پہچان تھی تمہاری اس ماہین ہمدانی کے والد سے بس اسی کو بنیاد بنا کر پہلے اس نے جاب کی اس کے بعد ہادی کو قابو کرنا چاہا۔ اللہ اللہ کر کے جان چھڑائی تھی ہادی نے اس سے بلکہ میرے مشوروں پر عمل کر کے ہی اسے آفس سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا ورنہ وہ لڑکی تو یار کمبل ہوتی جا رہی تھی اور اب وہ پھر اسی ماہین ہمدانی کے ٹریپ میں آ گیا۔ اس کی کہی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔" ہمایوں کو صحیح معنوں میں ہادی پر غصہ آیا تھا۔

"کچھ مجھے بھی بتائیں گے یا دونوں آپس میں ہی بات کرتے رہیں گے۔" سنعیہ جھلا گئی تھی۔

"مختصر الفاظ میں بات صرف اتنی سی ہے کہ تم ماہین ہمدانی کے ہاتھوں الو بن چکی ہو۔ اس نے ہادی بھائی سے اپنی پرانی دشمنی تمہیں ان سے بدظن کر کے نکالی اور تم اتنی ڈفر تھیں کہ اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئیں۔" ردا نے اسے حسب توفیق لتاڑا تھا۔

"لیکن وہ تو کہہ رہی تھی کہ ہادی اس میں دلچسپی لیتے تھے اور جب اس نے۔۔۔"

"تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور جو بات ہم تم سے کر رہے ہیں، وہ بات تمہارے لیے ناقابل اعتبار ہے۔" ہمایوں نے اسے گھرکا۔

"ہمایوں! یہ تعلق ہی ایسا ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے متعلق پوزیسو بھی ہو جاتا ہے اور بہت جلد بدگمان بھی ہو سکتا ہے۔ سنعیہ کی غلط فہمی دور کرنے کا ایک طریقہ ہے میرے پاس۔" ردا نے پرسوچ انداز اختیار کیا تھا پھر اپنے ہینڈ بیگ میں سے اپنا سیل فون نکالا تھا۔

"سنعیہ تمہارے پاس ماہین ہمدانی کا نمبر ہو تو دو مجھے میرے پاس تو پرانا نمبر تھا شاید سم بدل لی اس نے۔" ردا نے سنعیہ کو مخاطب کیا سنعیہ نے کچھ سمجھتے، کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے اپنے موبائل میں سے ماہین ہمدانی کا نمبر دے دیا تھا ردا نے نمبر ملا کر اسپیکر آن کر لیا۔

"ہیلو۔" ماہین ہمدانی کی خمار آلود آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"ہاں ہیلو ماہین! میں ردا بول رہی ہوں کیسی ہو تم۔" ردا نے اس سے تعارف کروایا تھا۔

"اوہ مسز ہمایوں! کیسی ہیں آپ؟" ماہین اسے فوراً پہچان گئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ انکل، آنٹی کیسے ہیں؟ تمہارا شو کیسا جا رہا ہے۔" ردا نے رسمی باتوں سے آغاز کیا تھا۔

"میں بالکل فٹ فاٹ، ممی، ڈیڈی بھی بالکل ٹھیک تم سناؤ اتنے دنوں بعد کیسے یاد کیا اور میاں کیسا ہے تمہارا؟"

"ہاں ہمایوں، اچھے ہیں۔" ردا نے مختصر جواب دیا۔ ماہین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں بھئی ہمایوں تو اچھا ہی ہے البتہ اس کا دوست بہت کھڑوس ہے۔"

"کون، کس دوست کی بات کر رہی ہو تم۔" ردا نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنے میاں سے پوچھنا ایک ہی دوست ہے اس کا۔ انتہائی سڑیل مزاج۔" ماہین ہمدانی طنزیہ ہنسی تھی۔

"تم ہادی بھائی کی بات کر رہی ہو۔" ردا سنجیدہ ہوئی۔

"بھائی ہوگا تمہارا۔ میرا تو وہ صرف ڈارلنگ ہے۔" ماہین ہمدانی نے قہقہہ لگایا تھا۔

"شٹ اپ ماہین! تمہیں شرم آنی چاہیے، کتنی چالاکی سے تم نے ہادی بھائی اور سنعیہ میں غلط فہمیاں پیدا کیں۔"

"سو سیڈ ردا! تمہیں اپنی فرینڈ سے زیادہ اپنے میاں کے فرینڈ اور اس کی منگیتر سے ہمدردی ہے۔" ماہین نے مصنوعی تاسف اختیار کیا۔

"اور ویسے بھی ردا ڈیئر ایوری تھنگ از فیئر ان لو اینڈ وار۔" ردا کی اگلی بات سنے بغیر ماہین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ سنعیہ کو ٹھکرا کر وہ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ خام خیالی ہے یہ تمہاری ماہین!" ردا نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

"میں بھی کوئی مری نہیں جا رہی تمہارے اس ہادی رضا کے پیچھے، اس جیسے کئی میری جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ میں کتنی بڑی سیلیبریٹی بنتی جا رہی ہوں تمہیں شاید اندازہ نہیں، میرا مقصد صرف اسے مزا چکھانا تھا سو چکھا دیا۔ اسے اپنی منگیتر پر بہت مان اور بھروسہ تھا، دو ٹکے کا کر دیا میں نے اس کو ہادی رضا کی نظر میں۔ اپنے انتخاب پر شرمندہ ہو رہا ہوگا بے چارہ۔" ماہین ہمدانی کی استہزائیہ آواز ردا کو جلا گئی تھی۔

"شرم کرو ماہین! کس ڈھٹائی سے اعتراف کر رہی ہو۔"

"دیکھو ردا تم جانتی ہو میں کس ٹائپ کی لڑکی ہوں۔ مجھے شرمانا وغیرہ کہاں آتا ہے، مجھے شرم دلوانے میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ تم کوئی دوسرا کام کر لو۔ میرا وقت ضائع مت کرو۔ او کے بائے۔" ماہین

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

ہمدانی بھی بدمزا ہوگئی تھی اس نے ردا کی مزید سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

"اسٹوپڈ۔" ردا نے اسے غائبانہ لتاڑا تھا۔

"میں نے کہا تھا نہ سائیکی کیس ہے، کتنی ڈھٹائی سے مان گئی، وہاں یونیورسٹی میں بھی ایسی تھی۔ پورے ڈپارٹمنٹ کا ناک میں دم کر رکھا تھا اور مجال ہے جو کبھی اپنے رویے پر نادم ہوئی ہو۔ عجیب طرح کی ڈھٹائی ہے اس کی شخصیت میں۔" ردا تاسف سے بول رہی تھی۔ ہمایوں بغور سنعیہ کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"تم نے اپنے سیل فون کا اتنا زبردست استعمال کر ڈالا مسز۔ اب مجھے بھی موقع ملنا چاہیے۔" ہمایوں نے مسکراتے ہوئے اپنا سیل نکال کر کال ملائی۔ اسپیکر اس نے بھی آن کر دیا۔

"ہاں ہمایوں! کیا حال ہے۔" دوسری طرف ہادی تھا اس کے لہجے کی فطری بشاشت مفقود تھی۔

"حال تو آپ سنائیے مجنوں کے جانشین۔ آج شیو بنائی یا آج بھی فرصت نہیں ملی۔" ہمایوں نے اسے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

"شٹ اپ ہمایوں! میرے زخموں پر نمک پاشی کے لیے فون کیا ہے تو اللہ حافظ۔" وہ شدید بدلحاظ ہوا تھا۔

"اچھا ہادی، رک یار! سن تو سہی۔" ہمایوں نے بمشکل اسے کال بند کرنے سے روکا۔

"ہاں بول کیا بات ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولا گویا کہنا چاہ رہا ہو "ہاں بک کیا بات ہے۔"

ہمایوں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی "میں تجھ سے عینی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔" ہمایوں نے اس بار لہجہ سنجیدہ ہی رکھا۔

"اب کیا بات باقی رہ گئی۔" ہادی کا ٹوٹا ہوا لہجہ۔ ردا اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر پھر ہنسی روکی تھی۔

"یار! کل رات میرے ذہن میں ایک نئی سوچ آئی۔ ہو سکتا ہے عینی کہیں اور انٹرسٹڈ ہو اور وہ اسی وجہ سے یہ تعلق توڑنا چاہ رہی ہو۔"

"پلیز ہمایوں! اپنے زریں خیالات اپنے تک ہی محدود رکھ اور رات کے وقت ایسی چیزیں مت کھایا کر جس سے بدہضمی کا احتمال ہو۔" ہادی تپ گیا تھا۔

"اچھا اچھا ناراض تو مت ہو، میں نے تو ویسے ہی ایک خیال شیئر کیا تھا دراصل آج دوپہر کو جب میں آفس سے لنچ کے لیے نکلا تو ایک سگنل پر گاڑی رکی۔ مجھے گمان ہوا کہ اس میں کسی بندے کے ساتھ عینی بیٹھی ہے، اتنے میں غور سے دیکھ کر کنفرم کرتا سگنل کھل گیا اور گاڑی زن سے گزر گئی، ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔ کوئی اور لڑکی ہو لیکن اگر وہ عینی تھی تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں نکل سکتا کہ وہ کسی اور میں دلچسپی لے رہی ہو۔" ہمایوں سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھ ہمایوں! میں تجھے جھٹلا نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے گاڑی میں واقعی سنعیہ ہی ہو لیکن اگر میں اپنی آنکھوں سے بھی اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ لیتا تو میرے ذہن میں وہ خیال نہ آتا۔ جہاں تک تیری رسائی ہوئی ہے۔ مانا ہمارے درمیان مس انڈراسٹینڈنگز ہیں لیکن کم از کم اس نوعیت کی مس انڈراسٹینڈنگ نہیں۔ مجھے سنعیہ پر خود سے بڑھ کر اعتبار ہے۔"

ہادی نے رسانیت سے کہا تھا۔ ہمایوں نے ایک جتاتی نگاہ سنعیہ پر ڈالی جو گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ہاں آنسو اب بھی آنکھوں سے چھلکنے کو بے تاب تھے۔

"اوکے ہادی! ایک اور کال آ رہی ہے، پھر بات کروں گا۔" ہمایوں نے فون بند کر کے سنعیہ کو دیکھا۔

"میں اب کیا کروں ہمایوں بھائی!" اس نے روہانسی ہو کر پوچھا۔

"انتظار۔" ہمایوں نے اس کا سر تھپکا تھا۔

* * *

"پھر اب میں کیا کروں؟" ہادی ہونق بنا پوچھ رہا تھا۔

"ظاہر ہے معذرت کرو۔ اسے مناؤ۔ ہر طرح کی خفگی کا حق رکھتی ہے وہ۔ اسے سنے بغیر تم نے خود

ساختہ مفروضے قائم کرلیے۔ تم نے اس کے اعتبار اور اعتماد دونوں کا خون کیا ہے اور وہ جو انگوٹھی تمہارے منہ پر مار گئی تھی اس کے بجائے اسے کسی وزنی چیز کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔"

ہمایوں جب سے آیا تھا' اس پر مسلسل بگڑ رہا تھا۔ ہادی چپ چاپ بیٹھا اس کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

"مناؤں گا تو مان جائے گی؟" وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ آپ کے منانے کے طریقے اور آپ کی قسمت پر منحصر ہے۔" ہمایوں نے کوئی امید افزا جواب نہ دیا۔ ہادی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

* * *

وہ اس وقت دھڑکتے دل کے ساتھ آمنہ آنٹی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ وہ حسب سابق بہت تپاک سے ملی تھیں۔

"مجھے سنعیہ سے بات کرنی ہے آنٹی!" کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ مطلب کی بات پر آگیا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ آمنہ آنٹی کے سامنے بھی خود کو بہت شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔ آمنہ آنٹی مسکرادیں۔

"یعنی چائے بنا رہی ہے' آتی ہی ہوگی۔ میں تو ویسے بھی مارکیٹ جانے کے لیے نکل رہی تھی' کچھ گروسری خریدنی تھی۔"

کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ آمنہ آنٹی کو اپنی خدمات پیش کردیتا لیکن فی الحال یہ آفر کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ آمنہ آنٹی یقیناً" خود ہی انہیں گلے شکوے دور کرنے کا موقع فراہم کر رہی تھیں' وہ دل سے ان کا ممنون ہوا۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد سنعیہ چائے کی ٹرے لیے آن موجود ہوئی۔ دھیرے سے سلام کرکے اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی۔

"پلیز بیٹھ جاؤ۔" ہادی کو خدشہ ستایا کہ وہ واپس نہ پلٹ جائے۔

وہ خاموشی سے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

چند لمحوں کے لیے کمرے میں خاموشی پھیل گئی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی غلطی کے اعتراف کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہے تھے۔

"سوری ہادی۔" آخر سنعیہ نے ہی خاموشی توڑی' وہ بوکھلا گیا۔

"پلیز سنعیہ مجھے شرمندہ مت کرو۔ سوری تو میں تم سے کرنے آیا ہوں۔"

"نہیں زیادہ غلطی میری ہے' میں نے اوور ری ایکٹ کیا۔ آپ کا غصہ ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ کم از کم ایک بار تو کھل کر بات کرنی چاہیے تھی۔ ایک دم سے اپنا استعفیٰ ٹائپ کیا اور آپ کو تھما آئی۔" اس نے اعتراف کیا۔

"ساتھ انگوٹھی بھی۔" ہادی نے اسے یاد دلایا۔

"انگوٹھی تو خیر میں نے آپ والی واپس کی تھی۔ اصل انگوٹھی مجھے رضا انکل نے پہنائی تھی' وہ میں نے اب بھی پہن رکھی ہے۔"

"اچھا اور جو میں نے پہنائی تھی وہ نقلی تھی۔" ہادی اس کی چالاکی پر گھور کر رہ گیا تھا۔

"یہ میں نے کب کہا۔" وہ مسکرائی تھی۔

"یعنی تم نے مجھے معاف کردیا۔" اس کی مسکراہٹ سے ہادی کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

"پلیز ہادی! معافی کا لفظ استعمال کرکے مجھے شرمندہ مت کریں۔ جو غلط فہمی تھی وہ دور ہوئی۔" وہ سنجیدہ ہوئی تھی۔

"تو اب میں ان ڈائیلاگز کا کیا کروں جو ہمایوں نے مجھے رٹا لگوا کر بھجوایا ہے۔" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا جب کہ اس کی بھوری آنکھوں میں شرارت مسکرا رہی تھی۔

"سنبھال کر رکھ لیں بعد میں کام آئیں گے۔" سنعیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

"معذرت کے ڈائیلاگز کا میں نے بعد میں اچار ڈالنا ہے کیا۔ آئندہ میں تمہیں روٹھنے دوں گا تو منانے کی نوبت آئے گی نا۔"

"مجھے بھی پہلے یہ ہی گمان تھا لیکن اس روز آپ کی آنکھوں کی اجنبیت اور غیریت.... مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ آپ تھے ہادی۔" اس نے شکوہ کر ہی ڈالا۔

"دیکھو' تم ابھی خود کہہ چکی ہو کہ معافی کا لفظ استعمال کرکے مجھے شرمندہ نہ کریں لیکن میں تمہیں شرمندہ نہ کروں تو اور کیا کروں۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری سنعیہ! کہو تو کان بھی پکڑ لوں۔" اس نے کہا تو سنعیہ واقعی شرمندہ ہوگئی تھی۔

"سچ کہوں تو سنعیہ! مجھے واقعی بہت افسوس ہے کہ تمہاری خواہش پوری نہ ہو سکی۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے نظریات کی ترویج کے لیے الیکٹرانک میڈیا کی طاقت بھی استعمال کرنا چاہتی تھیں۔ تم کہو تو میں کسی معیاری چینل پر تمہارے لیے کوشش کروں؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں ہادی! فی الحال میں اپنے قلم پر ہی کنسنٹریٹ کرنا چاہ رہی ہوں۔" اس نے سہولت سے انکار کردیا۔

"جیسے تمہاری مرضی لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی ہمیں وسائل میسر آئیں گے تو ہم اپنا چینل بھی لانچ کریں گے۔ اس کی پالیسی بالکل تمہارے نظریات کے عین مطابق ہوگی بلکہ اس کی چیف ایگزیکٹو بھی تم ہوگی۔ اگلے سال' اس سے اگلے سال یا پھر اس سے بھی اگلے سال ہمارا یہ خواب ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔"

"اور پھر آپ کے سر پر سے انڈوں کی ٹوکری گر کر ٹوٹ جائے گی۔" سنعیہ کو ہنسی آگئی تھی۔

"حدِ ادب لڑکی۔" ہادی نے اسے گھورا پھر وہ خود بھی ہنس پڑا تھا۔

"مانا کہ یہ مشکل ہے لیکن ناممکن تو نہیں۔"

"یقیناً" نہیں۔" سنعیہ نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی۔

"تمہیں پتا ہے آج بابا بھی میرے ساتھ آرہے تھے۔ کہہ رہے تھے تم اتنی دیر میں سنعیہ کو منانا' میں آمنہ بھابھی کے پاس بیٹھ کر شادی کی تاریخ طے کرلوں گا۔" ہادی کے کہنے پر سنعیہ سر جھکا کر مسکرادی تھی۔

"پھر میں بابا کو بھیج دوں؟" اس کی مسکراہٹ سے ہادی کو حوصلہ ہوا۔

"انکل کو تنہائی بہت ستاتی ہے' آپ انہیں کمپنی دیا کریں نا۔" اس نے ہادی کا سوال سنی ان سنی کردیا تھا۔

"وہ اپنی کمپنی کے لیے ہی تو پلاننگ کر رہے ہیں بلکہ کمپنی نہیں پلاٹون۔ بابا خود اکلوتے تھے۔ میں اکلوتا لیکن انہیں اپنے پوتے' پوتیاں درجن بھر چاہئیں اس معاملے میں وہ ہماری ایک نہیں سنیں گے۔" ہادی نے اسے پیشگی آگاہ کیا تھا۔

"باتوں باتوں میں آپ کی چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے میں اور لاتی ہوں۔" سنعیہ گڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔ بہت تیزی سے چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ رفوچکر تھی۔ ہادی پیچھے سے اسے پکارتا ہی رہ گیا پھر ہنستے ہوئے اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

* * *

اس بندے کے ایک جملے نے اسے عرش کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔

"مجھے سنعیہ پر خود سے بڑھ کر اعتبار ہے ہمایوں!"

اور اس کے سارے گلے شکوے خود بخود دم توڑ گئے تھے۔ وہ خود سے شرمندہ تھی کہ کچھ دنوں کے لیے ہی سہی ماہین ہمدانی کی باتوں میں آکر وہ اس سے بدگمان ہوئی تھی۔ اس کے کردار پر شبہ بھی کیا تھا لیکن اس بات کا اعتراف وہ کبھی بھی اس کے سامنے نہ کرسکتی تھی۔ ہاں' اب اس نے ہمیشہ نہ صرف اس سے محبت کرنا تھی بلکہ اس کی محبت کی قدر بھی کرنا تھی۔

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں، سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی، خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ یاسمین اس پر اپنے جیٹھ، جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد، اجلال رازی سے ہو چکی ہے، جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلا تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بد ظن ہو گئی اور اس نے اجلال سے منگنی توڑ دی۔ اجلال تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلا۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی ڈھٹائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ توصیف احمد کو اریبہ کے منگنی توڑ دینے کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وہ ساجدہ بیگم سے بات کرتے ہیں تو وہ انہیں کچھ دن یاسمین کے گھر میں رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ سارہ کا کزن عمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

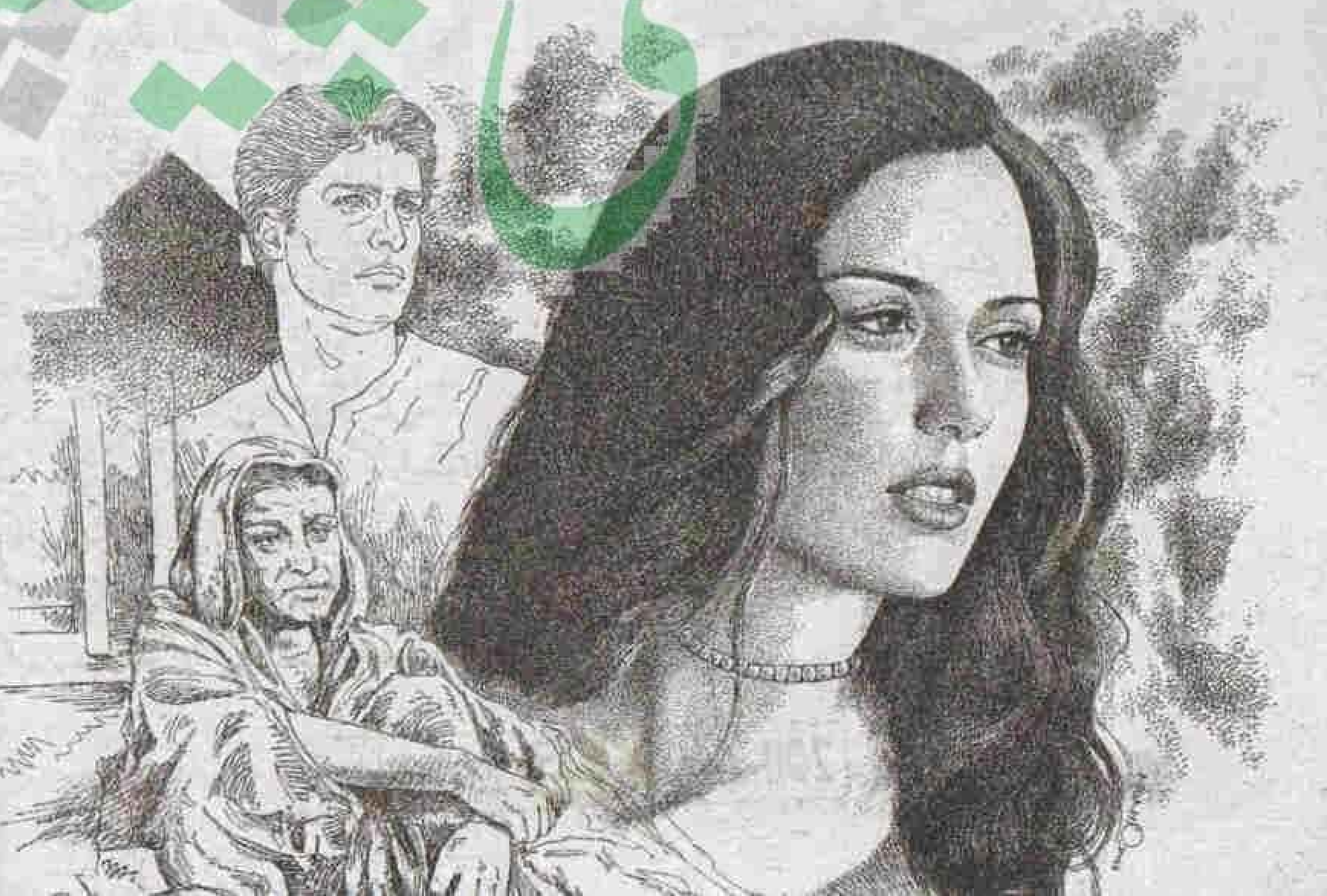

۵
پانچویں قسط

"توصیف احمد نے دوسری شادی کیوں کی؟"

شہباز ربانی کو گو کہ یہ بات اول روز سے کھٹک رہی تھی لیکن پوچھنے سے یوں گریز کر رہے تھے کہ کہیں یاسمین کے زخم نہ کھل جائیں۔ ابھی بھی بہت احتیاط سے پوچھا تھا۔

یاسمین کے ہونٹوں پر ذرا سی ہنسی ابھر کر دم توڑ گئی۔ پھر صاف گوئی سے بولی تھی۔

"ظاہر ہے جب میری طرف سے اسے کوئی خوشی نہیں ملی تو اسے یہی کرنا تھا۔"

"کم آن یاسمین! تمہیں تو پالینا ہی اس کی خوش قسمتی تھی۔"

"اس کی ناں! میری تو نہیں... اور جہاں میں اپنی بد قسمتی کا ماتم کر رہی ہوں، وہاں وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کیسے کر سکتا تھا۔" یاسمین نے آخر میں قریب بیٹھے شہباز ربانی کو ذرا سی گردن موڑ کر ترچھی نظروں سے دیکھا تھا۔

"او نو تو تم نے جان بوجھ کر... کیوں؟" شہباز ربانی کو جھٹکا لگا تھا۔

"یہ تم پوچھ رہے ہو شہباز تم!" یاسمین پوری ان کی طرف گھوم گئی۔ اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا تھا۔ شہباز ربانی نے پہلے ہونٹ بھینچے۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگے۔

"جب قسمت ساتھ نہ دے تو حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے یاسمین!"

"میں نہیں کر سکی، بلکہ میں نے سمجھوتا کرنا ہی نہیں چاہا، کیوں کرتی؟ میری اپنی کوئی زندگی نہیں تھی کیا؟ مجھے اپنی زندگی جینے کا حق تھا۔ جیسے میرے ماں باپ نے تسلیم نہیں کیا تو پھر میں کیوں کسی کا حق تسلیم کرتی؟ نہیں کروں گی۔" وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔

"ریلیکس یاسمین ریلیکس!" شہباز ربانی نے اس کا ہاتھ تھپکا لیکن اس کے اندر جانے کب سے دبے غبار کو راستہ مل گیا تھا۔

"کیا تھا اس وقت، اگر تم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ کتنا عرصہ لگتا تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں؟ سال، دو سال، اور یہ کوئی اتنا لمبا عرصہ تو نہیں تھا جو میرے ماں باپ مجھے دو وقت روٹی نہ کھلا سکتے۔ میں کتنا روئی، گڑگڑائی لیکن ان پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا، الٹا مجھے احمق قرار دیتے کہ ایک قلاش آدمی مجھے کچھ نہیں دے سکتا، توصیف احمد کے گھر میں راج کروں گی۔ وہ مجھے رانی بنا کر رکھے گا، تو ٹھیک ہے میں بن گئی رانی، جوتے کی نوک پہ رکھ لیا سب کو، ہونہہ۔"

آخر میں اس نے انتہائی نفرت سے سر جھٹکا تھا۔ شہباز ربانی چند لمحے اسے دیکھتے رہے، پھر دھیرے سے پوچھا۔

"اس سے کیا حاصل ہوا تمہیں؟"

"میری تمنا صرف تم تھے، تم نہیں ملے تو پھر کوئی تمنا نہیں جاگی۔ اور جب تمنا ہی نہیں تو پھر کیا حاصل وصول۔" یاسمین آزردہ نظر آنے لگی تھی۔

"تم بہت بے وقوف ہو۔" شہباز ربانی نے گہری سانس کھینچی پھر کہنے لگے۔ "مجھے اگر پتا ہوتا کہ تم اپنے ساتھ یہ سلوک کرو گی تو اسی وقت تمہیں بھگا کر لے جاتا۔"

"میں اب بھی بھاگ سکتی ہوں۔" یاسمین بے اختیار کہہ کر خود ہی محظوظ ہونے لگی۔

"ریئلی! چلو ابھی بھاگ چلیں۔" شہباز ربانی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

پھر دونوں ہنسنے لگے۔ عجیب ہنسی تھی، جس میں پچھتاوا بھی تھا اور پچھتاوے کا مداوا بھی۔ اگر پہلے کچھ ناممکن تھا تو اب ممکن ہو سکتا تھا، لیکن درمیانی ماہ و سال نہیں سمیٹے جا سکتے تھے۔

تب ہی اریبہ تیز قدموں سے اندر آئی۔ پھر ایک دم رک گئی۔

یاسمین ہنستے ہوئے یوں دوہری ہو گئی تھی کہ اس کی پیشانی شہباز ربانی کے گھٹنے سے جا لگی تھی اور شہباز ربانی صوفے کی بیک پر سر رکھے ہنسی کے اختتام پر "ہاہا" کی آوازیں نکال رہے تھے۔

اریبہ فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں سکی۔ یہ بھی نہیں کہ آگے بڑھے یا واپس پلٹ جائے۔ حیران سی کھڑی تھی۔ اب یاسمین نے سر اونچا کیا اور بے تحاشا ہنسی کے باعث آنکھوں سے بہتے پانی کو صاف کرتے ہوئے نظر اریبہ پر پڑی تو یک لخت اس نے اس ماحول کو یوں بدلا کہ اریبہ پریشان ہو کر بھاگی آئی۔

"کیا ہوا مما، آپ رو کیوں رہی ہیں؟" شہباز ربانی بوکھلا کر سیدھے ہو بیٹھے اور یاسمین کو دیکھنے لگے۔ جواب ندارد، وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

"انکل! آپ بتائیں کیا ہوا ہے مما کو؟ کیوں رو رہی ہیں؟"

"بیٹا!" شہباز ربانی اس قدر کہہ کر رہ گئے، تب یاسمین سسکیوں کے درمیان گویا ہوئی۔

"اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔ کس مقام پر تمہارے باپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ ایسے وقت میں جب ہمیں مل بیٹھ کر بچوں کے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچنا اور فیصلہ کرنا تھا۔ میں اکیلی کمزور عورت کیا کر سکوں گی۔"

"او ہو یاسمین! ابھی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ تم اکیلی نہیں ہو۔ تمہارے بچے تمہارے ساتھ ہیں۔" شہباز ربانی کو بات کا سرا مل گیا تھا۔ "پھر ماشاءاللہ سب بچے سمجھ دار ہیں۔ تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو! رونا بند کرو، دیکھو بچی کیسے پریشان ہو رہی ہے۔"

"مما پلیز!" اریبہ نے اس کی کلائیاں تھام کر منت کی۔

"سوری بیٹا! بس ابھی شہباز نے حال احوال پوچھا تو دل بھر آیا۔ میں ٹھیک ہوں۔ ڈونٹ وری۔" یاسمین نے اریبہ کا گال تھپکا، پھر اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

شہباز ربانی اریبہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آیا وہ مشکوک ہے یا مطمئن، لیکن انہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا کیونکہ اس کے چہرے پر اس وقت یاسمین کے لیے صرف پریشانی چھلک رہی تھی۔

"مما! آپ کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ چلیں اٹھیں! منہ ہاتھ دھوئیں، پھر چائے پیتے ہیں۔"

اریبہ نے یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا اور جب وہ کمرے سے نکل گئی، تب اس کی جگہ پر بیٹھ کر شہباز ربانی سے کہنے لگی۔

"دراصل میں انکل مما بہت لونلی فیل کرتی ہیں اور ہم سے تو وہ اپنے دل کی بات کہتی بھی نہیں ہیں۔ بس یہی ظاہر کرتی ہیں جیسے انہیں کوئی ٹینشن نہیں، لیکن میں بچی نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں ڈیڈی کی سیکنڈ میرج کا انہوں نے بہت اثر لیا ہے۔ اور اب تو اس خوف میں بھی مبتلا ہو گئی ہیں کہ کہیں ڈیڈی ہم سب کو ان سے چھین نہ لیں۔"

"ہاں ہاں! میں نے بھی ابھی یہی محسوس کیا ہے۔" شہباز ربانی نے فوراً تصدیق کر کے گویا اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا انکل! آپ بتائیں کیا یہ ممکن ہے کہ میں، سارہ اور حماد مما کو اکیلا چھوڑ کر ڈیڈی کے ساتھ چلے جائیں؟" اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی در آئی تھی۔

"نہیں بیٹا! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ میں تمہاری ماں کو سمجھاؤں گا، تم فکر مت کرو۔" شہباز ربانی نے اسے تسلی دی۔

"تھینک یو انکل! تھینک یو۔" وہ ممنونیت سے بولی تھی۔

* * *

اسے تاجور کو اپنے ساتھ لانے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا کہ وہ فوری شادی کر لے، یوں تاباں اور تاجور آرام

سے رہ سکتی تھیں۔ اور بظاہر تو اسے اپنی شادی میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ابا کیوں ٹال مٹول کر رہے تھے۔ وہ روزانہ ہی ابا کو فون کر رہا تھا یہ جاننے کے لیے کہ تاباں کے ابا شادی کا کیا کہتے ہیں۔ اور روز ہی ابا کوئی نئی بات کرتے تھے۔ اس وقت وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا۔

"ابا! آپ صاف صاف بتائیں کیا مسئلہ ہے۔ آپ میری شادی نہیں کرنا چاہتے یا...؟"

"لے میں کیوں نہ چاہوں گا۔" ابا اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے تھے۔ "مجھے تیری ذات سے کتنے فائدے پہنچ رہے ہیں۔ بڑا کما کے دے رہا ہے نا مجھے جو میں تیری شادی نہیں کروں گا۔"

"کیوں ناشکری کرتے ہیں ابا! جتنا میں کر سکتا ہوں، کر رہا ہوں۔ ہر مہینے منی آرڈر ملتا ہے آپ کو کہ نہیں؟" وہ زچ ہوا تھا۔

"بس رہنے دے۔ احسان نہ جتا۔"

"میں کوئی احسان نہیں جتا رہا۔ زیادہ کماؤں گا تو زیادہ بھیجوں گا۔ ابھی آپ مجھے میری بات کا جواب دیں، کیا کہتے ہیں تاباں کے ابا؟" وہ فوراً" اصل بات کی طرف آگیا۔

"پہلے تو بتا تجھے ضرور تاباں سے شادی کرنی ہے۔" ابا نے پوچھا تو وہ فوری قیاس کر کے بولا تھا۔

"اس کا مطلب ہے آپ میری شادی تاباں سے نہیں کرنا چاہتے۔"

"مجھے بیچ میں نہ لا تو اپنی بات کر۔" ابا کو غصہ پتا نہیں کس بات کا تھا۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا پھر آرام سے بولا تھا۔

"ہاں ابا! میں تاباں ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو اعتراض...."

"نہ نہ پتر! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ابا فوراً" بولے تھے۔ "اور اعتراض تو تاباں کے باپ کو بھی نہیں ہے۔ پر وہ بدلے میں تاجور مانگتا ہے۔"

"ک... کیا مطلب؟" وہ جیسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھا تھا۔

"وٹہ سٹہ...!" ابا زور دے کر کہنے لگے۔ "تاباں کی شادی وہ وٹے سٹے پر ہی کرے گا۔ اب بتا تاجور کو بیاہ دوں اس سے؟"

"ابا...!" اس کا ذہن یک لخت ماؤف ہو گیا تھا۔ "یہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا!"

"میں نہیں کہہ رہا، تاباں کے باپ کی یہی شرط ہے۔ میں نے ابھی اسے جواب نہیں دیا۔ تو سوچ لے۔ اگر تجھے ٹھیک لگتا ہے تو میں ہامی بھر لیتا ہوں۔"

"نن... نہیں ابا! ابھی آپ کچھ نہ کہیں۔ میں... میں خود آؤں گا، خود بات کروں گا۔ آپ... آپ بس...." وہ بالکل نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" ابا نے لائن کاٹ دی تھی، لیکن اس کی سماعتوں میں ابھی بھی ان کی آواز گونج رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے کو ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ بے یار و مددگار بیٹھا تھا۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جو اسے دو گھونٹ پانی ہی پلا دیتا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ انتہائی بے چارگی سے وہ اپنے اطراف ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

جب سے اس نے ابا سے اپنی شادی کی بات کی تھی، اسے اپنے اپارٹمنٹ میں رونقیں اترتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ چشم تصور میں وہ تاباں کو یہاں وہاں، ہر جگہ چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا، کبھی لگتا وہ کچن سے اسے پکارتی ہوئی نکل رہی ہے۔ کبھی بالکونی میں تاجور کے ساتھ کھڑی ہر آئے گئے پر تبصرے کرتی پھر اس کی کھلکھلاہٹیں۔ پچھلے چند دنوں سے وہ یہی سب سوچتا اور اپنے آپ مسکراتا رہا تھا۔ اپنی راہ میں کسی رکاوٹ تو کیا آزمائش کا بھی اس نے گمان نہیں کیا تھا اور اس وقت تو وہ کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ ذہن پر ابا کی آواز ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"وٹہ سٹہ... وہ بدلے میں تاجور مانگتا ہے۔"

"نہیں...!" وہ پورا پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ گھبرا کر بالکونی میں نکل آیا۔ اس تمام عرصے میں آج پہلی بار وہ اجالے میں بالکونی میں کھڑا تھا۔

وسط دسمبر کی ہلکی دھوپ ابھی باقی تھی۔ گو کہ سردی نے ابھی اپنا رنگ نہیں جمایا تھا لیکن خوش گوار ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اگر اپنے حواس میں ہوتا تو ضرور سوچتا کہ وہ کتنی سہانی شاموں سے محروم رہا تھا۔ پھر اسے ملال بھی ہوتا، جبکہ اب کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ نیچے کمپاؤنڈ میں کھیلتے بچوں نے اودھم مچا رکھا تھا، لیکن اس کے کان اس شور سے بھی آشنا نہیں ہو رہے تھے۔ کتنی دیر وہ ماؤف ذہن کے ساتھ بچوں کی ہلڑ بازی دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں بھٹکی تھیں۔ سامنے کے اپارٹمنٹس سے دو لڑکیاں سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ عجیب بے خودی تھی۔ وہ خود کو بھی فراموش کیے کھڑا تھا کہ اچانک اس کے ذہن کو جھٹکا لگا تھا اور یونہی نہیں۔ نظروں کے سامنے جو دو لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک مہارت سے بائیک اسٹارٹ کر کے بیٹھی اور زن سے بھگا لے گئی تھی۔

اور اسے لگا جیسے اس نے ابھی ابھی جنم لیا ہے۔ اس سے پہلے وہ کہیں نہیں تھا۔ اس کے احساسات کو پھر سے زندگی ملی تھی۔ وہ اب دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا اور سوچنے بھی لگا تھا۔

* * *

"رازی بھائی پلیز! چلیں ناں، سنبل آپی نے اتنے اصرار سے بلایا ہے۔" ثنا صبح سے رازی کی خوشامد کر رہی تھی۔ اور اب تو رونے کو ہو گئی تھی۔

"تم بلال کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟" رازی اس کی رونی صورت دیکھ کر صاف انکار بھی نہیں کر سکا۔

"نہیں بھائی! بلال تمام راستہ ڈانٹتے ہوئے جاتا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی اس کے ساتھ۔" ثنا نے مزید منہ پھلا کر کہا۔

"میں سمجھا دیتا ہوں اسے۔ نہیں ڈانٹے گا۔"

"رہنے دیں، میں نہیں جا رہی۔" ثنا ناراض ہو کر جانے لگی، تب مجبوراً" رازی کو اٹھنا پڑا۔

"اچھا چلو، اور دیکھو زیادہ دیر وہاں مت رکنا۔"

"نہیں، بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے۔" ثنا خوش ہو گئی۔

"امی کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔ کچھ آؤٹنگ ہو جائے گی ان کی۔" رازی نے اس کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"سوچ لیں! امی ساتھ جائیں گی تو پھر جلدی واپسی نہیں ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ماموں جی رات میں روک لیں۔" ثنا نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گئی۔

"اچھا جاؤ، امی سے کہہ آؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ثنا نے کھڑے کھڑے ساجدہ بیگم کو رازی کے ساتھ جانے کا بتایا، پھر بھاگتی ہوئی آ کر گاڑی میں بیٹھی تھی۔ شاید اسے خدشہ تھا کہ کہیں رازی کا ارادہ بدل نہ جائے۔ رازی نے اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی پھر پوچھنے لگا۔

"سنبل نے کس سلسلے میں بلایا ہے؟"

"یہ تو [illegible] نہیں بتایا۔"

"تم نے پوچھا بھی نہیں۔"

"اوہو بھائی! ہو گی کوئی بات۔ ہو سکتا ہے سرپرائز ہو یا پھر صرف محبت میں بلایا ہو۔ میں بھی تو انہیں بلاتی ہوں۔" ثنا اس کے سوالوں سے تنگ پڑ کر بولی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن سنبل کے ساتھ تمہاری دوستی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا مطلب ہے اس کی اور تمہاری عمر میں کافی فرق ہے۔" رازی کے اندر کوئی کھوج نہیں تھی۔ سیدھے سادے انداز میں بات کر رہا تھا۔

"تو کیا ہوا! سنبل آپی کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ ہماری ماموں زاد ہیں اور رشتہ داری میں عمروں کا فرق آڑے نہیں آتا۔ محبت اور خلوص دیکھا جاتا ہے۔ جہاں سے زیادہ خلوص ملتا ہے' بندہ وہیں بھاگتا ہے۔"

ثنا اندر ہی اندر جز بز ضرور ہوئی لیکن کمال ہوشیاری سے بات سنبھال رہی تھی۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" رازی نے تائید کی تو ثنا کو موقع مل گیا۔

"سچ بھائی! مجھے شروع سے سنبل آپی بہت اچھی لگتی ہیں۔ اتنی محبت کرنے والی' میرا دل چاہتا ہے انہیں اپنے گھر لے آؤں۔"

"ابھی تو اس کا گھر آگیا۔" رازی نے گاڑی روک کر ثنا کو دیکھا۔

"اتنی جلدی!" ثنا کو افسوس ہوا کہ ابھی تو اس نے اصل بات شروع کی تھی۔

"اب تم بھی واپسی کی جلدی کرنا۔" رازی نے پھر اسے تنبیہہ کی اور گاڑی لاک کر کے اس کے ساتھ اندر آیا تو پہلے مقام پر ماموں جی اور مامی جی سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں نے اس کی آمد پر جہاں خوشی کا اظہار کیا' وہاں شکوہ بھی کہ وہ ادھر کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔

رازی نادم سا ہو کر وضاحتیں دینے لگا تو ثنا جلدی سے سنبل کے کمرے میں آگئی۔

"ارے تم کیسے آگئیں؟" سنبل اچانک ثنا کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"رازی بھائی کے ساتھ۔" ثنا نے اترا کر شوخی سے بتایا تو سنبل جھینپ کر بولی۔

"تو فرصت مل گئی انہیں۔"

"ارے! آپ کے لیے تو فرصت ہی فرصت ہے۔ پتا ہے صبح سے یہاں آنے کو بے قرار تھے۔ میں ہی کاموں میں الجھی ہوئی تھی۔ خیر اب آپ دیر نہ کریں' جلدی سے انہیں اپنا دیدار کرا دیں۔" ثنا بہت چہکنے لگی تھی۔

"دہشت' ایسی باتیں نہیں کرتے۔" سنبل نے مصنوعی خفگی سے گھورا تھا۔

"اچھا آپ چلیں تو۔" ثنا نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو وہ جلدی سے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی' پھر ثنا کو چلنے کا اشارہ کر کے اس کے ساتھ لاؤنج میں آگئی۔

رازی ماموں جی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ مامی جی جیسے سنبل کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی محض رازی کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی خاطر اونچی آواز میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

"بیٹا! چائے لے آؤ جلدی۔"

"جی!" سنبل نے پلٹنے سے پہلے رازی کو دیکھا اور اسے متوجہ نہ پا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ثنا پریشان ہو کر اس کے پیچھے بھاگی آئی کہ کہیں جھوٹ کا پول نہ کھل جائے۔ الزام مامی جی کے سر رکھ دیا۔

"مامی جی بھی بس' کیا ضرورت تھی فوراً" چائے کا کہنے کی۔ ہیلو ہائے تو ہونے دیتیں۔ بے چارے رازی بھائی بس۔"

سنبل کچھ نہیں بولی' نہ ہی اس کی طرف دیکھا۔ خاموشی سے ایک چولہے پر چائے کا پانی رکھا' دوسرے پر کباب

تلنے میں مصروف ہو گئی۔

"اوہو سنبل آپی! اب آپ تو نہ اپنا موڈ خراب کریں۔" ثنا کو کھسیاہٹ میں اب کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

"میرا موڈ ٹھیک ہے' تم چلو' میں یہ لے کر آتی ہوں۔" سنبل نے کباب پلیٹ میں نکالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ارے واہ' میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں جو جا کر آرام سے بیٹھ جاؤں اور یہ آپ اتنا تکلف کیوں کر رہی ہیں؟ بس چائے ٹھیک ہے' ویسے بھی رازی بھائی اس وقت کچھ نہیں کھاتے۔"

"نہیں صرف رازی کے لیے تو نہیں بنا رہی۔ چلو! یہ ٹرے لے جاؤ۔" سنبل نے کہتے ہوئے ٹرے اٹھا کر ثنا کے ہاتھوں میں تھما دی۔

"اور آپ؟" ثنا اندر سے کچھ خائف ہو گئی تھی۔

"میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"جلدی آیئے گا۔" ثنا کو فی الوقت بھاگنے میں عافیت نظر آئی۔ لیکن وہ ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اریبہ کا پتا صاف کر کے رہے گی اور سنبل کو ہی اپنی بھابھی بنائے گی۔

* * *

خاصا خوش گوار ماحول تھا۔ یاسمین اور شہباز ربانی' اریبہ اور سارہ کو اپنے بچپن کے قصے سنا رہے تھے اور وہ دونوں بڑی محظوظ ہو رہی تھیں کہ اچانک یاد آنے پر سارہ بولی تھی۔

"ارے آج تو ویک اینڈ ہے' ڈیڈی آئیں گے۔"

یاسمین نے ایک دم شہباز ربانی کو دیکھا۔ وہ بھی اس خبر سے کچھ بے چین ہو گئے تھے۔

"ہاں... کہا تو ڈیڈی نے یہ ہی تھا کہ اب ہر ویک اینڈ پر آیا کریں گے' دیکھو۔"

اریبہ کے انداز میں بے اعتباری تھی' پھر شہباز ربانی سے پوچھنے لگی۔ "انکل آپ ڈیڈی سے ملے ہیں؟"

"ہوں...!" شہباز ربانی چائے کا سپ لے رہے تھے۔ کپ نیچے کر کے "ہوں" کی آواز سے زیادہ گردن اثبات میں ہلائی' پھر کہنے لگے۔ "شادی میں ملاقات ہوئی تھی' اس کے بعد دو ایک بار سامنا ہوا' پھر میں باہر چلا گیا۔ اب تو شاید وہ مجھے پہچانیں گے بھی نہیں۔"

"آپ انہیں پہچان لیں گے؟" سارہ نے فوراً" پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ اگر ان میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہو گی تو ضرور پہچان لوں گا۔" شہباز ربانی نے قصداً" محظوظ انداز اختیار کیا' پھر یاسمین کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ کسی سوچ میں بیٹھی تھی۔

"چلیں دیکھتے ہیں ڈیڈی آپ کو پہچانتے ہیں کہ نہیں۔" سارہ نے مشتاق انداز میں کہا تب ہی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو اریبہ بے ساختہ حیرت سے بولی تھی۔

"واقعی ڈیڈی آگئے۔"

یاسمین نے چونک کر اریبہ کو دیکھا' پھر ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چونکہ اریبہ کے سامنے وہ اپنا خدشہ بیان کر چکی تھی کہ توصیف احمد' شہباز ربانی کے آنے پر اعتراض کریں گے' اس لیے اسے یاسمین کے جانے پر تعجب نہیں ہوا' البتہ سارہ ضرور حیران تھی۔

شہباز ربانی کو اپنی پوزیشن عجیب ڈگ لگ رہی تھی' خود کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ توصیف احمد بیٹیوں کو دیکھ کر اسی طرف آگئے تو وہ دونوں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

"السلام علیکم ڈیڈی!"

"وعلیکم السلام!" توصیف احمد بہت اچھے موڈ میں تھے' خوش ہو کر جواب دیا' پھر شہباز ربانی پر نظر پڑی تو نہ صرف ٹھٹکے بلکہ پیشانی پر شکنیں بھی نمودار ہو گئی تھیں۔

"ڈیڈی! یہ شہباز انکل ہیں' مما کے بھائی۔ آپ تو جانتے ہوں گے انہیں۔" اریبہ نے ان کی پیشانی سکڑتے دیکھ کر فوراً" تعارف کرایا۔

"جانتا تو نہیں ہوں' بس ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ ہیلو!" توصیف احمد نے اریبہ کو جواب دے کر شہباز ربانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

"ہیلو۔" شہباز ربانی نے اٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"فرسٹ کلاس' آپ کب آئے؟" توصیف احمد کا انداز بے حد سرسری تھا۔

"کچھ دن ہوئے۔" شہباز ربانی نے بتایا اور اس سے پہلے کہ توصیف احمد کوئی اور سوال کرتے اریبہ بول پڑی۔

"ڈیڈی! آپ بیٹھیں نا۔ سارہ! ڈیڈی کے لیے چائے لاؤ۔"

"میرا خیال ہے ڈیڈی پہلے چینج کریں گے۔ کیوں ڈیڈی!" سارہ نے کہہ کر توصیف احمد سے تصدیق چاہی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا۔

"آپ کی مما کہاں ہیں؟"

"اندر ہیں۔ چلیں میں آپ کے کپڑے نکال دوں۔ میں نے صبح ہی پریس کر دیے تھے۔" سارہ اپنے انداز میں بولتی ہوئی توصیف احمد کے ساتھ اندر چلی گئی تب اریبہ نے شہباز ربانی کی طرف دیکھا تھا۔ شہباز ربانی بہت اداس لگ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

یاسمین جانتی تھی کہ توصیف احمد اس سے شہباز ربانی کے بارے میں سوال جواب ضرور کریں گے اور اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ خصوصاً" توصیف احمد کے ساتھ آرام سے بات کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بہت جلدی آپے سے باہر ہو کر چیخنے چلانے لگتی تھی' لیکن ابھی وہ ایسا نہیں چاہتی تھی' کیونکہ گھر میں شہباز ربانی موجود تھے' اس لیے وہ خود کو بہت سمجھا کر کمرے میں آئی تھی۔

توصیف احمد صوفے پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ فوری طور پر انہوں نے یاسمین کے آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ آرام سے کافی پینے میں مصروف رہے۔ یاسمین گزشتہ کی طرح پہلے واش روم میں گئی۔ اس کے بعد الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔ توصیف احمد سائیڈ میں بیٹھے تھے۔ الماری کا پٹ کھلا ہونے کے باعث انہیں صرف یاسمین کی پشت نظر آ رہی تھی۔

"شہباز یہیں رہ رہے ہیں؟" توصیف احمد نے کافی کا آخری گھونٹ لے کر یاسمین کو مخاطب کیے بغیر پوچھا تھا۔

"تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" یاسمین گو کہ خود کو بہت سمجھا کر آئی تھی' پھر بھی سیدھا جواب نہیں دے سکی۔

"بالکل!" توصیف احمد خالی مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اور یہ محض اعتراض نہیں ہے تمہیں خود سمجھنا چاہیے' گھر میں جوان بیٹیاں موجود ہیں۔"

"تو۔۔۔" یاسمین نے زور سے الماری کا پٹ بند کر کے انہیں خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

"کنٹرول یور سیلف یاسمین! چیخ چلا کر اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش مت کیا کرو۔" انہوں نے انتہائی سخت لہجے میں ٹوکا۔

"کیا غلطی کی ہے میں نے؟ برسوں بعد میرا کوئی عزیز باہر سے آیا ہے' اگر میں نے اسے یہاں ٹھہرا لیا ہے تو کون سی قیامت آ گئی ہے۔" یاسمین نے آواز دبالی تھی' لیکن لہجہ ہنوز تیکھا سلگتا ہوا تھا۔

"شٹ اپ' مجھے تمہارا کوئی عذر نہیں سننا۔ اپنے عزیز سے کہو اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لے' میرے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔" انہوں نے غصے سے کہا۔

"ٹھیک ہے تو پھر ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔" یاسمین نے دھمکی دی۔

"ہم سے مطلب؟" توصیف احمد کی آواز جانے غصے کی انتہا پر جا کر دم توڑ گئی تھی یا یاسمین کی دھمکی کام کر گئی تھی۔

"میں اور میرے بچے۔" یاسمین گردن اکڑا کر بولی تھی۔

"بچے؟ بچوں کا نام مت لینا' اگر تم نے کبھی ایسا سوچا بھی تو میں انجام کی پروا کیے بغیر تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" ان کے لہجے کی سنگینی سے یاسمین مرعوب نہیں ہوئی' الٹا ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی۔

"بس توصیف! اپنی انرجی ویسٹ مت کرو۔ بچوں کی نظروں میں اب تمہارا وہ مقام نہیں رہا' تم نے خود اپنے آپ کو ان سے دور کیا ہے۔ اس کے بعد تم یہ توقع کیسے کر رہے ہو کہ بچے مجھے اکیلا کہیں جانے دیں گے؟ جہاں میں جاؤں گی' وہ میرے ساتھ جائیں گے۔"

"لگتا ہے شہباز ربانی نے بڑا آسرا دے دیا ہے تمہیں۔" توصیف احمد نے چبھتا ہوا طنز کیا' یاسمین تلملا گئی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو' مجھے تمہیں آئینہ دکھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" توصیف احمد کہہ کر کار نر کی طرف بڑھ گئے۔ گاڑی کی چابی اٹھائی' پھر اسے دیکھ کر بولے تھے۔

"میں جا رہا ہوں۔ دوبارہ آؤں تو شہباز ربانی یہاں نہیں ہونا چاہیے۔"

"وہ اپنی مرضی سے یہاں نہیں رہ رہا۔" یاسمین بتانا چاہتی تھی کہ اریبہ زبردستی اسے لے کر آئی ہے' لیکن توصیف احمد اس کی بات پوری ہونے تک رکے ہی نہیں' یوں اس کے قریب سے نکل کر گئے جیسے کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔

یاسمین کھولتی رہ گئی' اپنی بے بسی پر' کیونکہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ خواہ کتنی من مانی کر لے' اس گھر میں وہی ہو گا جو توصیف احمد چاہیں گے۔ وہ کسی طرح بھی انہیں یہاں سے مکمل طور پر بے دخل نہیں کر سکتی۔ گھر ان کا' اولاد ان کی اور وہ گھر اور اولاد کی تمام ذمہ داریاں نبھا بھی رہے تھے۔ اگر ان کی طرف سے کوئی کوتاہی ہوتی تب تو وہ ان کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا سکتی تھی مگر ایسا نہیں تھا' جب ہی اس نے اریبہ پر گرفت رکھی تھی اور اسے اپنے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ ابھی بھی اس سے صبر نہیں ہوا' اسی وقت اریبہ کے کمرے میں آ گئی۔

اریبہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی اسٹڈی میں مصروف تھی اور سارہ بیڈ پر نیم دراز کسی میگزین میں محو۔ دروازہ کھلنے پر دونوں ہی ادھر متوجہ ہوئی تھیں۔

"تم دونوں ابھی سوئی نہیں؟" یاسمین دونوں کے دیکھنے پر فوراً" یہی کہہ سکی۔

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں مما!" اریبہ نے وال کلاک پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"ڈیڈی سو گئے؟" سارہ نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' وہ چلے گئے۔" یاسمین نے یوں نگاہیں چرائیں جیسے پشیمان ہو رہی ہو۔

"کیوں؟" سارہ کے لہجے میں حیرت کے ساتھ احتجاج بھی تھا۔

اریبہ نے ایک نظر سارہ کو دیکھا‘ پھر اٹھ کر یاسمین کے قریب چلی آئی۔

“کیا ہوا مما! کیوں چلے گئے ڈیڈی؟”

“بیٹا وہ شہباز‘ میرا مطلب ہے ان ہی کی وجہ سے‘ اب بتاؤ میں شہباز سے کیسے کہوں کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔” یاسمین بے بسی کی تصویر بن گئی۔

“اوہو مما! آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں‘ آیئے! یہاں بیٹھیں۔” اریبہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ پر بٹھایا‘ پھر پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

“آپ بتائیں‘ کیا کہا ہے ڈیڈی نے؟”

“ناراض ہو رہے تھے کہ شہباز یہاں کیوں آئے ہیں اور یہ کہ میں انہیں فوراً” جانے کا کہہ دوں۔ میرے لیے تو یہ بہت مشکل ہے بیٹا! تم کسی طرح...” یاسمین نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ توصیف احمد کو ناراض نہیں کر سکتی۔

“آپ بھی کمال کرتی ہیں مما! گھر آئے مہمان سے ہم کہیں کہ اپنا بوریا بستر سمیٹو‘ ابھی اسی پل‘ ایسی غیر اخلاقی حرکت میں کروں گی نہ آپ۔” اریبہ ہتھے سے اکھڑنے لگی تھی۔

“تو پھر کیا کریں بیٹا! تمہارے ڈیڈی بھی تو...” یاسمین الجھنے لگی۔

“ڈیڈی کچھ بھی کہیں۔ آپ شہباز انکل سے جانے کو نہیں کہیں گی۔ آخر” “آخر رواداری بھی کوئی چیز ہے۔ ناپسندیدہ مہمانوں سے بھی بندہ ایسا سلوک نہیں کرتا‘ حیرت ہو رہی ہے مجھے ڈیڈی پر۔” اریبہ برہمی سے کہتے ہوئے آخر میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

“ویسے کچھ دنوں کی بات ہے۔ شہباز گھر دیکھ رہے ہیں۔” یاسمین سوچنے کے انداز میں بولی تھی۔

“چلیں‘ آپ پریشان نہ ہوں۔ ڈیڈی کو ہم منا لیں گے۔” اس نے کہہ کر سارہ کو دیکھا۔ وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے کچھ پریشان بیٹھی تھی۔

* * *

وہ رات بہت دیر سے یہاں پہنچا تھا۔ شہر کی نسبت یہاں سردی زوروں پر تھی۔ وہ بس کھڑے کھڑے ہی اماں سے ملا‘ پھر جو موٹے لحاف میں گھس کر سویا تو اگلے دن دوپہر میں اٹھا تھا۔ خلاف توقع کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس نے گردن اونچی کر کے ادھر ادھر دروازے سے باہر تک نظر دوڑائی‘ پھر بہن کو پکارنے لگا۔

“تاج... تاجور!”

“جی بھائی!” تاجور بھاگی آئی تھی۔ “آپ اٹھ گئے؟”

“اٹھ ہی گیا ہوں۔” وہ اپنے پیچھے تکیہ اونچا کر کے بیٹھا‘ پھر پوچھنے لگا۔ “باقی سب کہاں ہیں؟”

“ابا تو شام میں ہی آتے ہیں۔ خالہ روٹی پکا رہی ہیں‘ آپ تو پہلے چائے پیو گے؟” تاجور نے جواب کے ساتھ کہا۔

“ہاں‘ لیکن ابھی تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔” اس نے کہنے کے ساتھ کھسک کر تاجور کے لیے جگہ بنائی تو وہ آکر بیٹھ گئی۔

“اب پہلے اپنا حال چال سناؤ‘ اچھی تو ہو نا؟” اس نے تاجور کے روکھے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

“جی بھائی‘ میں ٹھیک ہوں‘ پر وہ تاباں ہے نا‘ وہ بہت رو رہی تھی۔” اس معصوم لڑکی کو اپنا غم نہیں تھا بھائی اور تاباں کے لیے پریشان تھی۔

“کیوں... کیوں رو رہی تھی؟” اس نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

“وہ پتا نہیں۔” تاجور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

“پاگل ہے۔” اس نے سر جھٹکا‘ لیکن تاباں کا خیال نہیں جھٹک سکا تھا۔ جب ہی ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

“بھائی! چائے لاؤں؟” قدرے رک کر تاجور نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

“چائے...” تاجور جانے کیوں خائف ہو گئی تھی۔

“ہاں! بنا دو۔” اس نے کہا پھر ایک دم تاجور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ “ایک منٹ! یہ تمہاری گردن پر نشان کیسا ہے؟”

“کہاں؟” تاجور مزید سہم گئی۔

“یہ...” اس نے انگلی کی پور سے نشان کو چھوا تو تاجور کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکی نکل گئی۔

“درد ہو رہا ہے۔” وہ فوراً انگلی کھینچ کر تاجور کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔ “کیا ہوا ہے؟”

“وہ... بھائی دوپٹہ پھنس گیا تھا۔” تاجور کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا‘ جھوٹ بول رہی ہے۔

“دوپٹہ پھنس گیا تھا‘ کیسے؟” وہ اچانک بہت پریشان اور مشکوک ہو گیا تھا۔

“نہیں۔ وہ میرے گلے میں دوپٹہ تھا۔ کاکے نے کھینچا تو یہاں سے چھل گیا تھا۔ اب تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ درد بھی نہیں ہے۔” تاجور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

“تم سچ کہہ رہی ہو؟”

“ہاں‘ سچی بھائی! میں چائے لاتی ہوں۔” تاجور اٹھ کر تیزی سے بھاگی تھی۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں تو چھم سے اماں کا چہرہ سامنے آگیا۔

“میں کیا کروں اماں! تاجور کے لیے ہی سوچا تھا کہ شادی کر لوں‘ پھر بیوی کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا‘ پر یہاں تو اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔” وہ دل ہی دل میں اپنی اماں سے باتیں کر رہا تھا کہ دوسری اماں کی آواز پر چونک کر آنکھیں کھول دیں‘ وہ کہہ رہی تھیں۔

“لو‘ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔”

“نہیں بس...” اس نے ان کے ہاتھ سے چائے کا مگ لے لیا۔

“روٹی پک گئی ہے‘ پہلے کھا لیتے‘ پھر چائے پیتے۔” اماں کہتے ہوئے بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ نہیں بولا‘ چائے کا مگ ہونٹوں سے لگا لیا تو قدرے رک کر اماں پوچھنے لگیں۔

“پھر تم نے کیا سوچا؟”

“کس بارے میں؟” وہ قصداً “انجان بن گیا‘ ورنہ ان کے بیٹھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کس مقصد سے بیٹھی ہیں۔

“وہی اپنی اور تاجور کی شادی کا۔” اماں نے جتنے آرام سے کہا اس کے اندر اسی قدر تلخی بھر گئی تھی۔ لیکن وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب ہی ضبط سے گویا ہوا۔

“میری شادی تک تو ٹھیک ہے‘ پر تاجور کی ابھی نہیں۔”

“پھر کب؟” اماں نے بے صبری سے پوچھا۔

“اس بارے میں ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔” اس کی ساری توانائیاں اپنے اندر اٹھتے ابال کو دبانے میں صرف ہو رہی تھیں۔

“لو! پھر تمہاری شادی ابھی کیسے ہو گی۔ وہ تو کہتا ہے پہلے گھر میں بیوی لاؤں گا‘ پھر تاباں کو رخصت کروں گا۔”

“ٹھیک ہے‘ لے آئے بیوی‘ میں انتظار کروں گا۔” وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا‘ کیونکہ اب جو اماں کہتیں‘ وہ سننا نہیں

چاہتا تھا اس لیے تیزی سے باہر نکلا تھا۔

* * *

سانوں اک پل چین نہ آوے
سجنا تیرے بنا

گو کہ دھیمی آواز میں ٹیپ بج رہا تھا۔ پھر بھی آواز باہر تک آرہی تھی۔ سارہ نے قدرے توقف کیا، پھر ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

سمیر ایک بازو آنکھوں پر رکھے سیدھا لیٹا، جانے سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ سارہ کو اندازہ نہیں ہوا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بیڈ کے قریب رک کر چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر بڑھ کر ٹیپ ریکارڈ بند کردیا۔

سمیر نے فوراً آنکھوں سے بازو ہٹایا اور اسے دیکھ کر ناگواری سے بولا تھا۔

"کیوں آئی ہو؟"

"میری پھوپھو کا گھر ہے، جب دل چاہے گا، آؤں گی۔" سارہ نے قصداً بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"پھوپھو کا گھر ہے۔" وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ "تو جاؤ پھوپھو کے پاس۔ میرے کمرے میں کیا لینے آئی ہو؟"

"تمہارے کمرے میں ہے ہی کیا۔" وہ چڑ کر بولی۔

"دیکھو....!" وہ غصے سے انگلی اٹھا کر کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں، ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے ہو۔"

"تمہیں میری ناراضی کی پروا ہے؟" سمیر کا لہجہ ہنوز غصے بھرا تھا۔

"نہ ہوتی تو آتی کیوں؟" وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

"بڑی جلدی آگئیں۔" سمیر نے طنز کیا، جس پر وہ سلگ گئی۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو میرا گھر سے نکلنا کم ہی ہوتا ہے، ابھی بھی کالج سے آرہی ہوں اور اگر اب تم نے کوئی فضول بات کی تو میں اسی وقت چلی جاؤں گی۔"

"ہاں تو جاؤ۔ کس نے منع کیا ہے۔" وہ کہنے کے ساتھ اٹھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

سارہ نے خفگی سے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے، ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری، آ نہیں سکتی تھیں، فون تو کر سکتی تھیں۔" وہ حد درجہ شاکی تھا۔

"ایک بار نہیں، کتنی بار کیا اور پرسوں تو رات گیارہ بجے کیا تھا، تب بھی تم گھر پر نہیں تھے۔ آخر کہاں رہتے ہو؟" وہ باقاعدہ لڑنے پر تیار ہو گئی۔

"کہیں بھی رہتا ہوں۔ تم میرے سیل پر فون کر سکتی تھیں۔"

"جی نہیں، میں نہ سیل رکھتی ہوں، نہ کسی کے سیل پر فون کرتی ہوں۔"

"میں "کسی" نہیں ہوں۔" وہ زور دے کر بولا، پھر ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ "پاگل ہوں میں اپنے آپ جانے کیا کچھ فرض کر لیتا ہوں۔"

"میں تم سے بڑی پاگل ہوں جو یہ سمجھ بیٹھی کہ تم کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے۔" سارہ نے سر جھٹک کر خود پر تاسف کا اظہار کیا۔

"ہاں تو میں کب ناراض ہوا، بس غصہ آتا ہے تمہاری باتوں پر اور جو خوامخواہ کی فکریں تم نے پال رکھی ہیں ہمارے رازی بھائی اور اریبہ کی۔" وہ نرم ضرور پڑ گیا تھا، لیکن شکوہ کرنے سے پھر بھی باز نہیں آیا۔

"تم اسے خوامخواہ کی فکریں سمجھتے ہو۔" وہ انتہائی تاسف سے بولی۔ سمیر سٹپٹا گیا۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے تم کچھ زیادہ ہی...."

"ہاں، میں کچھ زیادہ ہی محسوس کرتی ہوں۔" وہ آزردگی میں گھر گئی۔

"اور یہ ہی میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اپنی عمر دیکھو، اس عمر میں لڑکیاں ہنستی گنگناتی اور خوب صورت خواب سجا کر ان میں کھوئی رہتی ہیں اور تم۔" سمیر نے نرمی سے سمجھانے کے ساتھ اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

"تمہیں لڑکیوں کے بارے میں کیسے پتا؟" وہ الٹا مشکوک ہو گئی۔ سمیر پھر جھنجلا گیا تھا۔

"میں نے پڑھا ہے، فلموں میں بھی دیکھا ہے اور صرف لڑکیاں ہی نہیں لڑکے بھی اس عمر میں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" اس نے پھر بے نیازی دکھائی۔ ایسے وقت وہ یہ ہی کرتی تھی۔ جانے کیوں وہ اسے جھنجلاتا ہوا اچھا لگتا تھا۔ اسے چھیڑ کر وہ محظوظ ہوتی تھی۔

"تم!" سمیر اس کے قریب آکر بولا تھا۔ "تم میرے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں۔ میں جو تم سے اپنی محبت کا اعتراف کر چکا ہوں۔ کیا میرے اعتراف نے بھی تمہاری سوچوں کے در وا نہیں کیے، بولو۔"

"پہلے تم دور ہٹو۔" وہ نروس ہو گئی تھی۔

"اوں ہوں۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔" سمیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے نہیں پتا، بس تم دور ہٹو! ورنہ پھر میں کبھی نہیں آؤں گی۔" وہ اسے دھکیلتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے مت بتاؤ، میں خود جان لوں گا۔" وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا جان لو گے؟"

"یہ ہی کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ ویسے یہ تو میں جان گیا ہوں کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اب خدا کے لیے یہ مت کہہ دینا کہ تم اریبہ، حماد اور رازی کے بغیر بھی نہیں رہ سکتیں۔" سمیر نے دوسری بات ہاتھ جوڑ کر کہی تو وہ بمشکل ہنسی ضبط کر کے بولی تھی۔

"ہاں تو نہیں رہ سکتی ان کے بغیر بھی۔"

"لیکن وہ سب تمہارے بغیر رہ سکتے ہیں۔" سمیر نے زور دے کر کہا۔

"اور تم....؟" اس نے انتہائی معصومیت کا مظاہرہ کیا۔

"میں کیونکہ پاگل، احمق ہوں، اس لیے شاید نہ رہ سکوں، لیکن میں کوشش ضرور کروں گا، بلکہ مجھے ابھی سے پریکٹس شروع کر دینی چاہیے، کیونکہ تمہارا کوئی بھروسا نہیں، دوسروں کی فکروں میں دبلی تو ہو ہی گئی ہو، کسی بھی وقت اس جہان فانی سے کوچ کر سکتی ہو۔" وہ تپ کر بول رہا تھا اور اب وہ کسی طرح اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔

* * *

نہر والے باغ کا وہ مخصوص گوشہ آج بڑے دنوں بعد ان دو محبت کرنے والوں کی آماجگاہ تھا۔ اس گوشے میں مختلف اقسام کے پھولوں کی بہتات تھی۔ رنگ برنگے پھول جنہیں دیکھ کر کچھ کہ وہ باتیں کرتے تو ان کے لہجوں میں بھی پھولوں جیسی نرمی اور خوشبو سما جاتی تھی اور انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کی باتوں سے پھولوں میں کیسی اپیل جچتی تھی۔ بے شک وہ انسان نہیں، جان دار تو تھے۔ خود پر نرم انگلیوں کا لمس محسوس کرتے تھے اور ان کے

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

جانے کے بعد آپس میں ان کی باتیں کرتے اور پھر ان کا انتظار۔۔۔ اور اس بار طویل انتظار کے بعد وہ دونوں آئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی پھولوں میں پہلے معنی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہ خوشبو لہجے سننے کو بے قرار تھے، لیکن یہ کیا۔۔۔

تاباں رو رہی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کی پلکوں سے جدا ہو کر نرم مٹی میں جذب ہو رہے تھے اور شمشیر علی جو ہمیشہ اس کی ذرا سی خفگی پر بے قرار ہو جاتا تھا، وہ خود کو ضبط کے کڑے پہروں میں مقید کیے بیٹھا تھا۔ آنسو پونچھنا تو کجا اسے ٹوکا تک نہیں اور کتنی دیر بعد گویا ہوا تھا۔

"شاید اسی کو قسمت کہتے ہیں۔ جس کے سامنے ہمارے مضبوط عزائم، ارادے اور محبت تک بے بس ہو جاتی ہے، لیکن میں نے تو کبھی خدا کی خدائی کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ ہر موڑ پر اس کا شکر گزار رہا کہ اس نے مجھے ہمت دی، ثابت قدم رکھا، پھر۔۔۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

تاباں اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ کر اسے دیکھنے لگی، پھر ایک دم اس کا بازو تھام کر بولی تھی۔

"میں مر جاؤں گی شمشیر! تمہارے بغیر مر جاؤں گی، کچھ کرو۔"

"کیا کروں؟ سیدھے طریقے سے رشتہ بھیجا تو۔۔۔" وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ پر ابا اپنی بات سے نہیں ہٹے گا۔"

"اور میں اپنی معصوم بہن پر ظلم نہیں کر سکتا۔"

"تو ابھی اس پر ظلم نہیں ہو رہا کیا؟ تم تو شہر میں آرام سے رہتے ہو اور اسے یہاں پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ میرا ابا کم از کم اسے روٹی کو تو نہیں ترسائے گا۔" تاباں نے کہا تو وہ بہت ضبط سے گویا ہوا۔

"خود غرضی مت دکھاؤ تاباں! نہ مجھے اس پر اکساؤ۔ میں اپنے دل کی خوشی کے لیے بہن کو قربان نہیں کر سکتا اور وہ صرف میری بہن نہیں بیٹی بھی سمجھو۔ بچپن میں اسے میں نے لوریاں سنائی ہیں، باہوں میں جھلایا ہے، ماں کی گود تو اسے میسر ہی نہیں آئی۔ اس کے لیے سب کچھ میں تھا اور ہوں اور یہ دوری بھی میں صرف اس لیے برداشت کر رہا ہوں کہ اسے اچھی زندگی دے سکوں اور اگر ابھی میں نے فوری شادی کا سوچا تو وہ بھی اس کی خاطر، کیونکہ میں اسے وہاں اکیلا نہیں رکھ سکتا۔"

"تو تم تاجور کے لیے؟" تاباں اچانک جیسے پاتال میں اتر گئی تھی۔

"ہاں، لیکن اسے تم میری محبت کے ترازو میں مت رکھو۔ تم میری محبت ہو، تاجور میرا فرض اور میں تمہیں صاف بتا دوں اگر محبت اور فرض میں کسی ایک کے انتخاب کا مرحلہ آگیا تو میرے لیے فرض زیادہ اہم ہے۔"

تاباں گنگ ہو گئی تھی، شاید شاکڈ تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گیا، لیکن پھر رہا نہیں گیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے کہنے لگا۔

"دیکھو، اس سے یہ مت سمجھ لو کہ مجھے تم سے محبت نہیں۔ میری محبت صرف تم ہو اور تمہارے حصول کے لیے جو جائز اقدام تھا، وہ میں نے کیا۔ اس سے ہٹ کر اگر تم کچھ چاہو گی تو وہ میں نہیں کر سکتا، کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ میں نے صاف ستھری زندگی گزاری ہے، دوسرے میں بہت پریکٹیکل آدمی ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے ابا کو راضی کر لو کہ وہ وٹے سٹے کی ضد چھوڑ دیں۔"

"ابا نہیں مانے گا۔" تاباں کے حلق سے رندھی آواز نکلی تھی۔

"تم نے کوشش کی؟"

تاباں نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تو کرو کوشش، یہ تمہارا حق ہے۔ میں انتظار کر سکتا ہوں، جتنا تم کہو گی، سال دو سال، دس سال، سمجھ رہی ہو

نا۔“

تاباں نے سمجھنے نہ سمجھنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ سر جھکا کر نرم مٹی پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔

* * *

وہ تاباں کو بھیج کر خود دوسرے راستے سے گھر آیا تھا اور ابھی دروازے پر تھا کہ اندر سے آتی اماں کی تیز آواز پر اس نے قدم روک لیے تھے‘ وہ کہہ رہی تھیں۔

منحوس‘ کرماں جلی! کہہ نہیں سکتی بھائی سے کہ تو اس رشتے پر راضی ہے۔“

”آپ کہہ دو خالہ!“ تاجور کی رندھی آواز منت بھری تھی۔

”کیوں‘ تیری زبان گھستی ہے‘ ایسے تو بڑی میرے خلاف ورغلاتی ہے۔ سب پتا ہے مجھے‘ جتنی چغلیاں تو اس سے کرتی ہے۔“

”نہیں خالہ۔“

”خالہ کی بچی! جانے دے‘ ذرا شمشیر کو‘ پھر دیکھ تیری کیسی گت بناتی ہوں۔“

اس کا دل چاہا ایک دم دروازہ دھکیل کر اندر جائے اور اس عورت کو شوٹ کردے‘ لیکن وہ غصے میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ یہ اس کی ہمیشہ سے عادت رہی تھی۔ پہلے خود پر کنٹرول کرتا‘ پھر سوچ سمجھ کر مقابل کے سامنے جاتا تھا۔ جیسے ابھی تاباں کو اس نے کوئی جھوٹی آس نہیں دلائی تھی۔ سوچ سمجھ کر اور اپنے طور پر فیصلہ کرکے اس سے ملا تھا اور صاف بات کی تھی۔ ابھی بھی وہ اندر جانے کے بجائے گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ بنے چبوترے پر بیٹھ گیا تھا۔ گو کہ اس کا روم روم سلگ رہا تھا۔ تاجور کے لیے تڑپ الگ تھی کہ اسے سینے میں بھینچ کر اپنا مان دے لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے پہلے اپنے غصے پر قابو پانا ضروری سمجھا اور اس سعی میں وہ نڈھال ہو رہا تھا کہ کندھے پر ہاتھ لگنے سے چونک کر دیکھا‘ ابا سر پر کھڑے تھے۔

”کیا بات ہے‘ ادھر کیوں بیٹھا ہے؟“ اس نے بلا ارادہ نفی میں سر ہلا دیا۔

”اندر چل‘ رضائی شزائی میں بیٹھ‘ نہیں تو ٹھنڈ لگ جائے گی۔“

”ٹھنڈ‘ یہاں تو الاؤ دہک رہا ہے۔“ اس نے سوچا‘ پھر ابا کا بازو تھام کر اٹھ کھڑا ہوا‘ حقیقتاً اسے اس وقت سہارے کی ضرورت تھی۔

ابا کے ساتھ اندر آیا تو اس کی نظروں نے پہلے تاجور کو تلاش کیا۔ وہ نل پر جھوٹے برتنوں کے ڈھیر میں بیٹھی تھی جبکہ سردی بڑھ رہی تھی اور وہ جو پہلے غصے کو دبا تا‘ پھر بات کرتا تھا‘ اچانک چیخ پڑا۔

”ابا! کچھ احساس ہے آپ کو کہ نہیں؟ تاجور کی جان دیکھیں اور کام دیکھیں۔ کیوں اسے مارنے پہ تلے ہیں آپ؟“

”ہیں۔“ ابا نے تاجور کو دیکھا‘ پھر اسے دیکھ کر بولے۔ ”برتن دھو رہی ہے‘ کوئی پہاڑ نہیں کھود رہی‘ اور تو فکر نہ کر! یہ مرنے والی نہیں ہے‘ بڑی سخت جان ہے۔“

”ابا!“ اس نے انتہائی تاسف سے ابا کو دیکھا‘ ان سے مزید کچھ کہنا بے کار تھا۔

”چل تو اندر چل‘ وہ برتن دھو کر آجائے گی۔“ ابا کہتے ہوئے اندر چلے گئے تو وہ تیزی سے تاجور کے پاس آیا تھا۔

”اتنی سردی میں پانی میں بیٹھی ہو‘ چلو اٹھو۔“

”بس بھائی! یہ برتن۔“

”بھاڑ میں گئے برتن۔“ وہ دھاڑا تھا۔ تاجور سہم کر رونے لگی‘ لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا اور لحاف میں بٹھا کر کہنے لگا۔

”تم خود اپنی جان کی دشمن ہو۔ کیا ضرورت تھی برتنوں کا ڈھیر لے کر بیٹھنے کی۔ یہ کام دن میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہاتھ دیکھو کیسے ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں۔“ تاجور کچھ نہیں بول پائی۔ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتی رہی۔

”اب خبردار جو یہاں سے اٹھیں تو‘ میں چائے لاتا ہوں۔“ وہ اسے متنبہ کرکے کمرے سے نکل کر کچن میں آگیا‘ یوں بھی کچن کے کام وہ کرلیا کرتا تھا‘ اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ بہت جلدی چائے لے کر واپس اندر آیا تو تاجور لحاف میں منہ گھسیڑے بری طرح کھانس رہی تھی۔

”یا اللہ!“ وہ پریشان ہو گیا‘ چائے کے مگ ایک طرف رکھ کر وہ لحاف کے اوپر سے تاجور کی پیٹھ سہلانے لگا‘ لیکن اس کی کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تب وہ اس کے منہ سے لحاف ہٹا کر کہنا چاہتا تھا کہ ”اٹھو چائے پی لو“ لیکن اسے دیکھتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ کھانسی کے ساتھ تاجور کے منہ سے خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

”تاج!“ اس نے کندھوں سے تھام کر تاجور کو اٹھا دیا۔ ”یہ... یہ کیا ہے‘ یہ خون؟“

تاجور کچھ بول ہی نہیں سکی۔

”کب سے ہے تمہاری یہ حالت؟ مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ اسے جھنجوڑنے لگا‘ پھر پوری قوت سے چیخا تھا۔

”ابا!“ اس کی پکار دور تک سنی گئی تھی اور ابا تو برابر والے کمرے میں تھے‘ پھر بھی نہیں آئے‘ تب وہ ایک دم فیصلہ کرکے بولا تھا۔

”چلو تاج! چلو بیٹا‘ اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔“

پھر اس نے خود ہی اپنے بیگ میں تاجور کے دو سوٹ ڈالے اور اسے گرم شال اوڑھا کر اسی وقت ابا کو کھڑے کھڑے بتا کر اس گھر سے نکل گیا تھا۔

تاجور اس کے ساتھ تھی۔

* * *

اکیڈمی کی لائبریری میں داخل ہو کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اریبہ گلاس ونڈو کے قریب والی ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بھی تھا‘ اس لیے وہ کشمکش و پنج میں پڑ گیا کہ آیا اسے اریبہ کے پاس جانا چاہیے یا نہیں۔ لیکن پھر وہ رہ نہیں سکا اور دیوار کے ساتھ والی رو سے نکل کر اریبہ کی ٹیبل پر آگیا۔

”ہیلو...!“

اریبہ کے ساتھ عروسہ‘ مہک اور جمال بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ اس کی نظریں صرف اریبہ پر تھیں۔

”ایسی کیا ایمرجنسی تھی جو تم یہاں چلے آئے؟“ اریبہ نے آواز دبا کر کہا‘ پھر آس پاس دیکھنے لگی۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ یہاں بات نہیں ہو سکتی‘ جب ہی جھک کر مزید دھیمی آواز میں بولا۔

”باہر چلو‘ بتاتا ہوں۔“ اریبہ تلملائی ضرور‘ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ قریب بیٹھی عروسہ سے کہہ کر اٹھی تو رازی نے فوراً قدم آگے بڑھا دیے‘ پھر لابی کے آخری سرے پر پہنچ کر رک گیا اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے یہاں آنے پر غصے کا اظہار کرے گی‘ لیکن اس کے برعکس وہ سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”ہاں‘ کیا بات ہے؟“

"تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اریبہ نے بہت ضبط سے جواب دیا تھا۔

"پھر آج کالج کیوں نہیں گئیں۔" اس نے پوچھا۔ اریبہ چہرہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی، کیونکہ اب وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ بولتی تو غصہ ظاہر ہو جاتا، جبکہ وہ اسے سرسری لینا چاہ رہی تھی، جب ہی خاموش رہی۔

"دیکھو، یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری جاسوسی کرتا پھر رہا ہوں، اصل میں تم روزانہ میرے آفس کے سامنے سے گزرتی ہو۔ آج دوپہر میں تمہاری بائیک نہیں دیکھی تو مجھے کچھ تشویش ہوئی۔"

"کہ میری بائیک کو کسی ٹرک نے ٹکر مار کر مجھے اوپر تو نہیں پہنچا دیا؟" وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"نہیں، مجھے ایسا خیال نہیں آسکتا۔" وہ کہہ کر کچھ سوچتے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"خیر! تم میری خیریت معلوم کرنے آئے تھے، اب جا سکتے ہو۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"بڑی بے مروت ہو اگر یہاں بیٹھنے کو نہیں کہہ سکتیں تو ساتھ چلنے کا کہہ دو۔" رازی نے شکوہ کیا۔

"تمہیں شاید بے وقعت ہونے کا شوق ہے، جب ہی ایسی باتیں کرتے ہو۔" وہ چیخ کر بولی تھی۔ رازی نظریں جھکا کر ذرا سا مسکرایا، پھر اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں تمہیں بے وقعت ہونے سے بچانا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ کسی دن تم اپنے رویے پر نادم ہو کر میرے پاس آؤ اور کہو 'رازی مجھے معاف کر دو۔'"

"اوہو تو یہ خوش فہمی بھی ہے تمہیں۔" اریبہ کے لہجے میں طنز اور استہزا تھا۔

"خوش فہمی نہیں، مجھے یقین ہے۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"چلو میں دعا کروں گی، تمہارا یقین سلامت رہے۔"

وہ سابقہ انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ رازی نے تاسف سے اس کے پیچھے دیکھا، پھر باہر نکل آیا۔ اس کے اندر مایوسی گھر کرنے لگی تھی، جس سے وہ پریشان ہو گیا، کیونکہ ابھی اس سے تو وہ یقین سے کہہ آیا تھا کہ وہ نادم ہو کر اس کے پاس آئے گی اور یہ محض اس کا خیال نہیں تھا۔ اسے یہی لگتا تھا، پھر اپنے جذبوں پر بھی بھروسا تھا، اس لیے مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔

* * *

اریبہ کے سمسٹر ہونے والے تھے۔ اس لیے وہ غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرنے لگی تھی۔ رازی کے اکیڈمی آنے کو بھی اس نے غیر ضروری کھاتے میں ڈال دیا تھا، جب ہی سارہ سے ذکر نہیں کیا، ورنہ وہ رازی کا غصہ اسی پر اتارتی تھی۔ اس کے خیال میں اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی رازی ان کے درمیان موضوع بن جاتا تھا اور وہ اب اس موضوع کو بھی ختم کر دینا چاہتی تھی، اس لیے اس نے خود بھی زیادہ نہیں سوچا اور اپنی اسٹڈی میں مصروف ہو گئی تھی۔ یوں بھی پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ تھی۔ جو ٹائم ٹیبل بنا لیتی، اس پر سختی سے عمل کرتی تھی۔

اس وقت وہ اکیڈمی جانے کے لیے نکل رہی تھی کہ سارہ کو سمیر کے ساتھ آتے دیکھ کر رک گئی اور کیونکہ سارہ ہمیشہ کی طرح صبح کالج جاتے ہوئے بتا کر گئی تھی کہ وہ امینہ پھوپھو کی طرف جائے گی، اس لیے اس کے قریب آنے پر اریبہ نے کوئی بازپرس نہیں کی، بس اتنا کہا۔

"بہت دیر کر دی۔"

"پھوپھو نے روک لیا تھا۔ کہہ رہی تھیں، شام میں جانا۔" سارہ نے سہولت سے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، اندر جاؤ، اور سنو! مما گھر پر نہیں ہیں۔ میں بھی جا رہی ہوں، گیٹ اچھی طرح بند کر لو۔" اس نے ان ڈائریکٹ سمیر پر جتایا تھا کہ اس وقت اسے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔

"اوکے، میں چلتا ہوں۔" سمیر سمجھ کر فوراً وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ سارہ نے اس کے پیچھے دیکھا، پھر اس سے پوچھنے لگی۔

"مما کب گئی ہیں؟"

"پتا نہیں، میں سو رہی تھی۔ بوا سے پوچھو شاید انہیں پتا ہو۔ اچھا میں چلتی ہوں۔"

اس نے ہیلمٹ سر پر جمایا، پھر بائیک کو زوردار کک مار کر زن سے بھگا دی۔ اسے عروسہ کو بھی پک کرنا تھا۔ صبح کالج میں اس نے کہا تھا کہ اس کی گاڑی خراب ہے۔ لہٰذا اکیڈمی جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے لے۔

عروسہ کی رہائش طارق روڈ پر تھی۔ مین روڈ پر ٹریفک کی زیادتی کا سوچ کر اس نے بہادر آباد کے رہائشی علاقے سے بائیک نکال لی اور آرام سے عروسہ کے گھر پہنچ کر اس کے سیل پر مس بیل دی تو چند لمحوں میں ہی عروسہ آکر اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہیلمٹ تو اتار دو، تاکہ دیکھنے والوں کو پتا چلے کہ میں لڑکی کے ساتھ بیٹھی ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے نا! بس کافی ہے۔" اس نے کہہ کر بائیک بھگا دی۔

"کافی نہیں ہے یار! اگر کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو سو افسانے بنیں گے۔" عروسہ اپنی محتاط طبیعت سے مجبور ہو کر بولی تھی۔

"بننے دو۔ اپنا ضمیر مطمئن ہو تو کسی کی پروا مت کیا کرو، سمجھیں۔" اس نے ذرا سی گردن موڑ کر عروسہ کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن نظریں قریب سے گزرتی گاڑی میں بیٹھے شہباز ربانی سے ہو کر یاسمین پر ٹھہرتے ہی اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا کر گئیں۔

یاسمین، شہباز ربانی کے کندھے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

بشریٰ سعید

سفال گر

ساغرِ جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مدِنظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رتوں' رواجوں' مذہب' سیاست' جذبوں' خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں' کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں' کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو' مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں' میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔

آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں' مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔ یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
کی پیشکش

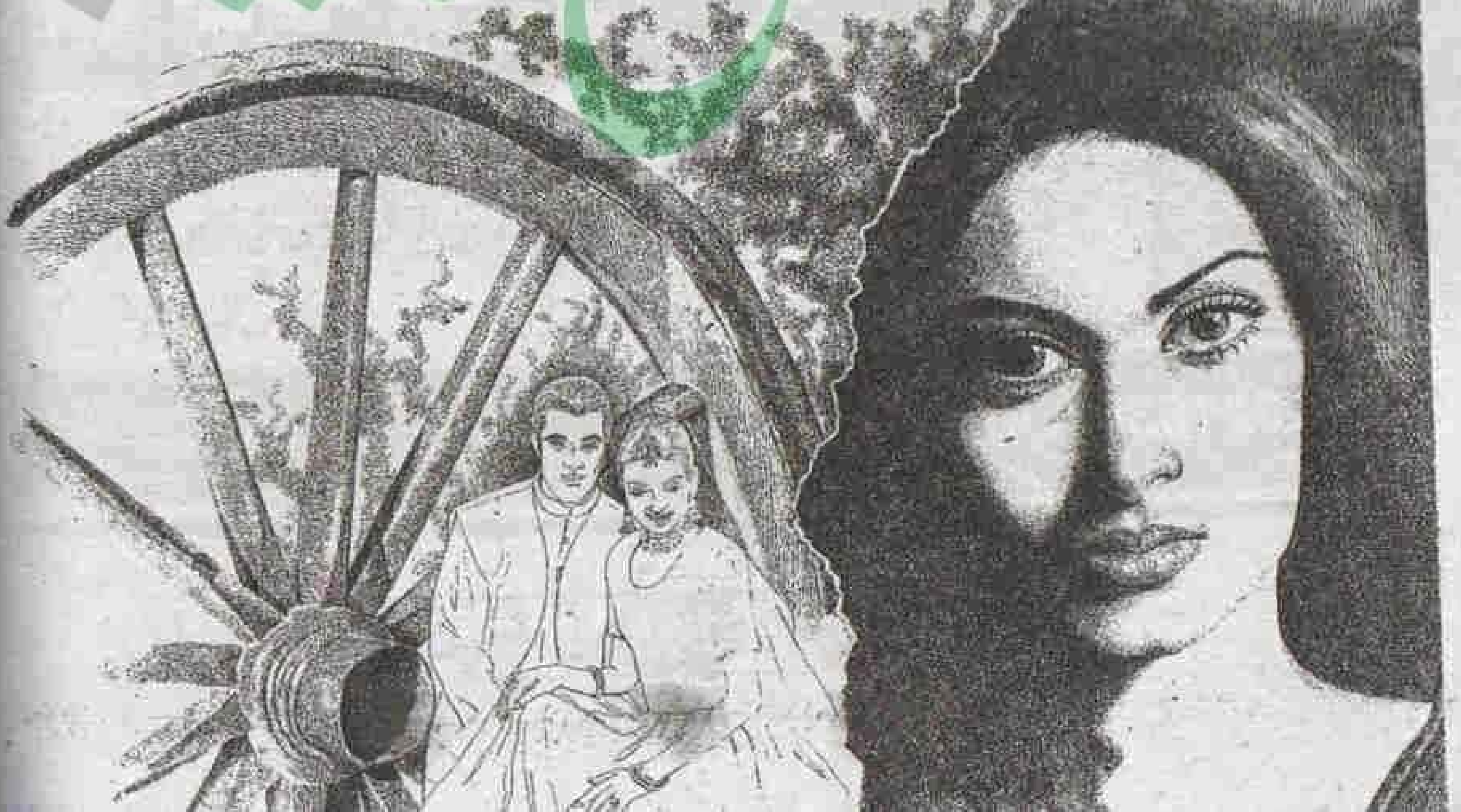

وہ شخص جسے اپنی کُل کائنات مان کر اس نے تمام رشتوں کو بے مصرف کترنوں کی طرح لاتعلقی کے صندوق میں بند کر چھوڑا تھا۔۔۔ جس کے سوا وہ کچھ دیکھتی نہ تھی اور جس کے سوا کچھ سوچتی نہ تھی۔ جس کو اپنا کر وہ خود کو بھول گئی تھی۔ جس کو اپنی زمین سمجھ کر وہ ایک حقیر رینگنے والی بیل بن گئی تھی اور جسے اس نے آسمان کی مانند اوڑھا تھا۔

وہ شخص اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے پچھلے اکیس بائیس سالوں میں اس نے بے شمار دفعہ گرانٹ اور خود کو روبرو سوچا تھا اور وہ گرانٹ سے ہر تکلیف کی امید رکھتی تھی۔ وہ بے رخی سے پیش آسکتا تھا، حقارت ظاہر کرسکتا تھا، اس پر ہنس سکتا تھا، اس سے نفرت کرسکتا تھا۔ لیکن وہ اسے پہچانے گا نہیں، یہ پرنیاں کی ترتیب دی ہوئی ممکنات اور ناممکنات کی فہرست میں کہیں درج نہ تھا۔

"عمر! اسے باہر جانے کو کہو میں کسی اجنبی کو اپنے آس پاس برداشت نہیں کروں گا۔"

وہ اس کی جانب سے رخ پھیرے عمر سے کہہ رہا تھا۔

ایک بار اس نے کہا تھا "تمہیں بھولنا گناہ ہے" اور آج وہ بے دھڑک یہ گناہ کر رہا تھا۔

پرنیاں کے بدن کو دہکتے ہوئے سرخ لوہے سے داغا جارہا تھا۔ وہ نہ آگے بڑھتی تھی اور نہ پیچھے ہٹتی تھی۔ وہ ایک بے جان کنکر تھی۔ اس میں حرکت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی تو وہ کیسے ہلتی۔

"میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں کہ اس عورت کو کمرے سے باہر نکال دو۔"

اب کیا کرنا چاہیے تھا، خاموش رہ کر انتظار کرتی کہ اسے ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکال دیا جائے۔

وہ اس کی زندگی سے بھی تو نکل گئی تھی، کمرے سے نکلنا کیا مشکل تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلنے لگی۔ دروازہ دھکیلتے ہوئے اس کی نظر کاریڈور کے درمیان کھڑے داؤد پر پڑی تو اس نے بے اختیار خود کو روک لیا۔ اسے احساس تھا کہ اس وقت اس کے چہرے اور سرد خانے میں پڑی ہوئی کسی لاش کے چہرے میں کچھ خاص فرق نہیں تھا۔ وہ اس چہرے کے ساتھ داؤد کا سامنا کیسے کرتی؟ وہ دروازے کا پٹ دونوں ہاتھوں میں جکڑے اسی جگہ تھمی رہی۔

"کیا آپ حقیقت میں ان کو نہیں پہچان سکے؟" عمر کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں وہ کون ہیں۔"

"نہیں میں کچھ نہیں سننا چاہتا، تم بھی چلے جاؤ، مجھے تنہا رہنے دو۔"

"مجھے کوشش تو کرنے دیں۔ آپ کو یاد آجائے گا۔"

"میں اسے نہیں بھولا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں، میں چاہ کر بھی اسے نہیں بھول سکتا۔" گرانٹ کی آواز کانپ رہی تھی۔

پرنیاں کو لگا کہ اس کا دل اب کبھی نہیں دھڑکے گا۔

"تو پھر آپ نے انہیں اجنبی کیوں کہا؟"

"کیونکہ اس کے علاوہ۔۔۔ کیونکہ میں کچھ اور نہیں کہہ سکتا تھا، تم کسی کو اندھی کھائی میں دھکا دے کر اسے مرنے کے لیے چھوڑ جاؤ اور وہ زندگی میں کبھی اچانک تمہارے سامنے آجائے تو کیا تم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکو گے؟ کیا تم منہ نہیں چھپاؤ گے۔۔۔؟ میں نے پرنیاں کے ساتھ جو کیا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ خوفناک ہے۔ میں اس کی نظریں اپنے چہرے پر برداشت نہیں کرسکتا۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ عمر! تم میری مدد کیوں نہیں کرتے؟ تم ایک بہت اچھے لڑکے ہو اور بھلے میں نے تمہارے ساتھ کوئی ایک اچھائی بھی نہیں کی، پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ مرنے میں میری مدد کرو۔ ڈرو نہیں میں تمہیں قتل کرنے کو نہیں کہہ رہا۔ تم نے مرسی کلنگ (ازراہِ رحم قتل) کا نام تو سن رکھا ہوگا۔ میرے ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہوگا مجھے تو مرنا ہی ہے۔ اس لمحے نہیں تو چند لمحوں بعد۔ تم ڈاکٹر فرڈیننڈ کو راضی کرو۔ آج تو پرنیاں لوٹ گئی ہے، وہ ایک بار پھر یہاں آگئی تو میں کیا کروں گا۔"

"آپ نے صرف اس لیے انہیں پہچاننے سے انکار کردیا۔ کہ آپ ان کا سامنا نہیں کرسکتے۔ میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔ آپ کو ان سے ملنا ہوگا، ان سے بات کرنا ہوگی۔ میں ابھی ان کو لے کر آتا ہوں۔"

"عمر! میں تمہاری منت کرتا ہوں، مجھے اس آزمائش سے بچالو۔ خدا کے لیے نہ جاؤ۔ میرا قصور معافی کے قابل ہوتا تو میں گڑگڑا کر معافی مانگتا، میں رحم کے لائق ہوتا تو رحم طلب کرتا۔ میں تو ایک نظر کا مستحق بھی نہیں ہوں، تم مجھے اس سے ہم کلام ہونے کو کہتے ہو؟ کیسی نادانی کی بات کرتے ہو۔"

پرنیاں دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ گرانٹ کی آنکھیں اسے دیکھ کر پھیل گئیں، پھر اس نے گردن جھکالی۔

"تمہیں کس چیز کی معافی چاہیے، کہیں تمہیں میرا دل خالی کرنے پر معافی تو نہیں چاہیے؟ مجھے زندہ درگور کرنے پر بھی تمہیں معافی چاہیے ہوگی؟ مجھے دنیا میں تماشا بنانے پر بھی۔۔۔؟ میں کیا کیا معاف کروں؟ تم نے اس وقت مجھے چھوڑ دیا، جب میں تمہاری خاطر ساری دنیا چھوڑ چکی تھی۔ اس کے لیے بھی یقیناً" تمہیں معافی چاہیے ہوگی۔ میں عام تھی، تم نے مجھے خاص کردیا۔ کالک ملے ہوئے چہرے ہجوم میں بھی آسانی سے پہچانے جاتے ہیں، تم نے مجھے ایک تنکے سے بڑھ کر بے وزن کردیا گرانٹ! اس پر بھی تمہیں معافی چاہیے۔ میں کیا کیا معاف کروں؟"

وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو کب کسی کی مانتے ہیں۔ اس پر وہ ہی بیت رہی تھی، جو آگ کی قربت میں موم پر بیتتی ہے۔

"مجھے تمہاری بددعا لگی ہے پرنیاں! دیکھو میں کیا ہوگیا ہوں۔"

اس نے گرانٹ کو روتے دیکھا، پتا نہیں کتنی بار اس نے خواہش کی تھی کہ وہ اسے روتا دیکھے۔ اسے خبر ہی نہ تھی یہ منظر اتنا تکلیف دہ ہوگا۔ وہ بلکنے لگی۔

"میں نے تمہیں بددعا نہیں دی۔ میں نے کبھی تمہیں بددعا دینے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔"

عمر اٹھا اور کچھ بھی کہے بنا کمرے سے چلا گیا، اس کی موجودگی میں دونوں شاید کچھ ہچکچاہٹ محسوس کرتے۔

"تم نے کیوں بددعا نہیں دی؟ مجھے برا بھلا کہو پرنیاں! میرے بوجھ میں اضافہ نہ کرو پرنیاں! پچھتاوے کا ایک پہاڑ ہے، جس کے نیچے میں برسوں سے پس رہا ہوں، دم نکلتا ہے پر نہیں نکلتا، میں نے جب جب تمہیں سوچا، میرے وجود میں ایک خنجر سا گڑ گیا اور میں نے تمہیں کتنی بار سوچا اور کتنے خنجر میرے وجود میں اترے۔۔۔ میں شمار نہیں کرسکتا۔"

"تم پچھتاتے رہے اور میں محبت کرتی رہی۔ تمہیں ان دونوں باتوں کا فرق معلوم ہے گرانٹ؟"

وہ اس کے نزدیک آگئی۔

"تم کیا جانو کہ محبت کرنا کیا ہوتا ہے اپنے ہاتھوں سے خود کو الٹی چھری سے ذبح کرنا اور مرنے کی چاہ میں جیتے رہنا کیا ہوتا ہے۔"

گرانٹ نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ اس کے سوجن زدہ پاؤں اسے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔

"میرے قریب آجاؤ پرنیاں! میں اٹھ نہیں پاتا ورنہ خود تمہارے پاس آجاتا۔"

"جب میں نے تمہیں پاس آنے کو کہا، تم نے مجھے دور کردیا، اب میں کیسے پاس آؤں؟"

وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا اور آنسو بہتے رہے۔

"جب آخری بار میں نے تمہاری آواز سنی تو تم نے کہا تھا۔ الباچ کہہ رہی ہے، تم میرے ماس کے ٹکڑے کاٹ لیتے، مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس ایک جملے سے ہوئی، تم کچھ بھی نہ کہتے، خاموش رہتے۔ میں البا کی باتوں کو جھوٹ مانتی رہتی۔ مجھے اتنا درد تو نہ ہوتا۔"

"اس نے مجھے مجبور کردیا تھا۔ میں اس کی دھمکی سے ڈر گیا تھا، میں اسے ناخوش کرتا تو۔۔۔"

"اس کی خوشی کے لیے تم نے میری زندگی چھین

لی؟" وہ کراہ کر بولی۔

"اس کی خوشی کے لیے نہیں۔ میں اس کی بات تسلیم کرنے سے انکار کرتا تو میرے ہاتھ سے وہ موقع چلا جاتا۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو، تب وہ میرے لیے کتنا اہم تھا۔"

"یہ میری قیمت ہے، جو تم نے مقرر کی۔ ایک "اہم موقع" کے عوض مجھے بیچ دیا۔ ترازو کے ایک پلڑے میں ایک اہم موقع اور دوسرے پلڑے میں غیر اہم پرنیاں۔ جس پلڑے میں پرنیاں تھی، وہ جھکا ہی نہیں، تمہاری پیمائش کو کیا الزام دوں؟ ایک پیمائش میں نے بھی کی تھی۔ ایک پلڑے میں پوری دنیا اور میرا ایمان اور دوسرے پلڑے میں احمد گرانٹ۔ تمہارے والا پلڑا اوپر اٹھا ہی نہیں۔ یہ تمہاری قیمت ہے، جو میں نے طے کی۔"

گرانٹ خاموش رہا۔ اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ دھندلی آنکھوں سے دیر تک پرنیاں کو دیکھتا رہا، پھر اس کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ آگئی۔

پچھلی بار جب ہم ملے تھے تو تم جتنی حسین تھیں، آج بھی ویسی ہی نظر آتی ہو۔ لفظ "حسن" تمہارے لیے ہی بنا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم چاند کی مٹی سے تخلیق ہوئی ہو۔ میں نے درست کہا تھا۔"

"ہوں تو مٹی ہی نا۔ مٹی کا کام ہے مٹی میں مل جانا، تم نے یہی کیا، مجھے مٹی میں ملا دیا۔"

وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تھی، مٹی کے ڈھیر کی مانند کرسی پر گر گئی۔ گرانٹ کے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر آٹھہرے۔ یہ لمس آج بھی اسے جلا رہا تھا۔ گرانٹ کے ہاتھ کی پشت پر دو گرم بوندیں گریں اور پرنیاں کا سر جھک کر اس کے سینے سے آلگا۔

* * *

عمر نے پرنیاں کو کمرے سے باہر آتے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ رو رہی تھی۔ عمر کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے نیچے جا رہی تھی، عمر نے اسے ٹوکا نہیں۔ جب وہ باہر سڑک پر پہنچ گئے تو عمر بولا۔

"آپا! کہاں جا رہی ہیں؟"

"امی کے پاس۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو کیا آپ بس میں جائیں گی؟ میں ڈاکٹر فرڈیننڈ سے کہتا ہوں، وہ آپ کو گاڑی میں بھجوا دیں گے۔"

پرنیاں نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ سڑک کے پار خلا میں گھور رہی تھی۔

"آپا! میرا انتظار کیجیے، میں ابھی..."

پرنیاں نے سرخ آنکھیں اس پر جما دیں اور طیش سے کھولتے ہوئے بولی۔

"دوبارہ مجھے آپا نہ کہنا۔ تم مجھے مخاطب نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں، تمہاری مرضی لیکن ایک اور دفعہ تم نے مجھے آپا کہہ کر بلایا تو میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں گی اور مجھے حق ہے تم پر ہاتھ اٹھانے کا، جاؤ اور جا کر داؤد سے گاڑی بھیجنے کو کہو۔"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ ہکلایا تھا۔

* * *

عمر نے رومال کے کونے سے گرانٹ کے ہونٹوں کی نمی صاف کی اور اس کے ماتھے پر پھسلتے ہوئے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

"آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ آپ سے ملنے کون آیا ہے۔" گرانٹ نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کے پپوٹے لرزتے رہے اور ان پر پسینے کے دھارے گرتے رہے۔

"میری آنکھیں نہیں کھلتیں، مجھے نظر نہیں آتا۔ مجھے دیکھنا ہے، مجھے پرنیاں کو دیکھنا ہے۔" وہ وحشت سے چلانے لگا۔

"میری پرنیاں آخری بار مجھ سے ملنے آئی ہے۔ میں اسے کیسے دیکھوں؟" اس پر رقت طاری ہوگئی۔

پرنیاں آگے آتے ہوئے اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"میں تمہیں دیکھ رہی ہوں گرانٹ! میں تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی اور میں ایک مدت سے ایسا ہی کرتی آ رہی ہوں۔" اس نے انگلیوں کی پوروں سے گرانٹ کے تھرتھراتے ہوئے پپوٹوں کو چھوا۔

اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں اور اس نے پرنیاں کے چہرے کو خود پر جھکے ہوئے دیکھا۔

"پرنیاں! مجھے سینکڑوں فلموں کے مکالمے زبانی یاد ہیں۔ میں ان میں سے کوئی تمہیں سنانا چاہتا ہوں، مگر مجھے وہ یاد کیوں نہیں آرہے جو میں اس وقت بول رہا ہوں، کہیں یہ کسی فلم کے مکالمے تو نہیں۔ کیا یہ کمرا حقیقت میں ایک سیٹ ہے؟ ہاں... تم ایکشن کہو اور میں مکالمے شروع کرتا ہوں، "جنوب کا ایک سپاہی ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ اسکارلیٹ۔ جو اپنے گرد تمہاری باہوں کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے بوسوں کی یادداشتیں اپنے ساتھ جنگ میں لے جانا چاہتا ہے۔ مجھے چاہنے کے بارے میں کچھ خیال نہ کرنا۔ تم وہ عورت ہو جو ایک سپاہی کو اس کی موت کی طرف روانہ کر رہی ہے۔ ایک حسین یاد کے ساتھ، اسکارلیٹ! مجھے بوسہ دو، مجھے بوسہ دو، ایک بار۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔

"کیا میں تمہیں پیار سے اسکارلیٹ پکارا کرتا ہوں پرنیاں! کیا میں واقعی ایک سپاہی ہوں اور میں جنگ پر روانہ ہو رہا ہوں؟"

"عمر! تم کسی کو بلا کر لاؤ۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔" پرنیاں نے روتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

عمر عجلت میں دروازے کی سمت بھاگا۔

گرانٹ کے ہونٹوں پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں۔ آواز نکالنے کے لیے وہ جبڑوں کو بھینچتا اور گردن کو اکڑا کر زور لگاتا۔

"مرنے والوں سے آخری خواہش پوچھی جاتی ہے، تم نہیں پوچھو گی؟"

"مجھے اور کتنا رلاؤ گے گرانٹ! مجھے اتنا دکھی کیوں کرتے ہو؟"

"میری خواہش ہے کہ ہم دونوں پوری رات کھلے آسمان تلے ساحل پر گزاریں۔ سانتا مونیکا بیچ پر... ہم ایک پل بھی نہ سوئیں۔ میں تمہیں کیٹس کی شاعری سناؤں اور چاند کی پریاں ٹھہر کر ہمیں دیکھیں۔"

نہیں، وہاں غوطہ خور ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور وہاں ستارے ٹوٹتے ہیں اور میرے جوتوں میں ریت چلی گئی تو کیا ہوگا...؟"

اچھا تو میں تمہارے سامنے سر کو خم کرتے ہوئے ایک گھٹنا فرش پر بٹھا کر اپنا دایاں ہاتھ تمہیں پیش کروں گا اور فرمائش کروں گا کہ مادموازیل! (فرانسیسی طرز تخاطب) کیا مجھے تمہارے سنگ رقص کرنے کا اعزاز مل سکتا ہے؟"

"اور میں انکار کروں گی، مجھے رقص کرنا آتا ہی نہیں۔"

"تو پھر ہم اس قدیم گاتھک عمارت میں تین جل پریوں والی ناند کے سائے میں چھپ کر بیٹھیں گے۔ وہاں گلابی پنکھڑیوں جیسے پھول ہمارے پیروں کے تلووں کو گدگدائیں گے اور بارش ہوگی تو جل پریاں بھیگ جائیں گی۔"

"لیکن تم بارش میں سگریٹ کیسے پیو گے؟ لائٹر کا شعلہ بار بار بجھے گا اور مجھے ٹھنڈ لگے گی۔ لاس اینجلس کے نومبر میں بھی ٹھنڈ لگتی ہے، کیونکہ ہمارے ہاں صرف ساون میں بھیگا جاتا ہے۔"

"تم نے مجھے اپنا ساون بھی تو نہیں دکھایا۔ بھلا کیسا ہوتا ہے وہ؟"

"اس میں کیچڑ ہوتی ہے، پتنگے اور مینڈک، کچھ آدھے اور کچھ پورے ننگے بچے اور گیت ہوتے ہیں۔ پھول، حبس اور جھولے ہوتے ہیں۔ اور وہ سال کا سب سے خوب صورت وقت ہوتا ہے۔"

"نہیں، سب سے خوب صورت وقت وہ ہوتا ہے، جس میں تم اور میں قریب ہوں اور ہم شادی کی انگوٹھی خریدنا تو بھول ہی گئے۔ اگر وقت اتنا کم نہ ہوتا تو انگوٹھی ضرور بنوا لیتے۔ اب تصویریں اتارتے ہوئے فوٹو گرافر پوچھے گا کہ انگوٹھی کہاں ہے تو تم کیا جواب دو گی۔"

گرانٹ کی آنکھوں کی پتلیاں آدھے گرے ہوئے پپوٹوں کے نیچے گھسنے لگی تھیں اور آواز ڈوب رہی تھی۔

ایک ڈاکٹر، دو نرسیں اور ان کے پیچھے عمر کمرے میں آیا۔ گرانٹ کا معائنہ شروع کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پرنیاں اور عمر کو باہر جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ دونوں کمرے کے دروازے کے سامنے کاریڈور میں کھڑے رہے اور ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ خاصی دیر بعد دروازہ کھلا تھا۔ رخصت ہونے سے قبل ڈاکٹر نے عمر کو ایک طرف لے جاتے ہوئے اس سے کچھ کہا تو پرنیاں بغور ان کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟" ڈاکٹر کے جاتے ہی اس نے عمر سے سوال کیا۔ وہ چپ تھا۔ اس کی خاموشی بیان سے زیادہ پریشان کن تھی۔ پرنیاں سے سوال دہرایا نہیں گیا۔

"میں دعا کرتا ہوں۔ آپ بھی دعا کیجئے۔ اللہ اس مشکل کو ان پر آسان کردے۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عمر نے کہا تھا۔

* * *

"میں کلمہ پڑھنا چاہتا ہوں۔" گرانٹ بڑبڑایا۔

"اگر آپ آسانی سے کلمہ طیب کے الفاظ ادا کرسکتے ہیں تو ضرور پڑھیں آپ بہت اچھا محسوس کریں گے۔"

عمر نے کہا تو گرانٹ سہمی ہوئی نظروں سے اسے تکنے لگا تھا۔

"مجھے...... مجھے یاد نہیں آرہا۔" اس نے شرمندگی اور خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں، آپ گھبرائیں نہیں۔ میں پڑھتا ہوں اور آپ میرے پیچھے دہراتے رہیں۔ آپ کو یاد آجائے گا۔ کہیے "نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا۔""

"نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا۔" گرانٹ نے پرنیاں کا بازو زور سے دبوچ رکھا تھا۔

"نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔" اس کی زبان سے خودبخود ادا ہوا۔

اس کی گردن کی تنی ہوئی رگوں میں نرمی آگئی۔ اس کے چہرے پر رنگ لوٹ آیا۔ پھر وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں چلا گیا۔ اس کا تنفس اتنا پرشور تھا، جیسے کوئی زنگ کھائی چرخی لوہے کے تنگ کڑے میں گھوم رہی ہو۔ پرنیاں نے اپنے بازو سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے گود میں رکھ لیا اور بے خیالی میں اس پر پھیلے ہوئے روئیں کو انگلیوں سے محسوس کرنے لگی۔

عمر نے اٹھتے ہوئے قمیص کی آستینیں کہنیوں سے اوپر چڑھائیں اور وضو کرنے چلا گیا۔ واپس آکر وہ بستر پر گرانٹ کے سرہانے بیٹھا اور تسمیہ پڑھنے لگا۔

"یاسین
قسم ہے قرآن حکیم کی
یقیناً "تم رسولوں میں سے ہو
سیدھے راستے پر ہو۔"

اس نے آیات کی تلاوت کا آغاز کیا۔

"یہ (قرآن کریم) نازل کردہ ہے، غالب اور مہربان ہستی کا۔

تاکہ تم متنبہ کرو ایسی قوم کو کہ نہیں متنبہ کیے گئے ان کے باپ دادا، اسی وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔"

گرانٹ کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے عمر کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیا پڑھ رہے ہو؟"

"سورہ یاسین۔ یہ قرآن کا دل ہے۔ جب کوئی سخت تکلیف میں ہو تو اسے پڑھنے کی ہدایت ہے۔"

گرانٹ کو یاد آگیا۔ اس کے باپ نے اسے یہ سورہ یاد کرائی تھی۔ اسے اپنے باپ کی موت یاد آگئی۔ اس نے خود کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کی بیلٹ تھی اور ابراہیم ایک کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرتے تھے، جو اس کی بے ترتیب داڑھی کو بھگو رہے تھے۔ اچانک ابراہیم حرکت میں آیا اور ایک سفید گٹھڑی اس پر اچھال دی۔ اس نرم گٹھڑی نے اس کی ناک اور منہ کو ڈھانپ لیا تھا۔ دراصل وہ ایک تکیہ تھا۔ جو اس کے چہرے سے الگ نہ ہوتا تھا۔ اس نے سانس لینا چاہا۔

سانس کہاں تھی؟ وہ کہیں نہیں تھی۔

عمر کی آواز بلند ہورہی تھی۔

"یقیناً "پوری ہوچکی اللہ کی بات ان میں سے اکثر پر لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

بلاشبہ ہم نے ڈال دیے ہیں ان کی گردنوں میں طوق کہ وہ ٹھوڑیوں تک ہیں تو یہ اوپر کو منہ اٹھائے رہ گئے۔"

ابراہیم نے کہا تھا کہ اس سورہ کو پڑھنے سے تکلیف کم ہوجاتی ہے تو پھر تکلیف بڑھتی کیوں جارہی تھی۔ اس کی آنتوں اور سارے اندرونی اعضاء کو آپس میں گانٹھیں دے کر ایک گچھا سا بنا دیا گیا تھا اور وہ گچھا کسی کانٹوں بھری جھاڑی میں الجھ گیا تھا۔

وہ ایک برف سے اٹے ہوئے میدان میں بھاگ رہا تھا اور اس کی موٹی اونی جراب گیلی ہوچکی تھی۔ وہ گھٹنوں تک برف میں دھنسا جاتا تھا، پھر اس کے آگے بھربھری برف میں سے پام کے دو درخت پھوٹ نکلے جو چشم زدن میں آسمان تک اونچے ہوگئے۔ وہ رک گیا اور اس نے مڑ کر دیکھا۔

ستواں ناک اور بجھی ہوئی نیلی آنکھوں والی لڑکی ننوں کا مخصوص لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے گالوں پر بہت سے زرد اور بھدے تل تھے۔ وہ اسے نہیں پہچانتا تھا۔ ایک گڑگڑاہٹ گونجی اور پام کے درخت اس پر ڈھیر ہوگئے۔ وہ بھاگ نہیں سکا۔ برف نے اس کی ٹانگوں کو مفلوج کردیا تھا۔ وہ گردن تک برف میں دھنس گیا۔ اس کا خون جم رہا تھا۔

اسے حرارت چاہیے تھی مگر میلوں تک برف ہی برف تھی۔

عمر ٹھہر ٹھہر کر واضح اور صاف لب و لہجے میں پڑھ رہا تھا۔

"اور ہم نے کھڑی کردی ان کے آگے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور اس طرح ہم نے انہیں ڈھانک دیا تو انہیں کچھ نہیں سوجھتا۔"

وہ ساؤنڈ اسٹیج پر اسارا گیا ایک سیٹ تھا جہاں وہ موجود تھا اور اپنے مکالمے یاد کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا مگر ایک بھی لفظ اس کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ گھنٹی بجادی گئی اور ڈائریکٹر نے صدا دی۔

"ایکشن۔"

وہ چپ چاپ نظریں نیچے کیے شرمسار ہوتا رہا، پھر اسے خیال آیا کہ مکالمے تو اس تختی پر لکھے تھے جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ سیاہ تختی پر تحریر شدہ سفید حرف کو پڑھنے لگا۔ وہ عجیب سے مندرجات تھے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کے الفاظ کے نیچے دو تاریخیں لکھی تھیں اور ان کے ساتھ کسی کا قد اور وزن درج تھا۔ آخر میں ایک نام تھا۔ احمد ابراہیم۔ وہ کس قسم کے مکالمے تھے اور وہ نام کس کا تھا؟ وہ ان تاریخوں پر غور کرنے لگا اور اسے یاد آگیا کہ ان میں سے ایک اس کی تاریخ پیدائش تھی۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ تختی مگ شاٹس اتارتے ہوئے گرفتار کیے جانے والوں کو تھمائی جاتی تھی۔ اس نے بے اختیار ڈائریکٹر سے پوچھنا چاہا کہ اسے مسکراتے ہوئے تصویر کھنچوانی چاہیے یا مغموم تاثرات کے ساتھ؟ لیکن اسے ڈائریکٹر نظر نہیں آیا۔ اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا اسے نگل رہا تھا۔

اس نے روشنی کو ڈھونڈا۔ وہ ناپید ہوچکی تھی۔

ایک آواز نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ ساحل پر تھا اور چمکدار ستاروں سے منور آسمان ناقابل یقین حد تک نزدیک تھا۔ ایک لڑکی جس کے بالوں پر ستاروں کی روشنی کا پرتو تھا، اس کی جانب پشت کیے سمندر کے رخ بڑھ رہی تھی۔ اس کا Poncho (لباس) ہوا سے لہرا رہا تھا اور وہ اس کے دامن کو ہاتھوں سے پکڑ کر اسے پھڑپھڑانے سے روک رہی تھی۔ وہ نم ریت پر بھاگتا ہوا اس لڑکی کے سامنے آگیا۔ وہ پرنیاں تھی اور کسی بات پر اس سے روٹھی ہوئی تھی۔

وہ کس قدر حسین تھی۔ وہ کبھی اس کے چہرے سے نظر نہ ہٹاتا اگر عین اوپر ٹوٹ کر ٹکڑوں میں بٹتا ہوا ایک

ستارہ اس کا دھیان نہ بھٹکا دیتا۔

اس نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر گرتے ہوئے ستارے تلے کر دیا۔ وہ ستارے کی گرد جمع کر کے پرنیاں کو تحفے میں دینا چاہتا تھا تاکہ وہ مان جائے۔ ایک دم اسے یاد آیا کہ ستارے تو آگ ہوتے ہیں۔ لیکن تب دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہاتھ نہیں ہٹا سکا اور ستارے کی سلگتی ہوئی راکھ نے اس کے ہاتھوں میں آگ بھڑکا دی۔ آگ اس کی کہنیوں کی سمت اور وہاں سے آگے کندھوں اور سینے تک پھیل رہی تھی اور پھر وہ اس کے دل تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے دل کو جلتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے دھڑکن محسوس کی۔ وہ تھم چکی تھی۔

”تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت پر چلے اور بے دیکھے رحمٰن سے ڈرے تو اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دو۔“

وہ ایک جھیل کی سطح پر چت لیٹا تھا اور ڈوبتا نہ تھا۔ پانی کے بہاؤ کا شور اسے سنائی نہ دیتا تھا اور وہ پانی اسے گیلا بھی نہ کرتا تھا۔ ہوا اسے چھوتی تھی مگر اس کا لمس کوئی احساس نہ جگاتا تھا۔ اجالا بھی تھا لیکن وہ اندھیرے سے کسی بھی طرح مختلف نہ تھا۔ اس بار اس نے کچھ نہیں ڈھونڈا۔ اسے کسی بھی شے کی تلاش نہ تھی۔

* * *

داؤد نے گلا کھنکار کر پرنیاں کی محویت توڑ دی۔

”اسے کل دفن کیا جائے گا۔ میں صبح تک سارے انتظامات کر دوں گا۔ اب تمہارے ہاسپٹل میں رہنے کا کوئی مطلب نہیں...... وینس آنٹی میرے آفس میں تمہاری منتظر ہیں۔ وہ تمہیں گھر لے جانے آئی ہیں۔ تم چلی جاؤ اور ہو سکے تو سو جاؤ۔“

پرنیاں نے داؤد کو نہیں دیکھا اور زیر لبی میں بولنے لگی۔ ”اسے تو دفن کر دو گے لیکن مری ہوئی تتلیوں کا کیا کرو گے۔ تمہیں خبر نہیں کہ تتلیاں مر جائیں تو انہیں دفن کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ماتمی رنگوں کے ذرے ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ ایسی ہوا میں کوئی سانس کیسے لے؟“

”پرنیاں! تمہارا ذہن منتشر ہے۔ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ تم اس ماحول سے نکلو اور پلیز گھر چلی جاؤ۔“

”داؤد!“ پرنیاں نے تھکن گزیدہ لہجے میں پکارا۔ ”وہ زندہ تھا تو مجھے مرنے نہیں دیتا تھا۔ اب مر گیا ہے تو مجھے جینے نہیں دے گا۔“

* * *

شاہ بلوط کے پتے ہتھیلیاں پھیلائے تیکھی شعاعوں کو ان تک پہنچنے سے روک رہے تھے، جو کرنیں ان کا سبز گھیرا توڑ کر نیچے آنے میں کامیاب ہوتیں، وہ گھاس کے تنکوں پر ایک چمکیلے سفوف کی مانند بکھر جاتیں۔ زردی مائل سفید سفوف کی کئی ڈھیریاں ان کے اردگرد نظر آتی تھیں اور ان مقامات پر گھاس کا سبز رنگ مدھم پڑ گیا تھا۔ ایسی ہی ایک ڈھیری صوفیہ کے پیروں پر قابض تھی، جس نے اس کے ناخنوں کو گلابی چمک سے معمور کر رکھا تھا اور ایسا لگتا جیسے اس کے پیروں کے ناخنوں سے گلابی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔

عمر آلتی پالتی مارے ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ شاہ بلوط کا فراخ تنا اس کی پشت پر تھا۔ اسے دھوپ اور چھونے میں یکسر ناکام تھی۔ ان دونوں کے بیچ کافی سے بھرے دو کاغذی کپ گھاس پر رکھے تھے، جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

وہ بہت دنوں بعد اس جگہ اکٹھے ہوئے تھے۔ گرانٹ کی موت سے چند روز پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے یہاں آئے تھے۔

صوفیہ نے گرا ہوا ایک پتا اٹھایا اور اسے ہاتھ پر دھرتے ہوئے ایک پھونک سے عمر کی جانب اڑا دیا۔

”تم کبھی بات کرنے میں پہل نہیں کرتے ہمیشہ میرے بولنے کا انتظار کرتے ہو۔“ اس نے شکایت کی۔

”میں جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ میری عادت ہی کچھ ایسی ہے۔“

”شکر ہے تم میں کوئی برائی بھی ہے ورنہ تمہیں انسانوں کی صف سے خارج کرنا پڑتا۔“

”نہیں مجھ میں اور بھی کئی برائیاں ہیں۔“

”اچھا، وہ کیا ہیں مجھے ضرور بتاؤ۔“ صوفیہ نے دلچسپی ظاہر کی۔

”چونکہ وہ خامیاں ہیں اس لیے مجھے ان کا تذکرہ کرنا پسند نہیں۔ تم بھی انہیں دریافت کرنے کی غلطی کرنا ورنہ ہو سکتا ہے میں تمہیں برا لگنے لگوں۔“

”تم مجھے برے لگنے لگو تو میرے کئی مسائل حل ہو جائیں۔“ صوفیہ نے مبہم بات کی۔

”کیسے مسائل؟“

صوفیہ کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ ہتھیلی کو کھردری گھاس سے رگڑنے لگی۔ عمر کو اس کے بدلے ہوئے مزاج نے حیران کیا تھا۔ ”تم نے مجھے جواب نہیں دیا۔“

وہ اپنے سامنے پڑا ہوا کافی کا کپ اٹھا کر منہ کے قریب لائی لیکن گھونٹ لیے بغیر واپس رکھ دیا۔

”تم مجھے برے لگنے لگو تو شاید مجھے نیند آنے لگے گی مجھے بھوک لگنے لگے گی۔ میری ہر دم ایک کیف اور بخار میں جھلنے والی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ میں اکیلی بیٹھ کر بے مقصد مسکرانا بند کر دوں گی۔ میں اپنے آپ سے باتیں کرنا چھوڑ دوں گی۔ ہر جگہ تمہارے نظر آنے کی امید ختم کر دوں گی۔ میں آسمانی چاند کو اپنے ارضی ہاتھوں سے چھو کر محسوس کرنا چھوڑ دوں گی۔ دیکھو عمر! ایک اس وجہ سے کہ تم مجھے برے نہیں لگتے، میری زندگی میں کتنے مسئلے ہیں۔“

عمر یہ سب سننے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر کچھ کہنے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی پریشانیاں لاحق ہیں پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں تمہیں برا لگوں۔ البتہ میں واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ میرے ویزے کی معیاد پوری ہونے والی ہے۔ میں چلا جاؤں گا تو شاید میری پیدا کردہ الجھنیں دور ہو جائیں۔“

”فاصلہ کسی کام آتا تو رونا کس بات کا تھا۔ تم سے جان چھڑانے کی غرض سے میں قطب شمالی میں جا بستی۔ یہ معاملہ سادہ ہے نہ آسان۔ میری جان میری انگلیوں کے ناخنوں میں اٹکی ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میری حالت کیسی ہے؟“

اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے اور وہ آنسوؤں کو واپس دھکیلنے میں کوشاں تھی۔

”عمر! اس رات تم نے میرا پیچھا کیوں کیا؟ تم نے اپنی سب سے مہنگی ملکیت اتنی کم قیمت پر کیوں بیچی؟ تم بغیر شرم کے بھیڑ والی جگہوں پر ننگے پاؤں کیوں چلے؟“

”میں نے جو بھی کیا اللہ کے لیے کیا۔ اس میں میری ذاتی غرض شامل نہیں تھی۔“

”کیا تم نے میرے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کیا؟ میں ہمدردی کے علاوہ پوچھ رہی ہوں۔ میں محبت کے بارے میں سوال کر رہی ہوں۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

عمر دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

صوفیہ کا رنگ نچڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے یکدم خون کی لکیروں میں بدل گئے۔

”تم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ کیا اس لیے کہ میں نے ماضی میں کچھ غلطیاں کی ہیں جبکہ تمہارے کردار میں ایسی کوئی خرابی نہیں اور اس حوالے سے تم مجھے خود سے کمتر تصور کرتے ہو۔“

”نہیں صوفیہ! مجھ سے بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ مجھے اچھے تو کیا کم برے لوگوں میں بھی نہیں گنا جا سکتا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ میں نے اپنی ماں کو اتنا عاجز کیا کہ انہیں زندہ رہنے کی خواہش نہ رہی۔“

صوفیہ نے اضطرابی کیفیت میں کافی کا کپ دوبارہ گرفت میں لیا اور اسے اپنے گھٹنے پر ٹکا دیا۔

”مجھے احساس ہے کہ میں ویسی لڑکی نہیں ہوں

جس سے تم محبت کرو لیکن میں تمہاری پسند کے مطابق بن جاؤں گی ۔ میں بدل رہی ہوں۔ میں تیزی سے تبدیل ہو رہی ہوں۔ میں کبھی کبھی الکوحل استعمال کرتی تھی‘ اب بالکل نہیں کرتی اور یہ سوچ کر کہ تمہیں سگریٹ پینے والی لڑکیاں پسند نہیں ہوں گی‘ میں نے پچھلے کئی ہفتوں سے ایک بھی سگریٹ نہیں پیا میں ایسا لباس پہننے لگی ہوں جس میں پورا بدن پوشیدہ رہے۔ میں نے مردوں سے بے تکلفی برتنا ترک کر دیا ہے۔ میں عبادت بھی کروں گی۔ میں ہر وہ کام کروں گی جو تمہیں پسند ہو۔ کیا پھر بھی تم مجھ سے محبت نہیں کرو گے؟“

اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے آنسوؤں کو ضبط کرنے میں کتنی دقت ہو رہی تھی۔ اس کے کپ والے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”تم ایک انسان کے لیے یہ سب کر رہی ہو۔ اگر یہ تمام کام تم اللہ کی خاطر کرو تو کتنا اچھا ہو۔“

”تم مجھے لاجواب کر سکتے ہو اور ہمیشہ کر دیتے ہو۔ لیکن مجھے خود سے محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اچھا تو عمر! کیا تمہیں مہلت درکار ہے کہ تم اچھی طرح سوچ سکو۔ شاید چند دن بعد تمہیں ایسا لگے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے ہو؟“

اس بار بھی جواب دیتے ہوئے عمر نے بہت وقت لیا تھا۔

”میں بتا چکا ہوں۔ بار بار ایک ہی بات نہ پوچھو۔ یوں بھی میرے پاکستان جانے میں......“

صوفیہ نے اس کی بات کاٹی۔

”مجھے نہ بتاؤ کہ تم کب واپس جا رہے ہو۔ میں تم سے ایک آخری چیز مانگ رہی ہوں۔ میں یہاں تمہارے سامنے بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں۔ چاہے تمہیں اچھا لگے یا بُرا۔“ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہہ کر اسے چپ کروائے۔ اس کے گالوں پر روانی سے گرتے ہوئے آنسو اسے بے حد دکھ دے رہے تھے۔

”عام طور پر میں روتی نہیں ہوں کیونکہ لوگ آنسوؤں کو کمزوری پر محمول کرتے ہیں اور میں نے کبھی لوگوں پر ظاہر نہیں کیا کہ میں کمزور ہوں۔“

ایک آنسو اس کے ہونٹوں سے پھسل کر ٹھوڑی پر آیا اور اس کے ہاتھ میں تھامے ہوئے کپ میں جا گرا۔

”میں اس لیے تمہارے سامنے نہیں رو رہی کہ تم مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں اس لیے بھی نہیں رو رہی کہ تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو۔ میں نہیں جانتی کہ میں کیوں چاہتی ہوں تم مجھے روتے ہوئے دیکھو۔“ ایک اور آنسو کپ میں گرا۔

”میں نے ساری زندگی اہمیت کے بغیر گزاری۔ مجھ پر کسی نے اتنی توجہ بھی نہیں دی جتنی کوئی عادی سگریٹ نوش اپنے راکھ دان پر دیتا ہے۔ تم نے اتنی اہمیت‘ ایسی توجہ دی تو یہ آنسو تمہارے موجودگی میں کیوں نہ بہیں‘ یہ تمہارے لیے ہیں۔ میں ان کو تم سے نہیں چھپاؤں گی۔“

ایک ساتھ کئی شفاف قطرے کپ میں ٹپکے تھے۔ اس نے روتے ہوئے نظر اٹھائی اور مسکرائی۔ وہ دل کو چیر دینے والی مسکراہٹ تھی۔

”کافی تو رہ ہی گئی۔ چلو جلدی ہوا سے تاکہ میں جا سکوں۔“ اس نے اپنا کپ ہوا میں بلند کیا۔

”تم میرا کپ لے لو۔“ عمر نے پیشکش کی۔

”تمہاری کافی میں آنسو ملے ہیں۔ مجھے یہ مناسب نہیں لگتا کہ تم اسے پیو۔“

صوفیہ بولی۔ ”اگر کافی کے اس کپ میں تمہارے آنسو گرے ہوتے تو جانتے ہو میں کیا کرتی......“ اس نے بات مکمل نہیں کی۔ ”رہنے دو یہ کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے پینے میں اب کوئی مزا نہیں۔“

اس نے کپ ایک طرف رکھتے ہوئے اپنا پرس کھولا اور کچھ نقدی نکال کر عمر کے پیروں کے نزدیک گھاس پر ڈھیر کر دی۔

”تمہارے دیے ہوئے تین سو bucks میں نے بچا کر رکھے تھے۔ میرا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میں تمہیں لوٹا رہی ہوں۔ یہ پورے نہیں ہیں۔ پچھلے بہت سے دنوں سے میں کوئی ملازمت نہیں کر رہی تو انتہائی مجبوری میں اندازاً تیس بکس خرچ کرنا پڑے۔“

عمر نے ہاتھ سے نوٹوں کو اس کی طرف دھکیلا۔

”میں یہ واپس نہیں لوں گا۔ تمہیں ان دنوں رقم کی ضرورت ہو گی۔ کل جب تم کوئی ملازمت کرنے لگو تو بے شک لوٹا دینا۔“

صوفیہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”آنے والے کل کی بات نہ کرو۔ ابھی تو مجھے آج کو بھگتنا ہے۔“ وہ پھر سے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ وہاں گزرے ہوئے وقت کی بری یادیں ہیں۔ میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ آئندہ میں کہاں رہوں گی۔ میں نے پچاس بکس کے نوٹ پر اپنا نیا سیل فون نمبر لکھ دیا ہے۔ کاغذ پر اس لیے نہیں لکھا کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا سنبھال کر رکھنا مشکل ہے لیکن پچاس بکس کے نوٹ کو گم کر دینا آسان نہیں۔ میں رابطے کا ایک ذریعہ چھوڑے جا رہی ہوں۔ مگر تم اسے صرف اس صورت میں استعمال کرو گے اگر تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری بات کرنے کے لیے مجھے کال نہ کرنا۔“

وہ ایک ہاتھ سے اسکرٹ سے چپکے تنکے جھاڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے گیلا چہرہ صاف کر رہی تھی۔

”تم پہلے سے طے کر کے آئی تھیں۔ کیا تمہیں شک تھا کہ میرا جواب مثبت نہیں ہو گا؟“ عمر نے پست آواز میں کہا۔

”مجھے اچھے واقعات ذرا کم ہی پیش آتے ہیں تو میں منفی پہلو ہمیشہ نظر میں رکھتی ہوں۔ میں ایک قنوطی لڑکی ہوں۔“

روتے روتے اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

”مجھے ایک بات پر سخت تعجب ہے عمر! تم مجھے خدا کی محبت کے لائق سمجھتے ہو اور اپنی محبت کے لائق نہیں سمجھتے۔ تم تو ایک انسان ہو نا۔“

اس کے چہرے پر جیسے نشتر سے چیرا دیا گیا ہو۔

”تم منہ پھیر لو‘ اس طرح مجھے جانے میں آسانی ہو گی۔“

اس نے بحث نہ کی اور رخ بدل کر شاہ بلوط کے تنے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

”تم سو تک گنتی کرنے کے بعد مڑ کر دیکھنا۔ یہ کھیل میں بچپن میں کھیلا کرتی تھی۔ جب گنتی کرنے والا مڑ کر دیکھتا ہے تو دوسرا کھلاڑی نظر سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے۔“

عمر نے گنتی نہیں کی۔ اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ کافی کی مٹتی ہوئی تلخ مہک اس کی سانسوں میں پھندے اٹکا رہی تھی‘ جو اس کے عقب میں دو کاغذی کپوں سے اٹھتی تھی اور ان میں سے ایک میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔

* * *

وہ آنکھیں موندے بستر پر دراز تھی کہ اس نے کسی کے اندر آنے کی آہٹ سنی۔ قدموں کی چاپ اس کے سرہانے آ کر رک گئی۔ اس نے پلکوں میں جھری پیدا کر کے عمر کو دیکھا۔

”میں یہاں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟ اگر آپ کو نیند آ رہی ہے تو بتا دیں۔ میں چلا جاتا ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ پرنیاں نے لیٹے لیٹے اشارہ کیا۔

وہ اس کے بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ ”میں بہت تھک گیا ہوں۔ آج مجھے بڑی دیر تک پیدل چلنا پڑا۔ دھوپ بھی تیز تھی۔ میرا پورا جسم دکھ رہا ہے۔“

وہ واقعی تھکا ہوا نظر آتا تھا۔

”تم لیٹ جاؤ۔ ذرا جسم کو آرام ملے گا۔“ پرنیاں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے لیٹنے کی جگہ دی۔ وہ خود پہلو کے بل ہو گئی تھی۔

عمر گردن کے نیچے تکیے کو دہرا کرتے ہوئے لیٹ گیا۔

”پانی پیا ہے تم نے؟ یا میں لے کر آؤں۔“

”جی پانی پیا ہے۔“

"تم اتنی گرمی میں پیدل کیوں پھرتے رہے ہو؟" اس کے انداز میں تشویش تھی۔

"مجھے ایک خاص چیز کی تلاش تھی اور وہ کہیں ملتی ہی نہ تھی۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے برا حال ہو گیا۔"

"لیکن وہ تھی کیا چیز؟"

"آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا امی!"

وہ لفظ کہتے ہوئے عمر ٹھٹکا نہیں اور اس کے منہ سے سنتے ہوئے پرنیاں چونکی نہیں۔ ان دونوں نے یوں ظاہر کیا جیسے عمر کا اسے امی کہنا معمول کی بات ہو۔

"میرا سر ابھی درد سے پھٹ رہا ہے۔ آپ چھو کر دیکھیں کہیں مجھے بخار تو نہیں ہو رہا۔" عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ماتھے پر رکھ دیا۔

پرنیاں اس کے ماتھے کی جلد پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "میرے اس ہاتھ کی تین انگلیاں قریب قریب بے حس ہیں۔ میں نے اپنی رگوں کو زخمی کر دیا تھا۔ تمہیں تو علم نہیں ہو گا کہ میں چند دن ایک میڈیکل اسکول میں بھی جاتی رہی ہوں۔ میں نے وہاں کچھ بھی نہیں سیکھا، کلائی کو درستی سے کاٹنا تو بالکل نہیں۔"

"مجھے کیسے علم ہو گا امی! آپ نے کبھی مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

پرنیاں کی انگلیاں اب اس کے بالوں میں چلنے لگی تھیں۔

"میں تمہیں کیا بتاتی؟ یہ کہ تمہاری ماں کا ماضی کوتاہیوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ اپنی راہ میں آنے والی پہلی ترغیب پر ہی پھسل گئی اور پھر کبھی سنبھلی ہی نہیں۔ اس نے ہمیشہ دل کی مانی اور دلوں کو غمگین کیا۔ اس میں اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا حوصلہ نہیں تھا اس لیے اس نے مزید غلطیاں کیں۔ ان میں کون سی بات بتانے کے لائق تھی۔"

عمر نے پرنیاں کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب ہم غلطی کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے اور جب کوئی دوسرا غلطی کرتا ہے تو ہم معاف کرنا نہیں چاہتے ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

پرنیاں بہت قریب سے عمر کے چہرے کے نقوش دیکھ رہی تھی۔

"عمر! مجھے یہ کہنے میں سخت جھجک ہو رہی ہے۔ اگر تم....." وہ ٹھہر کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ "تم..... اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں چوم لوں۔ جب تم پیدا ہوئے تھے تو میں نے تمہیں ایک بار بھی نہیں چوما اس ڈر سے کہ تمہیں چھوڑ کر جاتے ہوئے مجھے زیادہ اذیت نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا میں کس شے سے خود کو محروم کر رہی ہوں۔ میرے جیسا بے وقوف زمانے میں نہ ہو گا۔"

پرنیاں نے سب سے پہلے اس کی ناک کی نوک کو چوما تھا، پھر اس کے ماتھے کو۔ باری باری دونوں گالوں کو اور اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے وہ آنسوؤں سے اس کے چہرے کو بھگو رہی تھی۔ عمر کو شرم محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

"آپ صوفیہ کے متعلق تو جانتی ہیں نا۔" اس عجیب لمحے کو گزارنے کی غرض سے جو پہلا موضوع اسے سوجھا، وہ اسی پر بولنے لگا۔

"کون صوفیہ؟" پرنیاں نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

"البا مارسیلو کی بیٹی صوفیہ۔"

"ہاں، داؤد اس کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ اسے گود میں لیا تھا۔ تب وہ پانچ چھ ماہ کی ہو گی۔ بڑی پیاری بچی تھی۔ کیا تم اس سے ملے ہو؟"

"میں کئی بار ملا ہوں۔ وہ ہسپتال آئی تھی تو اس کے بعد ہم دونوں میں اکثر ملاقات رہی تھی۔"

"مجھے بھی ملواؤ۔ اسے دیکھنے کا اشتیاق ہے مجھے، وہ کیسی ہو گئی ہے؟ یقیناً بہت خوب صورت ہو گی۔"

"میرا قیاس تھا کہ آپ اس سے ملنا پسند نہیں کریں گی کیونکہ وہ البا کی بیٹی ہے۔"

پرنیاں نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا لی۔

"میرے لیے یہ بات اہم نہیں ہے کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ میرے لیے اہمیت اس بات کی ہے کہ اسے گرانٹ نے پالا ہے۔

ویسے تم نے اچانک اس کا ذکر کیوں چھیڑ دیا ہے۔ کیا تم اسے پسند کرنے لگے ہو؟ کیسی لڑکی ہے وہ؟"

عمر اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے یہ موضوع کیوں چنا

پرنیاں کہہ رہی تھی۔

"تم جس لڑکی کو اپنی بیوی کے طور پر منتخب کرو۔ اسے ضرور بتا دینا کہ اس کی دو ساسیں ہوں گی۔ ایک میں اور دوسری تمہاری بے جی۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔ "بلکہ تم صوفیہ کو ساتھ لے کر آنا میں خود اسے خبردار کر دوں گی۔ کہیں بعد میں وہ شکوہ نہ کرے۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔" عمر نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی تو نہیں کہا کہ تم نہیں کر رہے۔ صوفیہ کا نام لیتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں جو تاثر آیا۔ وہ کسی خاص جذبے کی گواہی دیتا ہے۔ اس وقت میں اتنے قریب سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔" اس نے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے فاصلہ ناپ کر دکھایا۔

"بہر کیف میں غلطی پر بھی ہو سکتی ہوں۔ تم تصحیح کر سکتے ہو اگر تم چاہو تو۔"

عمر ایک اور کڈھب لمحے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ فرار کے طریقے سوچنے لگا اور کامیاب رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گیا اور میز پر پڑے ہوئے دو لفافوں میں سے ایک کو اٹھاتے ہوئے اسے پرنیاں کو دے دیا۔

"مجھے اس کی تلاش میں کئی جگہوں پر جانا پڑا۔ مارکیٹ میں مل ہی نہ رہا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد یہ پھول میں آپ کو لا کر دوں۔"

پرنیاں ساکن آنکھوں سے اس کاسنی پھول کو دیکھ رہی تھی "Gloxinia" عمر کے مزید کہنے سے قبل وہ بول اٹھی۔

"یہ Gloxinia ہے۔ پہلی نظر میں محبت کی علامت۔ وہ پھولوں کی زبان میں مجھ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ جب ہم پہلی بار ایک دوسرے کے روبرو ہوئے تو اس نے مجھے یہ ہی پھول دیا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ اس نے جانے میں جلدی کی، میں ایک بات پوچھ ہی نہیں پائی، وہ میرے دل میں ہی رہ گئی۔ اسے مجھ سے محبت تھی یا وہ محض پچھتاوے میں مبتلا تھا؟"

عمر نے ایک نگاہ میز پر دھرے دوسرے لفافے پر ڈالی اور دروازے کے نزدیک جاتے ہوئے بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اس دوسرے لفافے میں ہے۔ اسے کھول کر دیکھ لیں۔"

* * *

وہ وائلن نوازوں کا ایک گروہ تھا، جو بے گھر بچوں کی فلاح کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا۔ سازندے ایک خاص ترتیب سے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور اپنے سازوں کو ٹھوڑیوں اور کندھوں کے بیچ دبائے ایک طربیہ دھن بجا رہے تھے۔ ایک قلیل تعداد میں لوگ ان کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بچھے ہوئے پارچے پر چھوٹی مالیت کے چند نوٹ اور کچھ سکے پڑے تھے۔ جب تماشائیوں میں سے کسی کا جی وائلن کی آوازوں سے بھر جاتا یا اس کے پاس مزید وہاں ٹھہرنے کی فرصت باقی نہ رہتی تو وہ اس پارچے پر ایک ڈالر والا نوٹ یا کوارٹر کا ایک سکہ (پچیس سینٹ) اچھال کر اپنی راہ لیتا۔

صوفیہ بھی ان تماشائیوں میں موجود تھی اور پرس میں ہاتھ گھسائے ان نوٹوں کو ٹٹول رہی تھی، جو اس نے گھر کا فرنیچر، ٹیلی ویژن سیٹ اور اپنی سائیکل بیچ کر حاصل کیے تھے۔ وہ کب سے غور کر رہی تھی کہ اللہ کی خاطر وہ کیا کرے اور وائلن نوازوں کی ٹولی پر نظر پڑتے ہی اسے لگا تھا کہ یہ ایک ایسا کام ہو سکتا تھا جس سے اللہ خوش ہوتا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے پرس میں سے ساری نقدی نکال کر اسے گنا تھا حالانکہ اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ وہ کتنی تھی۔

اسے مایوسی نے گھیر لیا۔ وہ اس رقم میں سے ایک سینٹ بھی کسی کو دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر رقم کو گننے لگی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہو رہا

تھا۔ اس نے سب سے زیادہ مالیت کا نوٹ، جو بیس ڈالر کا تھا، الگ کر لیا۔ وہ کئی ثانیے شش و پنج میں مبتلا بیس ڈالر کے اس نوٹ کو انگلیوں میں مروڑتی رہی۔ آخر کار اس نے نقدی والے پارچے کی طرف پیش قدمی کی اور کھوئی ہوئی کیفیت میں نوٹ کو دیکھا۔ اس کی پشت پر درج شدہ الفاظ نے اس کی نظر کو جکڑ لیا تھا۔

In god we trust

اس نے بارہا وہ الفاظ دیکھے ہوں گے لیکن ماضی میں وہ اس کے ذہن میں کوئی تاثر نہ ابھارتے تھے۔ اس وقت انہیں پڑھ کر وہ حتمی فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے نوٹ کو پارچے پر پھینک دیا تھا۔

مطربوں کے سرخیل نے کمانچے کو وائلن کے تاروں سے دور لے جا کر ہاتھ کو ہوا میں اونچا کیا تو سارے مطربوں نے وائلن بجانے بند کر دیے اور ٹھوڑیوں کو کندھوں سے جدا کرتے ہوئے گردنیں سیدھی کر لیں۔ سرخیل خوشی سے اعلان کر رہا تھا۔

"اس لمحے تک یہ آج کے دن کا سب سے زیادہ چندہ ہے، جو اس رحم دل لڑکی نے ہمیں دیا۔ یہ خصوصی داد کی مستحق ہے۔"

سب حاضرین اس کی طرف متوجہ ہوئے اور تالیاں بجانے لگے۔ مطربوں نے پھر سے کمانچے سنبھالے اور نئے جوش سے وائلن کے تاروں سے سر نکالنے لگے۔ صوفیہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس مقام سے دور ہو گئی تھی۔

"کیا میں نے یہ نیکی محض اللہ کی خوشی کو مد نظر رکھ کر کی ہے؟" اس نے اپنے من کو کریدا۔

"اگر ایسا ہی ہے تو میں خوش کیوں نہیں ہوں؟ اللہ کی راہ میں کیے جانے والے کام تو خالص خوشی دیتے ہیں۔ شاید اس کام میں دکھاوا بھی شامل تھا۔ میں نے سوچا کہ بیس بکس خیرات میں دینے پر لوگ مجھے سراہیں گے۔ مجھے ایک اچھی لڑکی تصور کریں گے۔ بدلے کی امید تو لگائی میں نے، صلہ تو چاہیے تھا مجھے اور بیس بکس کی اوقات کیا ہے۔ اللہ جو اپنی لاتعداد مخلوقات میں سے مجھ پر بطور خاص مہربان ہوتا ہے۔ اس کی محبت کا جواب میں بیس بکس سے دیتی ہوں۔ اس قدر ادنیٰ ایثار اتنا پست حوصلہ ہے میرا!"

وہ شرم سے مری جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے بڑھ کر غم زدہ تھی۔

* * *

اس شام اٹارنی، آرچی گرفن کے دفتر پر تین چیزوں کا تسلط تھا۔ تمباکو کا دھواں، خاموشی اور مایوسی۔ وہ اتنا بیزار تھا کہ اس نے اپنا سیل فون بند کر رکھا تھا اور دفتر کے ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اتار کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔ راکھ دان میں سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹوٹوں اور راکھ کی مقدار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل کو میز کے آخری سرے پر پٹخا اور درد سے بھری کنپٹیوں کو انگلیوں سے دبانے لگا۔

وہ ایک یقینی شکست سے دوچار تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس سے قبل کبھی اس کا شکست سے پالا نہ پڑا ہو۔ وہ کوئی زیادہ کامیاب شخص نہیں تھا۔

وہ ایک پبلک ڈیفنڈر تھا اور اپنی موجودہ حیثیت سے کسی بھی طرح مطمئن نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ سے کسی بڑی پرائیویٹ لاء فرم میں پارٹنر بننے کا خواب دیکھا تھا لیکن یہ خواب تب پورا ہوتا جب وہ غیر معمولی قابلیت اور لیاقت کا مظاہرہ کرپاتا اور بڑے نجی اداروں کی نظر میں خود کو پرکشش ثابت کرپاتا۔

اس کے برعکس اس نے دوسرے درجے کی ایک بڑی شہرت والی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی تھی اور کم و بیش ہر معاملے میں اوسط واقع ہوا تھا۔ اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو حقیقت پسندی سے جانچتے ہوئے فیصلہ کرتا تو وہ پبلک ڈیفنڈر کے طور پر کام کرنے کا بھی اہل نہیں تھا لیکن انسانوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی خوش فہم تھا۔ وہ ہر ناکامی کا الزام قسمت کے کھاتے میں ڈال کر اپنی انا کو مطمئن رکھتا تھا۔ اس کا وتیرہ تھا کہ وہ کسی متوقع ناکامی پر جی بھر کے مایوس ہوا کرتا تھا اور جدوجہد کرنے کے بجائے ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ رہتا تھا۔

اس بار ناکامی کا نام میبل تھا۔ ویسے یہ اس کا اصل نام نہیں تھا۔ یہ تو وہ نام تھا جس سے پکارا جانا اسے پسند تھا۔ اس کے والدین کا رکھا ہوا نام ٹونی کریگ تھا۔ بدقسمتی سے آرچی گرفن کو میبل کا اٹارنی مقرر کر دیا گیا تھا۔ وہ بدنیت سیاہ فام لڑکا نہایت الجھے ہوئے کردار کا حامل تھا۔ فسادات میں اس کے ماں باپ اور بہن بھائی مارے گئے تھے۔ تب سے وہ اکیلا رہا تھا۔ اس کا نہ تو کوئی حلقہ تھا اور نہ ہی احباب۔ اس کا آئی کیو لیول ستّر سے اسّی کے درمیان تھا۔ اسے اپنی بہن سے جس کا نام میبل تھا، غیر معمولی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ کبھی بھی اس کی موت کو تسلیم نہیں کر پایا تھا۔ غالباً اسی سبب اس نے خود کو میبل کہلوانا شروع کر دیا۔ اس پر ایک لڑکی کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ بلکہ الزام کیا تھا ایک لحاظ سے ثابت ہو چکا تھا۔ تمام واقعاتی اور مادی شہادتیں اس کے مجرم ہونے کی نشاندہی کرتی تھیں۔

مقتولہ کے ناخنوں سے ملنے والے انسانی گوشت کے ذرات میبل کی کھال کا حصہ قرار پائے تھے یعنی وہ مرتے ہوئے ملزم سے جسمانی مزاحمت کر رہی تھی۔ پولیس نے میبل کو اس حال میں پکڑا تھا کہ وہ لڑکی کی لاش کو فٹ پاتھ سے نیچے گھسیٹ رہا تھا۔ آلہ قتل جو ایک چھوٹی آہنی ہتھوڑی تھی، مردہ لڑکی کے لباس کے اندر سے ملی تھی۔ اگرچہ اس پر سے نشانات انگشت دستیاب نہیں ہوئے تھے لیکن اخبار پڑھنے والے اور ٹیلی ویژن دیکھنے والے کسی مجرم کے لیے یہ انتظام کرنا معمولی بات تھی۔ میڈیا کی دی ہوئی غیر ضروری آگاہی نے جرائم پیشہ افراد کو محتاط اور چالاک بنا دیا تھا۔

ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس میں واقع جوتوں کی ایک بڑی دکان کے سیلز بوائے نے گواہی دی تھی کہ اس نے قتل کے دن سے پہلے میبل کو مقتولہ سے ہاتھا پائی کرتے دیکھا تھا۔ یہ تصدیق بھی ہو چکی تھی کہ وہ لڑکی انتھونی جڈ کے گیراج میں جاتی رہتی تھی، جہاں میبل کام کرتا تھا۔ یہ سارے حقائق پیش بندی کے نظریے کو تقویت دیتے تھے اور رہا قتل کا محرک تو اس مسئلے کا حل بھی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے نکال لیا تھا۔

وہ ایک دلچسپ کہانی لے کر آیا تھا۔ میبل کو سفید فاموں سے نفرت تھی۔ مبینہ طور پر اس کے والدین اور بہن بھائی سفید فام لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے رشتے کے چچا انتھونی جڈ کے بقول میبل نے ایک سے زیادہ مواقع پر سفید فاموں سے انتقام لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جیوری، جو آٹھ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی اور جس میں سب کے سب سفید کھالوں والے تھے، اس مفروضے سے مکمل متفق نظر آتی تھی۔ پروسیکیوشن (استغاثہ) کے پاس لاش تھی، آلہ قتل تھا۔ premeditation کی تائید میں شہادتیں تھیں۔ ایک معقول محرک تھا اور ایک مہربان جیوری بھی تھی۔ وہ میبل کو فرسٹ ڈگری مرڈر میں سزایاب کروانے کی پوری طاقت رکھتے تھے۔

دوسری طرف ڈیفنس اٹارنی (وکیل صفائی) آرچی گرفن تھا، جس کو خود بھی میبل کے بے گناہ ہونے کا یقین نہ تھا۔ اس کی اپنی کہانی میں جوتوں کے ایک جوڑے کے ذکر کی بھرمار تھی۔ وہ اس درجہ بھونڈی اور حقیقت سے ماورا داستان تھی کہ اگر اسے جیوری کے ممبران کے گوش گزار کیا جاتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ آرچی کو فاترالعقل تصور کرتے۔ آرچی نے میبل سے حقائق اگلوانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی مگر وہ اپنی فیری ٹیل کا ایک حرف بھی ادھر سے ادھر کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

پروسیکیوشن اپنا کیس پیش کر چکی تھی اور کل ڈیفنس کی شروعات کرنا تھیں۔ میبل اتنا بدشکل تھا کہ جیوری کو اس سے ہمدردی ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ جیوری تو ایک طرف رہی، خود آرچی کے اندر اس کی صورت دیکھنے پر نفرت امڈتی تھی۔ وہ معذور تھا، اس کے باوجود اس کی جسمانی قوت کے بارے میں کسی کو غلط تاثر دینا آسان نہیں تھا۔ وہ ایک دیو جتنی جسامت رکھتا تھا۔ کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بھی وہ مرنے والی دبلی پتلی، سفید نازک لڑکی پر حاوی دکھائی دیتا تھا۔

جب اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے عدالت میں

مقتولہ کی تصاویر کی نمائش کی اور منظر کشی کی کہ کس طرح نفرت سے ابلتے ہوئے وحشی میبل نے ہتھوڑی کے پے در پے ضربوں سے اس کی کھوپڑی پچکا ڈالی تھی۔ سنہری بالوں سے سجے خوشنما سر کو ہڈیوں کے چورے میں تبدیل کر دیا تھا تو جیوری کا فورمین (نمائندہ) جو ایک نفاست پسند معلم اور دو سنہری بالوں والی نوجوان بیٹیوں کا باپ تھا' خوف سے تقریباً" بے ہوش ہو چلا تھا۔

وہ ابھی سے خود کو ناکام قرار دینے میں حق بجانب تھا۔ ہارنے میں کوئی برائی نہ تھی مگر اس شرمناک انداز سے ہارنا باعث اذیت تھا۔ جوں جوں کل کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی' توں توں اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ کمرا کثیف دھوئیں سے اس حد تک بھر چکا تھا کہ ساری فضا دھندلی ہو رہی تھی۔ اسے کھڑکی کھول کر دھوئیں کو باہر نکالنے کا خیال آیا' تاہم تساہل نے اسے ہلنے نہ دیا۔

ایک دم نادیہ اندر آئی تھی۔ وہ اس کے ہمراہ اس کیس پر کام کر رہی تھی اور کچھ دیر قبل تک اتنی ہی ناامید تھی جتنا وہ خود' لیکن اب اس کو دیکھنے پر آرچی کو ادراک ہوا کہ اس کے مزاج میں بدلاؤ آ چکا تھا اور وہ بولی تو اس کی آواز میں بھی ولولہ تھا۔

"ذرا باہر آؤ۔ تم نے اس کمرے میں اتنا دھواں نہ بھر رکھا ہوتا تو میں اسے یہاں لے آتی۔"

"کسے؟" اس نے تلخی سے پوچھا۔

"تم باہر تو آؤ۔"

"میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ جو کوئی بھی ہے' اسے ٹال دو۔"

"خوش قسمتی کو ٹالنے والے احمق کہلائے جاتے ہیں۔ اٹھو اور ایک فاتح کی شان سے چل کر آؤ۔"

وہ بیزاری کی انتہا کو چھو رہا تھا لیکن نادیہ کے انداز نے اس کے اندر تجسس جگا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔

جب اس نے صوفیہ مارسیلو کو دیکھا تو اسے سخت کوفت ہوئی۔ نادیہ اسے خوش قسمتی کیوں کہہ رہی تھی؟ میبل نے پولیس کو اس کے بارے میں بتایا تھا کہ اس رات وہ دونوں اکٹھے تھے اور صوفیہ اس واقعہ کی گواہ تھی۔ میبل آج بھی اس بات پر قائم تھا' البتہ پولیس تحقیقات کے نتیجے میں میبل کا بیان دروغ گوئی پر مبنی نکلا تھا۔ صوفیہ نے تمام قصے سے مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا تھا اور جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی بھی ثابت کر دی تھی۔ اس کیس میں اس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ پروسیکیوشن اور ڈیفنس' دونوں نے ہی اسے قابل توجہ نہ گردانا تھا۔ اور اب نادیہ اس کی آمد کو فتح اور خوش قسمتی قرار دے رہی تھی۔

"کیسے آنا ہوا؟" اس نے منہ بگاڑ کر صوفیہ سے پوچھا۔

جواب میں اس نے جو کہا' اسے سن کر نہ صرف آرچی کا بگڑا ہوا منہ سنور گیا بلکہ اس کا جی بے اختیار گنگنانے کو مچلنے لگا۔

* * *

"وہ ایک منفرد اور خاص لڑکی ہے۔ خوب صورت ہے' فطرتاً" نیک ہے' مجھے اس سے ملنا' اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں' مجھے اس سے انس ہے۔ اس کے آنسو مجھے دکھ دیتے ہیں۔ میں اسے خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا لیکن محبت..... نہیں مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ میں اس کے لیے ایسا محسوس نہیں کرتا۔ اگر میں اس سے محبت کرتا تو مجھے پتا ہوتا' مجھے خود کو ٹٹولنا نہ پڑتا' میرے اندر سے کوئی مثبت صدا آتی تو مجھے اس کے روبرو مان لینے میں کوئی عار نہ ہوتا۔ جب محبت نہیں ہے تو اعتراف کیسے کروں؟"

عمر نے سینکڑوں بار سوچی ہوئی باتوں کو ایک بار پھر سوچا تھا۔

اپنے آپ سے کیے جانے والے اس مکالمے کا نتیجہ اب بھی مختلف نہیں تھا۔ وہ پاکستان جانے سے پہلے ایک بار صوفیہ سے بات کرنے کی شدید خواہش محسوس کرتا تھا لیکن صوفیہ کے آخری الفاظ اسے روک دیتے تھے۔

وہ گروسری اسٹور کے عقب میں بنی ہوئی تنگ گلی پار کر رہا تھا۔ نکڑ پر رکھے ہوئے بڑے ڈسٹر سے ابھرنے والی آہٹوں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ غالباً" ڈسٹر میں کوئی جانور گھس گیا تھا اور کوڑا کھدیڑ رہا تھا۔ اس کا قیاس غلط نکلا۔ اسی پل اس نے ڈسٹر کے سرے سے اوپر اٹھتے ہوئے ایک انسانی سر کو دیکھا۔ وہ نو دس سال کا ایک بچہ تھا جس کے سر کے بالوں کو ایک طویل عرصے سے قینچی نے نہیں چھوا تھا۔ اس کے کانوں کی لویں' گردن کی پشت اور ماتھے کا نصف حصہ بالوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ ان پھولے ہوئے روکھے بالوں میں وہ ایک جھبرایلا نظر آتا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کوڑے کے انبار کو کرید رہا تھا۔ عمر نے نزدیک جاتے ہوئے اسے پکارا تو وہ اچھل پڑا۔ اس ویران گلی میں شاید وہ کسی مداخلت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے عمر کو جواب نہیں دیا اور جست لگا کر کچرادان سے نکل آیا۔

"تم اس میں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

جھبرایلا اپنی بدبودار برساتی اتار کر اسے تہہ کر رہا تھا۔ جس کے نیچے اس نے ہری اور سیاہ دھاریوں والا بے آستین کا اونی لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے ناتواں بدن پر خاصا کھلا تھا۔ اتنی سخت دھوپ میں اس نے وہ گرم لبادہ جانے کیوں پہنا ہوا تھا۔

"کوڑا چننا تمہارا پیشہ ہے لڑکے؟" عمر نے پھر پوچھا۔

جھبرے بلّے کے منہ سے پہلا جملہ برآمد ہوا جو تقریباً" ناقابل فہم تھا۔ اس میں انگریزی زبان کے الفاظ موجود تو تھے البتہ وہ اتنے برے تلفظ سے انہیں ادا کر رہا تھا کہ وہ مہمل لگ رہے تھے۔ غور کرنے پر عمر نے جو مفہوم اخذ کیا وہ لگ بھگ یوں تھا کہ "میں ایک غریب بچہ ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شالم پیدرو۔" اس نے برساتی کو کمر پر لٹکتے ہوئے چیتھڑا نما تھیلے میں منتقل کیا۔

"تم اسکول نہیں جاتے؟"

وہ خاموشی سے بالوں تلے ڈھکی ہوئی کان کی لو کو کھجانے لگا۔ یا تو وہ سمجھا نہیں تھا یا وہ اس سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"تم کوڑے میں سے چنی ہوئی چیزوں کا کیا کرتے ہو

"میری ماں سلویا..... وہ بیمار ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی اور میرا باپ پیدرو ہماری پروا نہیں کرتا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ ہمارے پاس ڈالر نہیں ہیں تو کھانا نہیں ہے۔ میں رقم جمع کرتا ہوں تاکہ ہم سب بہن بھائی پکنک پر جا سکیں۔ ایک ماہ میں ایک پکنک۔ کوڑے سے اچھی چیزیں مل جاتی ہیں۔"

اس نے اٹک اٹک کر عمر کو بتایا تھا۔

"اگر تمہیں ابھی پچاس ڈالر مل جائیں تو تم کیا کرو گے؟"

"میں کہوں گا Diantre!۔" اس نے آنکھیں چمکائیں۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟"

"جیسے لاس اینجلس کے لوگ کہتے ہیں! "واؤ"۔"

"اچھا تو پھر کہو Diantre۔"

عمر نے والٹ میں سے پچاس ڈالر کا وہ نوٹ نکال کر اسے دے دیا جس پر صوفیہ کا سیل فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

شالم نے Diantre نہیں کہا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ منہ کھولے یوں عمر کو تک رہا تھا جیسے وہ ایک بھان متی (مداری) ہو اور اسے کوئی شعبدہ دکھا رہا ہو۔

"اس کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"کچھ نہیں شالم! تمہیں کچھ نہیں کرنا ہو گا۔ یہ نوٹ تمہارا ہے۔"

شالم' جو انگلیوں سے مسل کر نوٹ کو پرکھ رہا تھا' یہ الفاظ سنتے ہی گھوما اور گلی کے موڑ کی سمت بڑھنے لگا۔ عمر وہاں سے آگے نکل کر گلی کے وسط میں ٹھہر گیا۔ وہ نوٹ شالم کے حوالے کرتے ہی اس کا دل بوجھل ہو گیا

تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شالم ملحقہ گلیارے میں داخل ہو گیا۔ اب وہ اسے نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ پھر اس کی مدھم گنگناہٹ عمر کے کانوں تک آنے لگی۔ وہ اجنبی زبان میں گا رہا تھا اور cucu cucu کی تکرار کر رہا تھا۔

وہ نوٹ صوفیہ کا آخری سُراغ تھا اور وہ اس سے دور جا رہا تھا۔ صوفیہ اس کی زندگی سے جانے والی تھی۔ وہ جا چکی تھی...... وہ چند قدم چلا اور دوبارہ رک گیا۔ اسے گلی میں جھانکتے ہوئے شالم کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔

"مجھے ایک بات پر سخت تعجب ہے عمر! تم مجھے اللہ کی محبت کے لائق سمجھتے ہو اور اپنی محبت کے لائق نہیں سمجھتے۔ تم تو ایک انسان ہو۔"

کوئی بھاری شے اس کے سینے میں پھڑپھڑانے لگی۔ اس کا حجم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پھیلنے سے گھٹن ہونے لگی۔ وہ اتنی پھیل گئی کہ سانس کی راہ مسدود ہو گئی۔ وہ درد آلود شے پسلیوں کو توڑ ڈالنے کے درپے تھی۔ بے اختیار وہ شالم کے تعاقب میں چلنے لگا۔ وہ اس گلی میں پہنچا تو شالم کو تیز رفتاری سے جاتے ہوئے پایا۔ وہ لمبے ڈگ بھرنے لگا۔

"شالم! رکو۔"

اس کے آواز دینے پر شالم نے نے رکے بغیر کچھ کہا جو اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

"وہ نوٹ مجھے واپس دے دو۔ میری بات سُنو۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے شالم بھاگ پڑا تھا۔ وہ بھی بھاگنے لگا اور اسے مسلسل پکارنے لگا۔ شالم ان سُنی کر کے ناک کی سیدھ میں دوڑ رہا تھا۔ وہ پوری قوت سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ شالم ایک پھرتیلا لڑکا تھا۔ وہ دیر تک اسے بھگاتا رہا۔ اگر وہ ایک بند گلی میں پھنس کر بے بس نہ ہو گیا ہوتا تو جانے کب تک عمر کے ہاتھ نہ آتا۔ وہ شالم کے سر پر پہنچ گیا اور اس سے نوٹ لوٹانے کا مطالبہ دہرانے ہی والا تھا کہ شالم نے جھٹکے سے جیب میں انگلیاں گھسا کر نوٹ کو باہر کھینچا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے درمیان سے پھاڑ ڈالا۔

"جہنم میں جاؤ Sanamagan۔" نوٹ کے ٹکڑوں کو ہوا میں اچھالتے ہوئے اس نے غصے سے چلّا کر کہا۔

یقیناً" وہ اسے گالی دے رہا تھا۔ عمر کو اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے تیزی سے نیچے جھکتے ہوئے نوٹ کے پھٹے ہوئے حصوں کو مٹھی میں دبوچ لیا۔ اس نے نظر اٹھائی تو شالم بری طرح رو رہا تھا۔ بے قابو نفس اور آنسوؤں کی ملی بھگت سے اس کا کمزور بدن ہل رہا تھا۔

"رونا بند کرو۔" عمر نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے یہ رقم چھین نہیں رہا۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ پچاس ڈالر میں ایک اچھی پکنک نہیں ہو سکے گی۔ کیوں نہ میں تمہیں سو ڈالر دے دوں تاکہ تم بہن بھائی خوب عیش کرو۔"

جھبراپلا ایک بار پھر سکتے میں چلا گیا۔ "اگر تم سو ڈالر دو گے تو میں Diantre ضرور کہوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

* * *

صوفیہ پولیس آفیسرز کے ہمراہ عدالت سے باہر آئی تو لوگوں کے بپھرتے ہوئے ہجوم نے اس پر گالیوں اور دھمکیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اس پر ہر وہ برا لفظ آزما رہے تھے، جو ان کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود تھا۔ وہ اسے زندہ جلانے اور اس کا سر کاٹ ڈالنے کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ قتل ہونے والی لڑکی کے رشتہ دار اور دیگر سوگواران تھے۔ وہ ہر صورت میبل کو اس قتل میں سزایاب کروانے پر کمربستہ تھے لیکن عدالت میں دیے گئے صوفیہ کے بیان کے بعد یہ ممکن نظر نہ آتا تھا۔ لہٰذا ان کا معاندانہ رویہ باعث حیرت نہ تھا۔

صوفیہ نے کسی پر توجہ نہیں دی تھی، آفیسرز کی حفاظت میں وہ اس ہنگامے سے دور سڑک پر آ گئی تھی۔ اسے پولیس کار میں بٹھایا گیا اور کار فوراً ہی

روانہ ہو گئی۔ وہ کھڑکی کے شیشے میں سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگی۔ پولیس آفیسر نے اس سے کوئی بات کی، جس کو اس نے نظر انداز کر دیا۔ وہ کچھ کہنے یا کچھ سننے کی حالت میں نہیں تھی۔

وہ خوش تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ اس کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ اس تجربے سے گزر رہی تھی۔ جس سے کوئی بدصورت عورت ایک خوب صورت بچے کو جنم دے کر گزرتی ہے۔ اس نے ایک ایسا کام کیا تھا جس سے کوئی بھی غرض بندھی ہوئی نہ تھی۔

اس نے میبل کی بے گناہی دنیا پر واضح کر دی تھی اور میبل کون تھا؟ کوئی بھی نہیں۔ نوٹرے ڈیم کا کبڑا جو اس کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھید بھاؤ کا انتر نہیں سمجھتا تھا۔ اونچ نیچ سے انجان تھا۔ صوفیہ نے کسی کو خوش نہ کیا تھا، صرف اللہ کو خوش کیا تھا تو اسے خوشی کیوں نہ ملتی؟

اس نے کھڑکی سے باہر آسمان کی سمت نگاہ کی۔ بادلوں والی دوپہر بام کے اونچے درختوں کے آرپار ہو رہی تھی۔

صوفیہ نے ڈرائیو کرنے والے آفیسر کو گاڑی روکنے کو کہا۔

"مجھے اسی جگہ اتار دو۔ یہاں سے آگے میں پیدل جاؤں گی۔"

"یہ موزوں نہیں ہو گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ تم نے جسے ناراض کیا ہے، وہ گینگسٹر ہے۔"

اس تنبیہہ پر صوفیہ مسکرائی تھی۔ "میں نے جسے راضی کیا ہے، اس کا نام تمہیں بتا دوں تو تم جا کر اس گینگسٹر کو سمجھانے لگو۔"

"کیا؟"

صوفیہ اس کی حیرانی سے محظوظ ہوئی تھی۔

"اس شہر میں ایسا موسم پھر کبھی نہیں آئے گا۔ تم مجھے میرے حصے کی ہوا سے محروم نہ کرو۔"

وہ بضد رہی تو گاڑی روک کر اسے اتار دیا گیا۔ پولیس کار کے فاصلے پر جانے تک وہ ایک جگہ کھڑی رہی۔ پھر اس نے اپنے پیروں سے جوتے الگ کیے اور انہیں احتیاط سے سڑک کے کنارے رکھ دیا۔ عمر کے اس تحفے کی وہ ہر ممکن حد تک حفاظت کرتی تھی۔ اس نے سیل فون بھی جوتوں کے ساتھ رکھا اور ننگے پاؤں سڑک پر پھرنے لگی۔ ہوا میں بارش کی مہک اس کی پوروں میں بستی تھی۔ درختوں تلے ملگجا اندھیرا تھا۔ وہاں ہوا تھی، بادل اور ان کی نمی تھی اور خوشی تھی۔ ایک بے کنار مسرت جو اس کے وجود میں سماتی نہ تھی۔ اس نے کسی پرندے کی مانند بانہیں پھیلائیں اور پنجوں کے بل گھومنے لگی۔

spanish dancer ! turn around

اس کے ہونٹوں پر اینا کا گیت آ گیا۔ اس نے زور سے چکر کاٹا۔

"spanish dancer ! get out
of the town

وہ ایڑیاں اچکا کر گھومی۔

"They called me out for
the world to see"

اس کا گھیردار اسکرٹ اس کے جسم کے گرد لپٹتا اور اٹھتا تھا اور اس میں ہوا بھر رہی تھی۔

"Spanish dancer ! get
out of the town"

وہ ایک اور چکر پورا نہ کر پائی۔ سڑک پر قدموں کی گہری دھمک گونجی تھی۔

"اسے سزا دو۔ اسے ایک عبرتناک سزا دو۔" کسی نے چلّا کر کہا تھا۔ وہ خوف سے سُن ہو گئی۔ وہ لوگ دوڑتے ہوئے اس کے نزدیک آ گئے۔ وہ سنبھل نہیں سکی تھی۔ اسے کھینچ کر زمین پر گرا دیا گیا تھا۔ اس نے پوچھنا چاہا کہ وہ اس پر برہم کیوں تھے لیکن بولنے کے لیے منہ کھولا تو کوئی لفظ برآمد نہ ہوا۔ وہ منہ کو بند بھی نہیں کر سکی تھی۔ ان میں سے ایک جسیم مرد نے اس کے پیٹ پہ ٹھوکر ماری تھی۔ درد نے اس کے جسم کو چیر ڈالا تھا۔ وہ آخری ٹھوکر نہیں تھی۔ وہ تو آغاز تھا۔

"اسے مار ڈالو۔ یہ چڑیل ہے۔ یہ اس کالے جانور

کی مدد گار ہے۔"

دوسری ٹھوکر پر وہ گھسٹ کر پرے ہوئی۔ وہاں کوئی "پرے" نہیں تھا۔ صرف کرخت جوتے تھے، جو بے جان سڑک اور زندہ گوشت میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ پسلیوں میں پڑنے والے ٹھڈے نے اسے دہرا کر دیا۔

اس نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے ان بے رحم جوتوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ دو تھے لیکن اسے کچلنے والے پاؤں کتنے تھے؟ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اگر وہ چیخ پاتی تو شاید اس کا سانس رواں ہو جاتا۔ وہ اندر ہی کہیں قید ہو گیا تھا اور سانس نہ لے پانے سے وہ کسی آدھی کٹی ہوئی گردن والے پرندے کی طرح تڑپتی تھی۔ وہ اب بھی اسے گالیاں دے رہے تھے لیکن یہ پریشان ہونے کی بات نہیں تھی۔

تشویش تو اس بات پر تھی کہ وہ اب تک سننے اور سمجھنے کے قابل کیوں تھی؟ وہ بے سُدھ کیوں نہیں ہو جاتی تھی! اس کی حسیات کام کرنا کیوں نہیں چھوڑتی تھیں۔ ایک بار اس کا ہوش چلا جائے تو اسے کیا کہ وہ اسے گالیاں دیں یا اس کے ٹکڑے کر دیں۔ ٹھوکریں اسے لڑھکاتیں، اچھالتیں، سیدھا کر دیتیں، گھٹنوں کے بل یا اوندھے منہ۔ اپنے اعضا پر اس کا اختیار ختم ہو چکا تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی سے حرکت کر سکتی تو ان میں سے کسی ایک کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ کم از کم ایک رخ سے تو اس کا جسم محفوظ ہو جاتا۔

اس کی زبان مردہ گوشت کا لوتھڑا ہو چکی تھی ورنہ وہ ان کی منت سماجت کرتی۔ وہ پھیپھڑوں پر زور ڈالتے ہوئے چیخنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہی تھی۔ اس کے تڑپنے میں کمی آنے لگی۔ وہ لحظہ بہ لحظہ ساکت ہو رہی تھی۔ پھر اندھیرے کا مہربان مکڑا ایک ریشمی تار سے جھولتا ہوا اس پر اترا اور اسے نرم جالے میں لپیٹنے لگا۔ حواس سلب ہونا بعض اوقات کتنا راحت بخش ہوتا ہے۔

وہ ایک تاریک اتھاہ میں ڈوبنے لگی۔ وہ ہرگز اس گہرائی سے ابھرنا نہیں چاہتی تھی مگر کوئی بھنبھناہٹ تھی جو اس کو اوپر کھینچ رہی تھی۔ وہ بھنبھناہٹ بتدریج ایک گیت میں ڈھل رہی تھی۔ اس کے گرد جالا بُنتا ہوا مکڑا بدک کر آسمان کی طرف اڑنے لگا۔ درد لوٹ رہا تھا۔ وہ پہلے سے بڑھ کر بھیانک روپ میں لوٹا تھا۔ اس کے گال کے نیچے کھردری زمین گیلی تھی۔ اس پر ان گنت ننھے کنکر گر رہے تھے، جو اسے بھگو رہے تھے۔

اگلے چند لمحوں میں اسے ادراک ہو گیا کہ بارش ہو رہی تھی۔ وہ گیت اس کے کان میں گھسا جا رہا تھا۔ اس کا منبع کہاں تھا؟ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اس کا سیل فون تھا جو کہیں پاس ہی بج رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ وہ نمبر صرف ایک شخص کے علم میں تھا۔ کیا عمر اسے کال کر رہا تھا؟

اس خیال نے اسے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ ڈالا۔

اس نے بے چینی سے سیل فون کو تلاش کیا۔ وہ اس کے ہاتھ سے ذرا ہی دور تھا۔ کوشش کیے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے زمین کو ہتھیلیوں سے پکڑتے ہوئے خود کو آگے دھکیلا اور تب اسے ہاتھوں پر لگا ہوا خون دکھائی دیا۔ جانے وہ ہاتھوں سے بہا تھا یا جسم کے کسی دوسرے حصے سے نکل کر ہاتھوں پر لگ گیا تھا۔ یہ تعین کرنے کی فرصت کسے تھی؟ اس نے کسی نہ کسی طرح سیل فون کو گھسیٹ کر منہ کے قریب کیا اور کانپتی ہوئی انگلی سے بٹن دباتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔

"صوفیہ! شکر ہے کہ تم نے فون اٹھا لیا۔" وہ عمر تھا۔

اس نے ہاتھ کی آڑ بنا کر بارش کی بوندوں کو سیل فون پر گرنے سے روکا اور گردن ٹیڑھی کر کے نیچے دبے ہوئے کان کو زمین سے جدا کیا۔

"ہم لوگ ایرپورٹ جا رہے ہیں۔ میں، میری امی، نانی اور میرے ماموں..... ہم پاکستان جائیں گے۔ تم سُن رہی ہو صوفیہ!"

"ہاں۔"

"میں بڑی دیر سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔ کیا تم مصروف تھیں یا مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔" وہ خاموش ہو کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا تھا۔

"بولتے رہو عمر!" اس نے کراہ کر کہا۔

"ہماری فلائٹ میں تھوڑا ہی وقت باقی ہے۔ میں جلدی میں ہوں۔"

"میں بھی جلدی میں ہوں۔"

"میں پاکستان پہنچ کر تم سے پھر رابطہ کروں گا۔"

"جو بھی کہنا ہے، ابھی کہو۔ پاکستان جانے پر....."

اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ بارش کے قطرے جاری ہو رہے تھے۔ ان کے گرنے میں تیزی آ رہی تھی۔

"بہت شور ہے۔ تمہارے الفاظ وضاحت سے سنائی نہیں دے رہے۔"

"بارش ہو رہی ہے۔"

"تم کسی دوسری جگہ کیوں نہیں چلی جاتیں، بارش سے دور تاکہ یہ شور مدھم ہو جائے۔"

"میں نہیں جا سکتی۔ تم باتیں کرتے رہو عمر!"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔"

سڑک پر بہتا ہوا پانی فون میں داخل ہونے لگا تھا۔ عمر کی آواز غیر واضح ہوتی جا رہی تھی۔

"تم تو جھوٹ نہیں بولتے۔" اس نے حلق کے بل چلا کر کہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"اب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے آری کے دندانوں جیسے درد سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"صوفیہ! میں اگلے سال دوبارہ امریکہ آؤں گا تو میرے آنے کا مقصد محض سمسٹر میں شرکت کرنا نہیں ہو گا۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گی نا؟"

"ہاں تم جہاں لے جاؤ گے، میں جاؤں گی۔"

"تمہاری آواز بالکل ڈوب گئی ہے۔ میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔ میں تمہیں کبھی دکھی نہیں ہونے دوں گا۔ تم میرا انتظار کرو گی نا؟"

"ہاں میں کروں گی۔ میں مرنے تک تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہیں پتا ہے عمر! میں نے قیمت ادا کی ہے۔ تم ہی تو کہتے تھے کہ بعض چیزوں کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ کونے میں چھپ کر بیٹھنے سے بات بنتی ہی نہیں۔ قیمت ادا کرنے والے اچھے لوگ ہوتے ہیں عمر! خدا ان سے خوش ہوتا ہے۔"

"صوفیہ! صوفیہ!"

نمی نے فون کو ناکارہ بنا دیا تھا۔

قطرے اس کی آنکھوں میں گر رہے تھے، نتھنوں اور باچھوں میں گھس رہے تھے۔ اس نے چہرہ موڑ کر زمین پر گال ٹکا دیا۔

عمر کہتا تھا کہ مشک آہو جان سے جاتا ہے تو کستوری حاصل ہوتی ہے۔ ریشم کا کیڑا فنا ہوتا ہے تو ریشم ملتا ہے۔ وہ فنا ہو رہی تھی۔ وہ اللہ کی خاطر فنا ہو رہی تھی۔

اس کے حلق میں کوئی شے اٹکی تھی، جو اس کا دم گھونٹ رہی تھی اور وہ یاد کرتی تھی کہ عمر نے ایک اور بات بھی کہی تھی جس کا یاد آنا بہت ہی ضروری تھا۔

روشنی کم ہونے لگی..... روشنی مٹ رہی تھی..... روشنی اس کی پتلیوں میں سمٹ رہی تھی اور اچانک اسے وہ بات یاد آ گئی۔ عمر نے کہا تھا کہ "اسے اللہ کہہ کر پکارو۔ یہ اس کا ذاتی نام ہے۔ اس میں قربت ہے۔"

اس نے زور لگا کر جبڑوں میں پھنسی ہوئی زبان کو ہلایا اور وہ نورانی لفظ اس کے ہونٹوں تک آ گیا۔

"اللہ۔" اس کا دل پگھلے ہوئے موم کی پیالی بن گیا اور پیالی چھلکنے لگی۔ اس لمحے میں قربت تھی اور ایک انوکھی لذت تھی۔ ایک مکمل خوشی اور سپردگی۔

اس کے حلق میں اٹکی ہوئی کسیلی شے اچھل کر باہر آ گئی تھی اور اس کے منہ اور ناک سے رس رہی تھی۔ اس نے اپنے خون کو زمین پر رینگتے اور پانی سے پھسل کر ڈھلتے ہوئے دیکھا۔ تب اس نے ایک نقوش سے عاری چہرہ بھی دیکھا۔ اس چہرے پر آنکھیں، ناک، ہونٹ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اس سے خائف نہیں ہوئی، وہ غمگین بھی نہیں ہوئی۔

کائنات میں کیا تھا جو اس لمحے صوفیہ کی مٹھی میں نہ تھا۔

* * *

پرنیاں خطوں کے اس ڈھیر میں گھری ہوئی حیرت سے انہیں تکتی تھی۔ وہ سب اس کے نام لکھے گئے تھے۔ ہر لفظ میں محبت تھی، ہر سطر میں فراق کا عذاب تھا اور جس شخص نے وہ عذاب بھگتا تھا، اس کی پوروں کی کھال ان زرد پڑتے کاغذوں سے چپکی رہ گئی تھی مٹی ہوئی روشنائی میں اس کے لمس کی باس قید ہو گئی تھی۔

ان میں سے بہت سے خطوط اردو اور فارسی میں تھے۔ گرانٹ ان دونوں زبانوں سے نا آشنا تھا۔ ان میں اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے اسے کس امتحان سے گزرنا پڑا ہو گا، یہ پرنیاں بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس مشکل میں کیوں پڑا تھا۔

ایک روز اس نے گرانٹ سے کہا تھا۔

"مجھے اردو اور فارسی سے عشق ہے۔ اردو سے اس لیے کہ یہ میری قومی زبان ہے اور فارسی سے اس لیے کہ محب اور محبوب کی کیفیات کا اس سے زیادہ خوب صورت اظہار شاید ہی دنیا کی کسی دوسری زبان میں ہوا ہو۔"

همہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد
(صحرا کے ہرنوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پہ رکھ لیے ہیں اس آس پر کہ تو شکار کو آئے گا)
بیک آمدن ربودی دل و دین و جان خسرو
چہ شود اگر بدینساں دوسہ بار خواہی آمد
(تیری ایک جھلک پر خسرو نے دل و دین و جان فدا کر دیے ہیں۔ اس کا کیا ہو گا جو تو دو تین بار آئے گا۔)

ان کھڑے، خمیدہ حروف جیسے کسی قدیم معبد کی شکستہ سیڑھیوں پر پجاری سجدہ ریز ہوں۔

اس کی روح میں گڑی ہوئی سوئیاں چن کر نکال دی گئی تھیں۔ ایک مسیحا ہاتھ اس کے دل کو تھپک رہا تھا۔

اللہ نے اسے گرانٹ کے دل سے کبھی نہیں نکالا تھا۔ اللہ اس سے ناراض نہیں تھا۔

* * *

ایک سفید دھبا تھا، جس کا پھیلاؤ اس کی آنکھوں پر قابض ہو رہا تھا۔ اس میں چمک تھی، جو چبھتی تھی اور پپوٹوں کو اٹھنے نہ دیتی تھی۔ چند لمحے کوشش کرنے کے بعد اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

"صوفیہ! کیا تم جاگ چکی ہو۔"

اس نے چبھنے والی روشنی کی پروا کیے بغیر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسپتال کا کمرا تھا اور وہ سفید چادر والے بستر کے گدے کو اپنی کمر کے نیچے دبتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ وہ دواؤں کی بو سونگھ سکتی تھی۔ درد کی ٹیسوں اور ان کی وجہ کو بھی اس نے شعوری طور پر قبول کر لیا تھا لیکن وہ اپنی بصارت پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی کہ وہ حقیقت میں عمر کو ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم جاگ گئی ہو تو میں ڈاکٹر کو اطلاع دیتا ہوں۔"

"میں سوئی کب تھی جو جاگتی۔ میں تو مر گئی تھی۔"

"ان وحشیوں نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان میں سے دو کو حراست میں لیا گیا ہے۔ ایک راہ گیر عورت نے ان کی گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ اسی نے پولیس کو تمہارے متعلق اطلاع دی۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔"

"میں کیا پوچھتا صوفیہ! کہ تم مر گئی ہو یا ابھی تمہارے مرنے میں کچھ دیر باقی ہے؟" وہ پہلی بار غصے میں نظر آیا اور اس سے پہلے وہ صوفیہ کو کبھی اتنا دلکش نہیں لگا تھا۔

"مجھے پتا ہی نہ چلتا اور میں پاکستان چلا جاتا تو پھر کیا ہوتا؟"

"تو پھر کیا ہوتا عمر؟" اس نے عمر کے چہرے کو بنا پلک جھپکائے دیکھتے ہوئے نقاہت سے چور آواز میں کہا۔

"جو بھی ہوتا وہ اچھا ہر گز نہ ہوتا۔ ہماری فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو گئی تھی۔ اگر میں انتظار گاہ میں نصب ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والا نیوز بلیٹن نہ دیکھ لیتا تو میں "یقیناً" جا چکا ہوتا۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ تم مرنے تک میرا انتظار کرو گی۔"

"میں نے مرنے تک ہی تو انتظار کیا۔"

"میں ڈاکٹر کو بتا کر آتا ہوں۔"

عمر جانے لگا تو وہ بول پڑی۔ "ٹھہر جاؤ اور میری تعریف کرو۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"مجھے یقین نہیں ہے کہ تم میری تعریف کر سکتے ہو۔"

"میں کر سکتا ہوں لیکن اس وقت میں غصے میں ہوں۔"

"تو میں کیا کروں؟ میں بیمار ہوں۔ ایک غصے میں آئے ہوئے شخص کو کسی بیمار پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔"

عمر حسب عادت جھجک رہا تھا اور اس کی نظریں چھت سے لے کر فرش تک صوفیہ کے سوا کمرے کی ہر شے پر باری باری ٹک رہی تھیں۔

"میں تمہیں دیکھتا ہوں تو میرا دل تشکر سے بھر جاتا ہے کہ اللہ نے مجھے آنکھیں دی ہیں۔"

"تم تو مجھے دیکھتے ہی نہیں۔ تم اب بھی مجھے نہیں دیکھ رہے۔ تم ڈرپ اسٹینڈ کو دیکھ رہے ہو، دروازے کو دیکھ رہے ہو، اسٹول کو دیکھ رہے ہو۔"

صوفیہ نے اسے جھٹلایا۔

"تم بولتی ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اور کو نہ سنوں۔ میں اپنی آواز تک برداشت نہیں کر سکتا۔"

"کیونکہ تمہیں بولنا ناپسند ہے۔ تم دنیا کے سب سے کم گو انسان ہو۔"

"مجھے ٹوکو نہیں، ورنہ میں اور تعریف نہیں کروں گا۔" وہ جھنجلا رہا تھا۔

"اچھا مزید کہو۔"

"تم ہنستی ہو تو ساری کائنات خوشی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ میرے اندر باہر اجالا ہو جاتا ہے۔"

"تم مجھے ہنسنے ہی کب دیتے ہو۔"

"میں نے تمہیں روتے ہوئے دیکھا تو مجھے خبر ہوئی کہ دکھ کس جنس کا نام ہے، درد کہتے کسے ہیں۔ تم نے بتایا نہیں کہ کافی کے کپ میں میرے آنسو گرے ہوتے تو تم کیا کرتیں۔"

"میں نہیں بتاؤں گی ورنہ تم غرور کرنے لگو گے اور تمہاری برائیوں میں ایک اور اضافہ ہو جائے گا۔"

"میں پوچھ کر رہوں گا۔" اس نے اصرار کیا۔

"میں کسی کیمیائی ممتحن سے اس کا تجزیہ کرواتی کہ آنسوؤں کی آمیزش سے کافی کی ماہیت میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں؟"

اس کے زرد چہرے پر چاندی جیسی ہنسی کی دھوپ تھی۔

* * *

وہ گھومتے ہوئے چاک اور قالب بدلتی مٹی کو مشتاق نگاہوں سے تکتی تھی۔ مٹی کا بے ڈھب تودا کس صورت میں ڈھلے گا؟ کوئی ناند، کٹورا، کلسی یا تھیا، وہ حیرت سے مٹی کے مقدر کو بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

حکیم بیگم نے سفید بالوں والا سر اٹھا کر عمر کو مخاطب کیا۔ "گل سن لے کاکا! اے کڑی میری بولی نئیں جاندی۔ (یہ لڑکی میری زبان نہیں سمجھتی۔)

اس نے مٹی سے لتھڑی ہوئی انگلی سے چاک میں کھوئی ہوئی صوفیہ کی سمت اشارہ کیا۔

"تو اس نوں دس دے۔ میں لکھ ان ولی سہی، بے عقلی سہی، پر میری نیت وچ کھوٹ نئیں۔ میرے من وچ میل نئیں۔

(تو اسے بتا دے۔ میں لاکھ بے ہنر سہی، بے عقل سہی پر میری نیت میں کھوٹ نہیں۔ میرے من میں میل نہیں۔)"

❋

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

H شہریار خان ایک نہایت معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ذہانت میں بھی بے مثال اور نہایت سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خاصے مغرور ہو گئے ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے شہریار خان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن (امریکا) میں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی بھی نہایت خوب صورت اور اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ گھر اور بچوں کی نگہداشت کی خاطر ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا سکندر اپنے باپ کا عکس ہے۔ گو چھوٹا بیٹا زین بھی ذہین اور خوب صورت ہے مگر سکندر، باپ کا عکس ہونے کی وجہ سے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ باپ کے اس امتیازی سلوک کی وجہ سے زین بچپن سے ہی بے حد حساس اور کم گو ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے نفرت کرنے لگا ہے۔

لیزا، لندن میں رہتی ہے، مگر اس کا وطن روم ہے۔ اسے اپنے وطن سے بے حد محبت اور انسیت ہے، چنانچہ وہ ہر سال اپنی چھٹیاں روم میں گزارتی ہے۔ روم میں اس کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوتی ہے، جو اپنا تعارف "سکندر" کے نام سے کرواتا ہے۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں روم آیا ہوا ہے۔ مغرور اور ہینڈسم سا سکندر، لیزا کو بے حد اچھا لگا۔ وہ اس سے دوستی کی خواہاں ہے۔

مکمل ناول

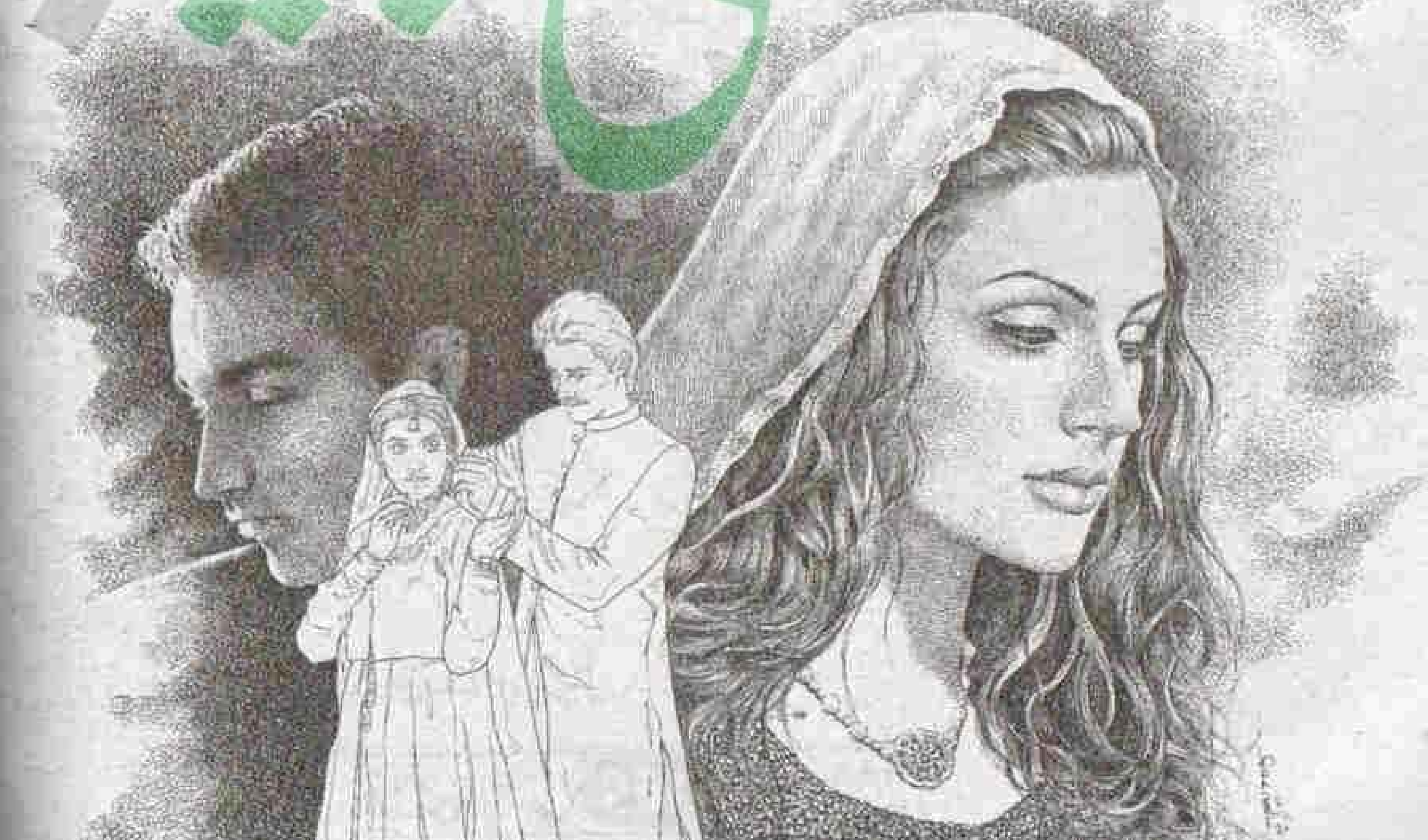

لیزا ایک مصورہ ہے۔ سکندر کی مکمل شاہانہ شخصیت اور اس کے تیکھے مغرور نقوش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ وہ اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کر دیتا ہے۔

ایک دو اتفاقیہ ملاقاتوں کے بعد لیزا سکندر سے مزید متاثر ہو جاتی ہے لیکن سکندر کا وہی اکھڑ مغرور انداز ہے۔

لیزا کا روم میں اپنا اپارٹمنٹ ہے، جو اس کے باپ نے اسے خرید کر دیا ہے۔ جہاں وہ نینی کے ساتھ رہتی ہے۔

سکندر کو نیپلز میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے لیکن طبیعت کی خرابی کی بنا پر اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی ٹرین مس ہونے کی بنا پر اسے مجبوراً" لیزا کی مدد لینا پڑتی ہے۔ لیزا اس کو نیپلز لے کر جاتی ہے۔ اور واپس بھی لاتی ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اوپر تلے دو بیٹیوں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔

وٹوریا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر گئی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اوسط درمیانہ درجہ کی تھی۔

والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو وٹوریا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

وٹوریا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی بزنس مین سے شادی کر لی۔ اس کے ساتھ میلان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سیم سے بہت قریب تھی اسے اپنے روما سے بھی بہت پیار تھا' ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔ محمود خالد سیم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے' اس کے باوجود وٹوریا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ کی حالت میں سیم کے کمرے میں آگیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہو گئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوتیلی ماں کے بھی قریب نہ ہو سکی' وہ اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف ہاشم اسد سے کرا دی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے' یہ شادی کی تھی۔

لیزا نے عیسائی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کر کے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بھائی زین شہریار کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار ریکارڈ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہریار کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پرپوز کیا۔ ام مریم نے اس کا پرپوزل بہت خوش دلی سے قبول کر لیا۔ زین شہریار نے اپنی والدہ کو فون کر کے بتا دیا۔ زین کو یقین تھا کہ ام مریم جیسی لڑکی کو اس کے والد انکار کر ہی نہیں سکتے۔

۳

تیسری قسط

ہفتے کی پوری رات اور اتوار کا پورا دن اعصابی درد میں گزار کر پیر کے روز وہ آفس میں موجود تھا۔ ابھی بھی اسے شدید درد تھا۔ اس کے آدھے سر میں درد تھا۔

اس کی گردن کے پچھلے حصے سے درد کی شدید لہر وقتاً" فوقتاً" اٹھ رہی تھی اور وہ اس کے بازوؤں تک پھیل رہی تھی۔ ہفتے کی دوپہر لیزا کے ساتھ جو اس نے کھانا کھایا تھا' اس کے بعد سے آج پیر کے دن تک اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا فقط جو چیز اس کے حلق سے نیچے اتری تھی۔ وہ بے حساب چائے اور کافی کے کپس تھے یا پھر درد سے نجات کے لیے ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویہ۔ اس پر خود سے بھی اور زندگی سے بھی بیزاری پوری طرح حاوی تھی۔ اپنی زندگی ختم کرنے کا جی چاہ رہا تھا مگر دفتر میں اس نے کسی کو بھی نہ اپنی طبیعت کے متعلق کچھ پتا لگنے دیا تھا' نہ اپنا چڑچڑا پن اور بدمزاجی کسی پر ظاہر کی تھی۔ کام کی بات کے علاوہ وہ یہاں کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا' جو کوئی کام کی بات سے آگے جا کر کچھ اور بات کرتا اور وہ جواباً" کسی بدمزاجی کا مظاہرہ کرتا۔ ایک روبرٹو تھا یہاں' جس سے دوسروں کی نسبت اس کی زیادہ بات چیت ہو جایا کرتی تھی مگر اسے بھی دوستی یا بے تکلفی کے زمرے میں ہرگز شامل نہیں کیا جا سکتا تھا' چنانچہ اگر روبرٹو واپس آ بھی چکا ہوتا تب بھی وہ کم بولتا اور اپنے کام سے کام رکھتا اور اس پر اپنے مزاج کی کوئی تبدیلی آشکار نہ ہونے دیتا۔

یہاں تو وہ چند ہفتوں کے لیے آیا تھا۔ وہاں' جہاں وہ اب مستقل رہا کرتا تھا' وہاں اس نے کسی کو خود سے ایک حد سے زیادہ نزدیک نہیں آنے دیا تھا۔ اس کے کولیگ بہت تھے' اس کے واقف بہت تھے' اس کے ملنے والے بہت تھے مگر اس کا دوست کوئی نہ تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ دوستی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک لکیر کھینچ کر رکھتا تھا وہ اپنے اور اپنے سے واقف ہر شخص کے بیچ۔ اس حد فاصل سے آگے آنے کی اس نے کبھی کسی کو جرأت نہیں دی تھی' سوائے اس لڑکی لیزا محمود کے' جو زبردستی اس کے نزدیک آنے کی کوشش کر رہی تھی' زبردستی اس سے بے تکلف ہونے اور دوستی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتوار کا پورا دن اس نے اپنا موبائل آف رکھا تھا۔ وہ لیزا محمود سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق' کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی ہنسی کی اتنی کڑی سزا؟ درد کی اٹھتی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے سوچا' وہ اب لیزا سے کبھی نہیں ملے گا۔ نہ وہ اس سے ملے گا نہ ہی پھر وہ کبھی ہنسے گا' نہ خوش ہوگا' نہ قہقہے لگائے گا اور نہ ہی پھر اسے خود کو یوں سزا دینے کی ضرورت پڑے گی' مگر اسے پتا نہیں تھا وہ آج پھر اس کے آفس آ دھمکنے والی ہے۔ وہ ڈائریکٹر فنانس کے آفس سے سنجیدہ و پیشہ ورانہ نوعیت کا ڈسکشن کر کے باہر نکلا تو اسے لیزا سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔

* * *

"سکندر!" اسے سکندر کسی آفس سے نکل کر کوریڈور میں آگے بڑھتا نظر آیا تو اس نے حسب عادت بے تکلفانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ یقیناً" سکندر نے اسے دیکھا نہیں تھا' ورنہ وہ ہائے ہیلو کرنے ضرور رکتا۔ یہاں کمپنی کے اس آفس کے لیے اس نے جو پینٹنگز بنا کر دینی تھیں' انہیں کے حوالے سے آج اس کی کمپنی کے چند سینئر ایگزیکٹوز کے ساتھ دوبارہ میٹنگ تھی۔

اس کی یہاں گزشتہ میٹنگ خاصی کامیاب رہی تھی۔ کمپنی اسے اس کا منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھی۔ آج پینٹنگز کا موضوع طے کرنا تھا' کچھ تھیمز پر ان سب نے گزشتہ میٹنگ میں بات چیت کی تھی' کچھ پروپوزلز وہ آج لائی تھی۔ آج موضوع طے کر لیے جانے کے بعد اس نے اس پروجیکٹ پر کام شروع کر دینا تھا۔ وہ آج یہاں لانے کے لیے کل سارا دن مختلف آئیڈیاز پر کام کرتی رہی تھی' خاصی مصروف رہی تھی مگر مصروفیت میں بھی اس نے دن میں دوبار سکندر کو کال کی تھی اور دونوں مرتبہ اس کا نمبر بند ملا تھا۔

ہفتے کے روز وہ اس کے ساتھ خوشگوار موڈ میں رہا تھا۔ انہوں نے بہت باتیں کی تھیں۔ سکندر نے اسے

اپنی تازہ تازہ بنی دوست قرار دیا تھا اور اس کی نئی نئی بنی دوست ٹرک ڈرائیوروں والی اردو زبان بولتی ہے' اس پر اظہار افسوس بھی کیا تھا۔ آخر میں آکر اس کا موڈ تھوڑا اپ سیٹ ہو گیا تھا وہ کچھ ڈسٹرب سا نظر آنے لگا تھا' ورنہ باقی تو وہ سارا وقت بڑے اچھے اور دوستانہ موڈ میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ ایسے میں وہ یہ تو ہرگز نہیں سوچ سکتی تھی کہ سکندر نے اپنا موبائل اس کی وجہ سے آف کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا تھا تو بس یہی کہ شاید وہ آرام کرنا چاہتا ہو گا یا پھر شاید اسے آفس کے کاموں کی کوئی مصروفیت لاحق تھی اور وہ ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتا ہو گا۔ اس لیے سیل آف کر دیا ہو گا مگر اس کے یہ تمام اندازے اور تمام خیالات اس وقت سکندر کے سرد اور سپاٹ سے چہرے کو دیکھ کر غلط ثابت ہو گئے تھے۔

وہ اس کے آواز دینے پر رکا تھا۔ نگاہوں میں اجنبیت نہیں تھی مگر ایک سرد سا تاثر موجود تھا۔ جیسے وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"چاؤ سینور سکندر!" اس نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔

"چاؤ۔" بغیر مسکرائے' سنجیدہ اور سپاٹ سے انداز میں اسے کہتا وہ وہاں بالکل بھی نہیں رکا تھا۔ وہ جواباً" کیا کہنے کے لیے لب کھول رہی ہے' یہ سننے کی زحمت کیے بغیر وہ وہاں سے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے کوریڈور میں کھڑے کھڑے ہی نظر آ رہا تھا وہ کوریڈور کے آخر تک جاکر دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ اب وہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے اپنے آپ میں بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے' کیسے آئی ہے' رسمی سی خیر و عافیت' کچھ بھی پوچھے بغیر وہ اس طرح اسے نظر انداز کرتا ہوا چلا گیا تھا' جیسے اس سے ہائے ہیلو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوفت سی بھی ہو رہی تھی اور سکندر کی سرد مہری اور خاموش بدتمیزی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

آپ زبان سے بدتمیزی کا مظاہرہ نہ کریں' بس اپنا رویہ بدتمیز بنالیں' وہ ایسا ہی کیا کرتا تھا ناں؟ ایسا ہی ابھی بھی کر کے گیا تھا ناں؟ سکندر پر جھنجلاہٹ اور کوفت محسوس کرتی وہ میٹنگ کے لیے چلی گئی تھی۔

* * *

دو گھنٹے کی طویل میٹنگ جس میں ہر چیز حتمی طور پر طے کر لی گئی تھی کے اختتام پر وہ کمپنی دو ایگزیکٹوز کے ساتھ ہی کانفرنس روم سے باہر نکلی تھی۔ ان دونوں سے خوشگوار انداز میں رسمی نوعیت کے الوداعی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئی تھی شام کے پانچ بج رہے تھے اور یہ آفس ٹائم ختم ہو جانے کا وقت تھا۔ اسے آتے جاتے مختلف لوگ جلدی جلدی کام سمیٹ کر گھر جانے کی فکر کرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ لفٹ کے پاس آکر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے لفٹ کا بٹن دبا دیا تھا۔

لفٹ آگئی اور وہ لفٹ میں داخل ہونے لگی تب اس کے پیچھے کوئی اور بھی لفٹ میں داخل ہوا تھا۔ سیدھے ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دیکھا وہ سکندر تھا۔ اس کا بلیک لیدر بریف کیس اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور لیپ ٹاپ بیگ بائیں کندھے پر لٹکا تھا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس بار سکندر نے بھی اسے ابھی ہی دیکھا تھا۔ لفٹ میں داخل ہو جانے کے بعد کم از کم اتنا وہ بتا سکتی تھی کہ اس نے اسے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ سکندر کا دو گھنٹے قبل کا رویہ اسے یاد تھا' اس لیے وہ مسکرائی تو نہیں بس اخلاقاً" سنجیدگی سے پوچھ لیا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بظاہر بالکل صحت مند اور نارمل لگ رہا تھا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں اس بار لفٹ میں اس کے پاس کھڑے ہو کر جب اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں بہت سا درد' تکلیف اور ویرانی سی نظر آئی۔

"ٹھیک ہے۔" سکندر کا جواب مختصر اور سنجیدہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی' خاموشی اور درد نے اس کے غصے کو پل بھر میں کہیں دور لے جا پھینکا۔ نجانے کیا دکھ لاحق تھا اسے' جو وہ یوں اتنا عجیب' اتنا مختلف سا مزاج رکھتا تھا۔ وہ سکندر پر اپنا غصہ قائم نہیں رکھ پائی تھی۔

وہ آرٹسٹ تھی اس لیے حساس زیادہ تھی' شاید اسی لیے وہ اس شخص کے لفظ اور رویے نہیں اس کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کے لفظوں اور رویوں میں سرد مہری' بے گانگی' اجنبیت اور بے مروتی ہوتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں؟ درد ہی درد' غم ہی غم' اتنی اداسی اور اتنی ویرانی اس نے کبھی کسی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

لفٹ گراؤنڈ فلور پر آگئی تھی۔ وہ سکندر کو دیکھ رہی تھی اور وہ لفٹ کے فرش کو اس سے لاتعلق' بے نیاز' بے پروا۔ وہ دونوں لفٹ سے باہر آگئے تھے۔

"میں تمہیں ڈراپ کر دوں سکندر؟"

"ہاں؟" اس نے ایک دم چونک کر یوں اسے دیکھا' جیسے یہاں پر موجود ہی نہیں تھا۔ وہ بہت الجھا اور بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں تمہیں تمہارے ہوٹل ڈراپ کر دوں۔ یہ پوچھ رہی تھی میں؟" اس نے ہلکی دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ سکندر نے اسے بغور دیکھا تھا' یوں جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہے۔ یک دم ہی وہ اس سے بولا۔

"تمہیں اس وقت کوئی اور کام تو نہیں ہے لیزا؟"

"نہیں' کیوں؟" وہ اتنا غیر متعلقہ سا سوال سن کر حیران ہوئی تھی۔

"تم مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دو جہاں سبزہ ہو' تازہ ہوا ہو۔ میں کچھ دیر کھلی آب و ہوا اور ہریالی کے بیچ رہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے بولتے ہوئے کھینچ کر یوں سانس لیا جیسے اس کی سانس گھٹ رہی ہو' اسے سانس لینے میں دقت کا سامنا ہو۔

"ٹھیک ہے' چلو۔" وہ جواباً" مسکرا کر بولی۔ اب وہ یہ بات یقین سے کہہ سکتی تھی کہ سکندر کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔ شاید اسے پھر Cervicalpain ہو رہا تھا۔ نیپلز جاتے ہوئے بھی اس نے سکندر کی یہی کیفیت دیکھی تھی۔ وہ دونوں باہر آگئے تھے۔ سکندر اس کے برابر والی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔ ایک' دو سیکنڈ خاموشی سے ڈرائیو کرنے کے بعد اس نے سکندر کو دیکھا۔ "تمہیں cervicalpain ہو رہا ہے؟" سکندر نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ ایک پل اسے بغور دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر ہاں میں ہلا دیا۔

"تم کسی اچھے ڈاکٹر سے کنسلٹ کرو ناں۔ اتنی ینگ ایج میں اس طرح کی تکلیف اور وہ بھی اتنی جلدی جلدی تو نہیں ہونی چاہیے۔" وہ دوستانہ انداز اور پرخلوص لہجے میں بولی تھی۔

"تم مجھے کہاں ڈراپ کرو گی؟" اپنی صحت سے متعلق اس کے جملے پر محض ہلکا سا سر ہلا کر سکندر نے فوراً" ہی موضوع تبدیل کر دیا گویا اور بہت ساری باتوں کے ساتھ وہ اپنی صحت کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "ہم Villa borghese جا رہے ہیں بورگ ہیز گارڈنز کا تم نے نام تو ضرور سن رکھا ہو گا؟"

"ہم؟" اس نے سکندر کو حیرانی سے اپنی سمت دیکھتا پایا۔

"جی' ہم۔ تمہیں وہاں چھوڑ کر آجاؤں' تم اکیلے اکیلے وہاں انجوائے کرو اور میں اپنے اپارٹمنٹ جا کر بند ہو جاؤں۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں۔ تم سے سن کر میرا بھی دل چاہ رہا ہے کھلی کھلی سرسبز سی جگہ پر وقت گزارنے کا۔"

وہ عادتاً" مسکرا کر بولی تھی۔ اس بار اس نے سکندر کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آتی دیکھی۔

"لیجیے جناب پہنچ گئے ہم Piazza del Popolo۔ یہیں سے مین انٹرنس ہے ولا بورگیز کے اندر جانے کے لیے۔"

چند منٹوں کے بعد گاڑی ایک دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے لیزا نے سکندر سے کہا۔

"Villa borghese gardens میں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ مگر اندر جانے کے بعد — میں وہاں موجود میوزیمز یا آرٹ گیلریز وزٹ کرتی ہوں تو اس کے لیے ٹکٹ خریدنا لازمی تھا۔" آرٹ گیلریز اور میوزیمز میں جانے کے خواہش مند افراد وہاں طویل قطاریں لگائے نظر آرہے تھے۔ چونکہ سورج غروب ہونے میں ابھی خاصا وقت باقی تھا' چنانچہ گارڈنز میں سبزے اور ہریالی کو انجوائے کرنے کے لیے آنے والوں کی تعداد بھی کثیر تھی۔

"مجھے پتا ہوتا آج میں تمہارے ساتھ آنے والی ہوں تو آرٹ گیلریز میں جانے کے لیے آن لائن ٹکٹ خرید لیتی۔ اب اس وقت اتنی لمبی قطار میں لگنے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔" قدیم رومن آرکیٹکچر والے داخلی راستے سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ سکندر سے بولی تھی۔

"تمہیں آرٹ میں دلچسپی نہیں ورنہ تم یہاں موجود خوب صورت اور بے مثال آرٹ کلیکشن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے۔ یہاں Rafaello Raphael Bernini ان سب کا بڑا نادر کام موجود ہے۔ آرٹ کے شائقین کے لیے تو ناممکن ہے کہ وہ روم آئیں اور یہاں وزٹ کیے بغیر چلے جائیں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بول رہی تھی۔

"تم تو ابھی بہت سارے دنوں تک روم میں موجود ہو۔ پھر کسی دن ٹکٹ خرید کر یہاں آجانا اور یہاں موجود تمام آرٹ گیلریز اور میوزیمز کی سیر کرلینا۔"

سکندر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ لیزا نے بغور اسے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر تناؤ والی کیفیت نہیں تھی۔ سرد و سپاٹ تاثر کی جگہ چہرے پر دوستانہ سی مدھم مسکراہٹ نے لے لی تھی جیسے اسے یاد آگیا ہو کہ وہ دونوں کئی دفعہ مل چکے ہیں' بہت باتیں کرچکے ہیں اور بہت سارا وقت ساتھ گزار چکے ہیں۔ شاید یہاں کے سبزے اور ہریالی نے اس کے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا تھا یا پھر اسے یہ بھولی ہوئی بات یاد آگئی تھی کہ وہ لیزا سے دوستی کرچکا ہے۔ وجہ جو بھی تھی بہرحال اب وہ قدرے پرسکون اور مسکراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت اور سناٹا بھی کچھ کم نظر آرہا تھا۔

"ہم لیک گارڈن میں چل کر بیٹھیں؟"

اردگرد ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ وہ دونوں اس وقت چیڑ اور صنوبر کے درختوں کے درمیان ایک خوب صورت راستے سے گزر رہے تھے۔

"یہ ایک نہیں دراصل کافی سارے گارڈنز کا مجموعہ ہے۔ ہر گارڈن کی اپنی اپنی الگ خوبی ہے۔ کہیں تمہیں پھلوں کے درخت زیادہ ملیں گے' کہیں مشہور فنکاروں کے بنائے قدیم مجسمے اور فاؤنٹین اور کہیں کسی جنگل کا سا قدرتی تاثر دیتے گارڈن۔ مجھے ذاتی طور پر لیک گارڈن زیادہ پسند ہے۔ وہاں جھیل میں کشتی چلائی جائے یا جھیل کنارے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھا جائے' مجھے تو دونوں میں بہت مزا آتا ہے۔" سکندر کے چہرے کی سوالیہ سی حیرانی دیکھ کر اس نے وضاحت کی تھی۔

"جو جگہ تمہیں ٹھیک لگے' وہی مناسب ہے۔ تمہیں تو پتا ہے' میں یہاں کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ کبھی بہت پہلے روم کے متعلق کسی سفر نامے میں ضرور یہاں کے بارے میں پڑھا تھا مگر وہ بھی اب کچھ خاص یاد نہیں۔"

وہ اب مسکراتے ہوئے بالکل اسی طرح بات کررہا تھا جیسے کلوزیم میں اس کے ساتھ کی تھیں۔

"یہاں کے بارے میں' میں تمہیں بتادیتی ہوں۔"

خوب صورت درختوں اور سبزے سے بھرے راستے سے گزرتے وہ دونوں لیک گارڈن تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ اردگرد نگاہیں دوڑاتا اس جگہ کو تعریفی نظروں سے دیکھتا نظر آیا۔

"ہے ناں یہ جگہ خوب صورت؟" اس نے فخریہ انداز میں یوں پوچھا گویا اس گارڈن کی تخلیق کرنے والی

سولہویں یا سترہویں صدی کی آرکیٹیکٹ وہ خود ہی تھی۔ سکندر نے اس کی طرف فوراً" دیکھا تھا اور بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"تم جس طرح اپنے روما اور روما کی ہر چیز سے پیار کرتی ہو' مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے لیزا!"

دھوپ چھاؤں کا سا مزاج رکھتا وہ شخص اب یوں مسکرا رہا تھا' یوں دوستانہ انداز میں بات کررہا تھا گویا آج اس کے آفس میں لیزا سے سرد مہری سے پیش آنے والا شخص کوئی اور تھا۔

"یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔" جھیل سے نزدیک گھاس پر درختوں کی چھاؤں میں ایک جگہ سکندر کو بیٹھنے کے لیے اچھی لگی تھی۔ وہ سر ہلاتی اس کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی تھی۔ سکندر کی نظریں پانی کی طرف تھیں جبکہ وہ ان کئی کئی سو سال قدیم درختوں میں سے ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے سکندر کی نگاہوں کے تعاقب میں جھیل کی طرف دیکھا تھا۔ بہت سے سیاح پانی میں چپوؤں والی کشتی چلاتے نظر آرہے تھے۔ جھیل ہر طرف سے سبزے میں گھری تھی۔ اس کے ہر کنارے پر درختوں کے جھنڈ تھے' بیلیں تھیں' پھلوں اور پھولوں سے لدی درختوں کی شاخیں تھیں۔

"پانی پر سبزے اور پھولوں کا جو یہ شیڈ پڑ رہا ہے کتنا خوب صورت لگ رہا ہے ناں سکندر؟ ادھر دیکھو تو پانی سبز نظر آرہا ہے' وہاں دیکھو تو سرخ' ادھر گلابی اور وہاں نیلا' ایک ہی جھیل بیک وقت کتنے سارے رنگوں سے سجی ہے۔"

وہ مسکرا کر سکندر سے کہہ رہی تھی۔ سکندر نے جواباً" اس کی طرف دیکھا ضرور مگر بولا کچھ نہیں۔ اسے اس کی خاموشی بڑی عجیب سی لگی۔

"تمہیں رنگ اچھے نہیں لگتے سکندر؟"

"پتا نہیں' مجھے رنگوں کو محسوس کرنا نہیں آتا۔" وہ بے خیالی میں بول گیا مگر جیسے ہی اسے بے خیالی میں منہ سے نکلی بات کا دھیان آیا فوراً" بات بدل کر اس سے پوچھنے لگا۔

"تم تو یہاں پہلے بھی بہت دفعہ آئی ہو گی؟"

"ہاں۔" سکندر کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ان کے بالکل سامنے درختوں کے پاس سیاحوں کا ایک گروپ آکر کھڑا ہوا تھا۔ اس میں دو افراد اٹالین لگ رہے تھے جبکہ باقی تمام افراد امریکن تھے۔ شاید وہ امریکن ان اٹالینز کے مہمان تھے یہاں۔ وہ سب جیسے کسی موضوع پر زور و شور سے گفتگو اور بحث مباحثہ کرتے ہوئے آرہے تھے۔ گروپ میں شامل ایک امریکن جوڑے نے وہاں تصویر کھنچوائی تھی۔ وہ لوگ اس لیے وہاں رکے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی یہ چاہتے تھے کہ تصویر میں ان کے عقب میں جھیل اس طرح آنی چاہیے کہ جھیل کے بیچوں بیچ بنا ٹیمپل بھی نظر آئے۔ سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا کرتا تھا۔ جتنی دیر وہ میاں بیوی وہاں تصویر کھنچوا رہے تھے باقی افراد وہیں کھڑے باہم گفتگو کررہے تھے۔

امریکن مہمانوں کی خاطر ان کے اٹالین میزبان بھی انگریزی ہی میں گفتگو کررہے تھے۔ ان لوگوں کی گفتگو کے چند جملوں ہی سے سمجھ میں آگیا تھا کہ کیا موضوع ڈسکس کیا جارہا ہے۔ کل رات یہاں ولا بورگیز کے باہر والی سڑک پر ایک سترہ سالہ لڑکی کا ریپ ہوا تھا۔ غالباً" آدھی رات سے بھی اوپر کا ٹائم تھا۔ آج سارا دن یہ خبر تمام نیوز چینلز پر چلتی رہی تھی۔

"نیوز چینلز کے پاس جب اور کچھ خبر نہیں پہنچتی تو وہ اس طرح کی خبریں چلا چلا کر لوگوں کا بی پی ہائی کرواتے ہیں۔" سیاحوں کا وہ گروپ تصویر کھینچنے کے بعد وہاں سے ہنوز اسی موضوع پر باتیں کرتا ہوا جارہا تھا تب وہ سکندر سے بولی تھی۔ سکندر بھی ان لوگوں کی گفتگو سنتا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے مجھے بھی ہمدردی ہے اس لڑکی سے' اس کے ساتھ جو ہوا بہت برا ہوا ہے' مگر میں یہ پوچھتی ہوں رات کے دو ڈھائی بجے وہ اکیلی سڑکوں پر کیا کرنے نکلی ہوئی تھی؟ ایک تنہا خوب صورت لڑکی آدھی رات کو سڑک پر کسی بدفطرت و بدکردار کو ٹکرے تو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ ماں' باپ سے لڑائی

ہوئی تھی یا بوائے فرینڈ سے جھگڑا' تب بھی اس طرح آدھی رات کو سڑکوں پر پھرنے کی تک کیا تھی؟"

اپنی دھن میں مگن بولتے ہوئے اسے سکندر کے تاثرات کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر اس کا دھیان گیا تو وہ حیران پریشان سی رہ گئی۔ سکندر کے چہرے پر عجیب سا جنون اور وحشت پھیلی تھی۔ وہ انتہائی سخت نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا فوراً" ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سکندر؟ کیا ہوا؟" وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی وہ بالکل ہکا بکا سی اس کے ساتھ ہی فوراً" کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا سکندر؟" اس نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

"کسی کے بارے میں کچھ بھی بول دینا' جو مرضی تبصرہ کر دینا بہت آسان ہوتا ہے لیزا محمود! کیا جانتی ہو تم اس لڑکی کے بارے میں؟ بتاؤ مجھے؟"

وہ شدید غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اور انتہائی غیظ و غضب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیزا نے اس کی سرد مہری' اجنبیت' بے گانگی سب کچھ دیکھ رکھا تھا مگر یہ انداز اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"نیوز چینلز کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی اندازے لگا لینا' اس لڑکی پر تبصرے کر لینا' تنقید کر لینا' مذاق اڑا لینا بہت آسان ہے۔ کیا تم نے سوچا اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہو گا جو وہ آدھی رات کو سڑکوں پر تھی' کیا گزری تھی اس پر جو وہ اپنے گھر سے نکل پڑی۔۔۔؟ لیزا محمود! زندگی برباد ہو گئی ہے اس لڑکی کی۔ کل رات جو کچھ اس کے ساتھ ہوا' وہ اب زندگی بھر اس خوف' بے بسی اور ذلت سے باہر نہیں نکل سکے گی۔"

سکندر کے لفظوں میں سختی تھی' بے پناہ غصہ اور نفرت تھی۔ وہ فوراً" ہی وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گیا۔ ایک پل تو وہ بالکل حیران پریشان' ساکت اپنی جگہ پر کھڑی رہی' مگر جیسے ہی اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ وہاں سے جا رہا ہے' وہ فوراً" اس کے پیچھے بھاگی۔

"سکندر! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم اس طرح ناراض کیوں ہو گئے ہو؟ پلیز رکو تو سہی۔"

اس نے اسے پیچھے سے ہی چلا کر آواز دی تھی کیونکہ وہ جس تیز رفتاری سے جا رہا تھا' وہ اس کا ساتھ دینے میں ناکام تھی۔ سکندر نے نہ مڑ کر اسے دیکھا' نہ کوئی جواب دیا' نہ ہی رکا۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار کچھ اور بھی تیز کر لی تھی۔

اس نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ اردگرد سے گزرتے لوگ اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

"سکندر پلیز رک جاؤ۔" تھک کر مایوس سی ہوتی وہ اپنی جگہ رک گئی تھی۔ بے ہنگم انداز میں بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول گئی تھی۔

وہ وہیں کھڑے ہو کر سانس بحال کرتے ہوئے سکندر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اب اسے ولابورگیز سے باہر جاتا نظر آ رہا تھا۔

وہ چیڑ کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ یونہی بے مقصد گفتگو برائے گفتگو کے طور پر منہ سے نکلے اس کے وہ چند جملے سکندر کو اس قدر ناگوار گزر جائیں گے' وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ بار بار ذہن میں اپنے کہے جملوں کو دہرا رہی تھی۔ اسے ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس پر یوں غصے سے بے قابو ہو جایا جائے۔

ایک واقعہ پر اس نے اپنی رائے دی تھی۔ وہ بھی جواباً" اس سے اختلاف کر کے اپنی رائے دے سکتا تھا۔ وہ حیران تھی' وہ بے حد پریشان تھی۔ اسے سکندر پر غصہ نہیں آ رہا تھا' اسے تعجب ہو رہا تھا۔ حیرت ہو رہی تھی' حیرت میں گھری وہ سکندر کو سمجھنے سے قاصر بھی تھی اور بہت دکھی بھی تھی۔

آج اسے پھر درد ہو رہا تھا' وہ کچھ وقت کسی کھلی کھلی سرسبز سی جگہ پر گزارنا چاہتا تھا اور اس کی اس بے موقع بات نے سب کچھ ختم کر دیا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا وہ سکندر کو ولا بورگیز چھوڑ کر خود باہر سے ہی واپس چلی جاتی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھلی ہوا میں سانس تو لے لیتا' وہ سبزہ' ہریالی' جھیل کا پانی' آبی پرندے یہ سب کچھ اس کی طبیعت کی اداسی اور پژمردگی کو دور نہ بھی کرتے' کم تو کر دیتے۔

اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا' وہ سکندر کے لیے فکرمند ہو رہی تھی' وہ اس کے لیے اداس بھی ہو گئی تھی۔ نجانے کیا غم' کیا دکھ اسے لاحق تھا' اس کے ساتھ نے اس دکھ کو کم نہیں کیا تھا بلکہ بڑھا دیا تھا آج۔

بہت دل گرفتہ سی وہ اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گئی تھی شکر تھا نینی گھر پر نہیں تھیں۔ وہ آج دوپہر سے اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ اس کا دل اتنا اداس تھا کہ اس وقت اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے نہ لباس تبدیل کیا تھا' نہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہونے کی کوشش کی۔ اندر آ کر خاموشی سے لیونگ روم میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اب اسے یہ فکر شروع ہو گئی کہ وہ اپنے ہوٹل پہنچ گیا ہو گا نا؟ وہ ٹھیک تو ہو گا نا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہو گی؟ وہ کیا ابھی بھی غصے میں ہو گا؟ وہ کیا کر رہا ہو گا؟

روم میں ایک اور طویل شام کا اختتام ہوا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح صوفے پر اداس سی بیٹھی تھی۔ نینی بھی کچھ دیر قبل گھر واپس آ چکی تھیں۔ غالباً" مغرب کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اسے سکندر کی شدید فکر لاحق ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا موبائل اٹھا کر سکندر کا نمبر ملایا۔ وہ تلخی سے بات کرے گا' یا اس سے بات ہی نہیں کرے گا' اس کا فون ہی نہیں اٹھائے گا وہ جو کچھ بھی کرے گا مگر وہ اب سکندر سے بات کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ تیسری بیل پر اس کی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ "ہیلو۔" اس نے سکندر کی آواز سنی۔ اس کے لہجے اور آواز میں غصہ نہیں تھا' ناراضی بھی نہیں تھی مگر پھر بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔

"تم ٹھیک ہو سکندر؟ اپنے ہوٹل پہنچ گئے تم؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

"ہاں' میں ٹھیک ہوں۔ سوری میں اس طرح تمہیں وہاں چھوڑ کر آ گیا۔"

اس کی معذرت بڑی پرتکلف تھی' جیسے وہ خود کو پھر اپنے اسی خول میں بند کر چکا تھا جو آج کچھ پل کے لیے چٹخ گیا تھا۔ اس نے نہ سکندر کی معذرت پر دھیان دیا' نہ اس کے پرتکلف انداز پر۔ اسے سکندر کے لہجے اور انداز میں جو غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا اور جسے وہ فوری طور پر کوئی نام نہ دے پائی تھی مگر اگلے ہی لمحے وہ سمجھ گئی کہ سکندر تکلیف میں ہے' اسے کہیں پر شدید تکلیف یا درد ہو رہا ہے' وہ لہجے کو چاہے جتنا بھی نارمل بنا لیتا مگر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے وہ تکلیف سے نکلنے والی اپنی کراہ کو دباتا' لب بھینچ بھینچ کر بات کر رہا ہے۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے سکندر؟" اس کی معذرت کے جواب میں اس نے بے اختیار فکرمندی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس بار اس نے ایک دبی دبی سی کراہ کی آواز سنی تھی۔ اب تو وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ سکندر ٹھیک ہے۔

"تم کہاں ہو سکندر پلیز۔ مجھے بتاؤ؟ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ پلیز سچ بتاؤ' تم کہاں پر ہو؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے پریشان ہو کر قدرے بلند آواز میں پوچھا تھا وہ اب مزید کوئی جھوٹ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اسے وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

"لیزا میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں ہسپتال میں ہوں۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"او مائی گاڈ۔" وہ بے اختیار صوفے پر سے اٹھی تھی۔

"کس ہسپتال میں ہو تم' مجھے نام بتاؤ۔" اس نے سینٹر ٹیبل سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔

"تم زحمت مت کرو لیزا میں ٹھیک۔۔۔۔"

"تم مجھے ہسپتال کا نام بتاؤ۔" اس نے غصے سے سکندر کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تیزی سے جوتے پہنتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی تھی۔

* * *

تیز ڈرائیونگ کرتی وہ بہت جلدی ہسپتال پہنچ گئی

تھی۔ استقبالیہ سے معلومات لیتی وہ فوراً ہی مطلوبہ کمرے تک پہنچی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اسے سکندر بیڈ پر لیٹا نظر آیا۔ اس کا دایاں پیر پٹیوں میں جکڑا تھا۔ ماتھے پر بھی پٹی بندھی تھی اور ہاتھ بھی زخمی نظر آرہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا سکندر؟" وہ اس کے نزدیک آگئی تھی۔ وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا دل دکھا کر نکلا تھا ناں' بلاوجہ تم پر چیختا چلاتا بس قدرت نے اس بدتمیزی کی فوراً ہی سزا دے دی کہ لیجیے سکندر شہریار! اب اس دیار غیر میں جہاں لیزا محمود کے سوا کوئی آپ کی زبان سمجھنے والا نہیں بستر پر پڑ جائیے۔"

وہ ہنس کر یوں بولا گویا خود اپنا مذاق اڑا رہا ہو' وہ اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر فکرمندی اور تشویش سے اسے پٹیوں میں جکڑا دیکھ رہی تھی۔

"خوب تماشا ہو رہا تھا ہسپتال میں ڈاکٹر' نرسیں سب میرے گرد جمع اٹالین میں میری چوٹوں کا احوال پوچھ رہے تھے اور میں انہیں انگریزی میں "میرے کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔" سمجھانے کے جتن کر رہا تھا۔ آخر میں ہم نے اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے کو اپنا مدعا سمجھایا تھا۔"

وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی بہت لطف لینے والی بات بتا رہا ہو۔ جیسے اس کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ کوئی مزا لینے والا واقعہ تھا۔

"اتنی غمگین شکل مت بناؤ لڑکی! میں ٹھیک ہوں۔"

وہ بالکل سنجیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سکندر کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ مذاق ہو سکتا تھا اس کے لیے نہیں۔ نہ جانے اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں۔ نہ جانے زبان کے مسئلے کی وجہ سے وہ ڈاکٹر کو اپنی چوٹوں کے بارے میں ٹھیک سے بتا بھی سکا تھا کہ نہیں۔ وہ یک دم ہی کرسی سے اٹھی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو دوبارہ بلا کر لانا چاہتی تھی ' تاکہ ڈاکٹر اس کے سامنے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کرے۔

"کہاں چلیں؟ بیمار کی عیادت پھولوں کے ساتھ کی جاتی ہے تم میرے لیے پھول بھی نہیں لائیں۔ کہیں پھول لینے ہی تو نہیں جا رہی ہو؟"

اس کا وہ تلخ موڈ' اس کا بیزار' اکتایا ہوا انداز جیسے وہ ساری دنیا سے خفا ہو' یک دم ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ایکسیڈنٹ کی بات کر کے' اپنی چوٹوں کا ذکر کر کے حظ اٹھا رہا تھا' جیسے اسے بڑا مزا آرہا ہو' کیا وہ اپنا ایکسیڈنٹ ہو جانے پر خوش تھا؟

یہ بہت ہی عجیب سا خیال اس کے دل میں ابھرا تھا۔ نہیں' وہ ایک نارمل انسان ہے۔ وہ ایک پریشان ہونے والی' فکر کرنے والی بات پر خوش کیونکر ہو سکتا ہے۔

"ڈاکٹر کو بلانے۔"

"ڈاکٹر کو' مگر کیوں؟" وہ سکندر کی بات کا جواب دینے کے لیے وہاں رکی نہیں اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد ڈاکٹر کے ساتھ وہ دوبارہ وہاں موجود تھی۔ ڈاکٹر اسے مطمئن کرنے کے لیے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کر رہا تھا اگرچہ وہ اسے پہلے ہی یہ بتا چکا تھا کہ اس کے دوست کو فوری' بروقت اور بہترین ٹریٹمنٹ دیا جا چکا ہے۔ سکندر کی چوٹوں کے بارے میں ڈاکٹر سے اس کی تفصیلی بات کوریڈور میں ہو گئی تھی۔

سب سے زیادہ چوٹ سکندر کے پیر میں لگی تھی باقی چوٹیں فکر کرنے والی نہیں تھیں مگر پیر کی چوٹ کے لیے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو جانے کے بعد بھی اگلے ایک سے دو ہفتے بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ڈاکٹر سکندر کا دوبارہ معائنہ کر رہا تھا اور وہ اس سے اردو میں پوچھتی جا رہی تھی۔

"تمہارے اور تو کہیں کوئی چوٹ نہیں لگی ناں؟"

"تمہیں کسی اور جگہ تو درد نہیں ہو رہا ناں؟" وہ اسی طرح مسکراتا ہوا مطمئن سا لیٹا تھا۔ ڈاکٹر معائنہ کر لینے کے بعد اسے اطمینان دلاتا وہاں سے جانے لگا' تب اس نے سکندر کی دواؤں اور احتیاط کے متعلق چند اور سوالات کیے۔

ڈاکٹر اس کے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

"ہو گئی تسلی؟ صحیح کہہ رہا تھا ناں کہ میں ٹھیک ہوں۔"

"تمہارے پیر میں کافی سیریس چوٹ لگی ہے سکندر! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ کافی وقت لگے گا تمہاری چوٹ ٹھیک ہونے میں۔ وہ بھی اگر تم احتیاط رکھو گے ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرو گے تب۔"

وہ اس کے پاس واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جواباً" لاپروائی سے سر ہلا کر مسکرایا تھا۔ اس کا ڈنر لیٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب اس کے لیے ٹرے میں رات کا کھانا لایا گیا تھا۔

"کھانا کھالو سکندر!"

"ہاں' واقعی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے فوراً ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

"ابھی زیادہ ہلو جلو نہیں کہیں پھر بلیڈنگ نہ شروع ہو جائے۔ لیٹے رہو۔"

پھر اس نے پلیٹ ہاتھ میں اٹھائی اور چاول بھر کر چمچ اس کے منہ کی طرف بڑھایا تھا۔ سکندر اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا مگر بولا کچھ نہیں۔

"منہ کھولو' کیا ہو گیا ہے؟"

اس نے قدرے خفگی سے کہا تو اس نے منہ کھولا۔

"فش بھی ہے۔ لو گے؟"

اس نے دوسری پلیٹ میں رکھے مچھلی کے پیس کی طرف اشارہ کیا۔ سکندر نے جواباً" سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ اسے کانٹے سے فش بھی کھلانے لگی تھی۔ وہ خاموش لیٹا نوالے چباتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا تھا سکندر؟" چمچ اس کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پتا نہیں' میں ولابورگیز سے باہر نکل کر سڑک پر تھوڑا ہی آگے گیا ہوں گا تو ایک تیز رفتار گاڑی نے ٹکر مار دی۔ غلطی شاید کچھ گاڑی والے کی تیز رفتاری کی بھی تھی اور کچھ میری لاپروائی کی بھی۔ اب ٹھیک سے یاد بھی نہیں آرہا کہ ہوا کیا تھا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال بھی وہ گاڑی والا ہی لایا تھا۔"

"شکر ہے۔ زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ تمہارے پیر کی چوٹ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے گی ان شاءاللہ۔"

وہ بہت سچائی اور اپنائیت سے بولی تھی۔

جواب میں سکندر کی مسکراتی نظریں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے قدرے برا ماننے والے انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"تمہاری اردو انجوائے کر رہا ہوں۔ تمہارے اٹالین لہجے والی اردو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔" وہ جواباً" کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"میں اردو بس نینی کے ساتھ بولتی ہوں یا اپنے پاپا اور ان کی وائف کے ساتھ یا پھر کبھی کبھار سیم کے ساتھ اور اب تمہارے ساتھ بول رہی ہوں۔ دیکھو! میرے غلط تلفظ اور لفظوں کی ادائیگی پر ہنسو مت۔ میں کم از کم تمہاری زبان جانتی تو ہوں۔ تم تو میری زبان جانتے بھی نہیں ہو۔"

آج شام اسے کیا ہوا تھا' وہ اتنے غصے میں کیوں آگیا تھا' اس نے اتنا جارحانہ ردعمل کیوں ظاہر کیا تھا' وہ خود کو تکلیف اور اذیت میں پڑا دیکھ کر خوش کیوں تھا' شدید خواہش کے باوجود بھی اس نے ان میں سے کوئی بات نہیں پوچھی تھی۔

اسے سکندر سے یہ سوالات کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پھر ناراض ہو جائے گا اور وہ نہ تو اس کا موڈ خراب کرنا چاہتی تھی' نہ ہی اسے ناراض کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سوئٹ ڈش بھی کھلا چکی تھی۔

"تھینکس لیزا! تم مجھے دیکھنے آئیں۔ پتا ہے تمہارے آنے سے میرا موڈ اچھا ہو گیا ہے۔"

"یہ تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ سینور سکندر کو میرا آنا اچھا لگا ہے۔" وہ شرارت بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ سکندر نے اس کی مسکراہٹ کا

ساتھ دیا۔

"کافی منگواؤں تمہارے لیے؟"

"نہیں' اب اور کچھ بھی نہیں لوں گا۔ آرام کرنا چاہتا ہوں اب۔ تم بھی میرا خیال ہے اب اپنے گھر جاؤ۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"فی الحال تو میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ سینور سکندر!" وہ اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جا سکتی تھی۔

کیا وہ تکلیف میں مبتلا اپنے دوست کو تنہا چھوڑ کر گھر چلی جاتی؟ اس کی دیکھ بھال کرنے والا یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے ملک اور اس کی زبان سے انجان تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر گھر چلی جاتی۔ وہ سکندر سے کچھ کہنے کے لیے لب وا کر رہی تھی کہ اسی وقت اس کے موبائل پر نینی کی کال آنے لگی۔

"ہیلو' جی نینی؟" وہ گھر سے نینی کو دروازے سے بس یہ بتاتی نکلی تھی کہ کہیں باہر جا رہی ہے سو اب فکر میں مبتلا ہو کر ان کا فون آنا لازمی تھا۔

"گھر کب آؤ گی لیزا؟"

"نینی! میرا دوست ہے ناں سکندر' اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں اس کے پاس ہاسپٹل میں ہوں۔ صبح آؤں گی گھر' آپ سو جائیں۔"

اس نے سکندر کی اپنی جانب اٹھتی نگاہیں دیکھیں جن سے وہ اسے منع کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں نہ رکے لیزا نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نینی کو جواب دیا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا۔

"لیزا! تم گھر جاؤ پلیز۔ میں ٹھیک ہوں اور ویسے بھی مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ تم میری وجہ سے بے آرام ہو۔" وہ سنجیدگی و بردباری سے بولا۔

"میں آپ کے پاس یہاں رک رہی ہوں سینور سکندر! چاہے آپ کو اچھا لگے چاہے برا۔" وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی تھی۔

"لیزا پلیز۔"

"سکندر پلیز۔" اس نے اسی کے انداز میں دہرایا۔

"گویا تم نہیں مانو گی۔" وہ ہار ماننے والے انداز میں بولا۔

"ہاں میں نہیں مانوں گی۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ' پھر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی مگر اس سے پہلے نہیں۔ مغرور' بدتمیز اور خود پسند سکندر شہریار کو دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے مجھے۔ یہ ہسپتال میں زخمی و بیمار پڑا سکندر شہریار مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔"

"مصورہ! اس جملے میں آپ مجھ سے اپنی دوستی ظاہر کرنا چاہ رہی ہیں یا دوستی کی آڑ میں میری برائیاں گنوانا چاہ رہی ہیں' میں سمجھ نہیں سکا۔" وہ اسے گھور کر دیکھتا ہوا مصنوعی ناراضی سے بولا تھا اور وہ جواباً کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"تمہارا جو دل چاہے' سمجھ لو۔" نرس سکندر کو دوا دینے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے سکندر کو دی جانے والی دوائیوں کے متعلق نرس سے سوالات کیے تھے۔ ان میں چند پین کلرز تھے اور ایک نیند لانے کے لیے دی جانے والی دوا تھی کیونکہ ڈاکٹر کا اندازہ یہی تھا کہ اگلی چند راتیں اور دن سکندر کے بہت تکلیف میں گزرنے تھے اور وہ پرسکون نیند سو سکے اس لیے اسے ادویہ دی جا رہی تھیں۔

نرس دوا دے کر چلی گئی تب اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ بند کر دی۔

"سونے کی کوشش کرو سکندر!"

"میں تو سو جاؤں گا مگر تم کیا ساری رات یہاں اسی طرح بیٹھی رہو گی؟"

سکندر نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تھا۔ پیر پٹیوں میں جکڑے ہونے کے سبب وہ کروٹ لینے سے قاصر تھا۔ شاید ایک ہی طرح لیٹے لیٹے اسے الجھن ہونے لگی تھی۔

"مجھے نیند آئے گی تو صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔ تمہیں کروٹ دلواؤں؟" وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے اسے کروٹ لینے میں مدد دی تھی۔

"تھینکس۔" وہ بہت ہلکی آواز میں بولا تھا۔

"اب تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔" وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

"اوکے' مگر پلیز تم بھی صوفے پر لیٹ جاؤ۔"

سکندر نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ اچھا تھا اسے نیند آ گئی تھی۔ ورنہ اس کی رات بڑی تکلیف میں گزرتی۔ سوتے میں وہ کئی بار تکلیف سے کراہا تھا' کئی بار بے چینی سے اس نے پہلو بدلا تھا' اپنے پیر کو ہلانے کی کوشش یوں کی تھی جیسے شدید درد ہو رہا ہو۔ تکلیف سے ہی اسے بخار چڑھ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اسے کمبل اوڑھا دیا تھا۔

وہ ڈاکٹر کو بلا کر لائی تھی۔ ڈاکٹر کے اطمینان دلانے پر کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں اور یہ کہ بخار کے لیے بھی سکندر کو دوا رات دی جا چکی ہے' وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ یہ ضرور چیک کر رہی تھی کہ بخار تیز تو نہیں ہو گیا۔

* * *

اسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حلق بالکل سوکھ گیا ہو۔ پیاس کے شدید احساس سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک اجنبی کمرے میں خود کو موجود پا کر حیران سا ہوا مگر اگلے ہی پل پیر سے اٹھتی درد کی ٹیسوں نے اسے یاد دلا دیا کہ وہ کہاں پر ہے۔ اس نے پہلے سر سے پاؤں تک خود کو دیکھا۔ وہ جس کروٹ سویا تھا' اس سے اٹھا نہیں تھا' وہ کچھ بھی اوڑھے بغیر سویا تھا' مگر کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ کمرے میں ہنوز اندھیرا تھا مگر کھڑکی سے باہر نظر ڈالنے پر اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک نیا دن طلوع ہوا ہی چاہتا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے ہر طرف نظریں گھما رہا تھا۔ اس نے لیزا کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر اسی طرح بیٹھی تھی' جس طرح رات کو بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کرسی سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اس نے ساری رات اس طرح تکلیف میں گزاری ہے' اسے شرمندگی کا احساس ہوا۔

اس ساری زندگی کبھی کسی کا کوئی احسان نہیں لیا تھا اور اس وقت اس نے اپنے اندر شدید قسم کی بے چینی محسوس کی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر اس کا دھیان رکھتی رہی ہے۔ اسے کروٹ بدلواتی رہی ہے' اسے سردی تو نہیں لگ رہی' وہ بے آرام تو نہیں' اس سب کا خیال رکھتی رہی ہے۔ ایسا کوئی دوستانہ اور غیر معمولی سلوک اس نے لیزا کے ساتھ کبھی روا نہ رکھا تھا کہ بدلے میں اس کے خلوص اور اپنائیت کی توقع رکھتا مگر وہ تو ایسی ہی دوستانہ مزاج اور دوسروں کی پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ یہی جتایا تھا ناں روبرٹو نے اسے لیزا کے بارے میں۔۔۔ مگر وہ اپنا خلوص' اپنی اچھائی بہت ہی غلط جگہ بہت ہی غلط شخص پر ضائع کر رہی تھی۔

اس نے اپنے لیے نفرت سے سوچا۔

اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ لیزا اتنی چوکس نیند سو رہی تھی کہ معمولی سی آواز سے بیدار ہو گئی تھی۔ ایک دم ہی سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا' کچھ چاہیے سکندر؟"

"پانی۔" وہ آہستگی سے بولا۔

لیزا جلدی سے اٹھی' اس نے گلاس میں پانی ڈالا پھر اپنے ہاتھ سے ہی اسے لیٹے لیٹے پانی پلانے لگی۔ وہ اتنا پیاسا تھا کہ پورا گلاس دو گھونٹ میں پی گیا تھا۔

"اور لاؤں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

گلاس واپس رکھ کر وہ پھر اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"شکر ہے ٹمپریچر کم ہو گیا۔" وہ اس کے پاس سے ہٹی تھی۔

"تمہیں ٹھیک سے نیند آئی ناں سکندر؟" وہ سوال پوچھتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا رہی تھی۔

"نیند؟" اس نے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ اتنی بے خبری والی گہری نیند سو گیا؟ اس نے سوتے میں وہ خواب کیوں نہیں دیکھے' وہ روتا اور چیختا ہوا بیدار کیوں نہیں

ہوا؟ لیزا کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا رہی تھی۔

"کھڑکی کھول دوں؟ صبح ہو رہی ہے۔ تازہ ہوا کمرے میں آئے گی، تم اچھا محسوس کرو گے؟"

وہ کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی۔ اس کی سوچوں سے انجان وہ گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہ جاسکا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

لیزا نے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ صبح کی تازہ ہوا کمرے کے اندر آنے لگی تھی۔ باہر ایک نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔

* * *

اس کے لیے ناشتا آگیا تھا۔ اس بار اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے مدد نہیں مانگی تھی۔ وہ خود اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔

"آرام سے، آہستہ آہستہ سکندر! تمہارے زخم ابھی بالکل تازہ ہیں۔"

اس نے سکندر کے شانوں کے گرد اپنے ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ وہ بیٹھا تو لیزا نے اس کی کمر کے پیچھے تکیے لگا دیے تھے۔ اس نے اس کے لیے سلائس پر مکھن لگایا تھا۔

"تم بھی ناشتہ کرو۔" اس کے ہاتھ سے سلائس لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ ناشتہ پیشنٹ کے لیے ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"پیشنٹ چاہتا ہے اس کی تیماردار بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرے اور ویسے بھی پیشنٹ اتنا خوش خوراک نہیں کہ یہ سب کھا جائے۔" وہ اسی کے انداز میں جواباً" مسکرا کر بولا تھا۔ لیزا نے اس کے ساتھ ناشتا شروع کر دیا تھا۔

"تم رات بھر سوئی نہیں ہو ناں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ بالکل روکھا پنیر کھانے لگی۔

"تمہارے سامنے سو تو رہی تھی سینور سکندر! تم آملیٹ تو لو۔" وہ جیسے اپنی اچھائی کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"لیزا! میں تم سے اپنے کل کے رویے کی معذرت کرنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے دس کام چھوڑ کر مجھے ولا بورگیز گھمانے لے کر گئی تھیں۔ مجھے تمہارے ساتھ اس طرح بدتمیزی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ ناشتہ روک کر یکدم ہی اس سے سنجیدگی سے بولا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے اندر کی کڑواہٹیں دوسروں پر نکالتا پھرے اور دوسرے بھی کون...؟ یہ لیزا محمود! جو خلوص اور محبت سے لبالب بھری ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔

اپنے رویے کی بدصورتی پر وہ لیزا سے حقیقتاً" شرمندہ تھا۔ لیزا نے بھی ناشتہ روک دیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے سکندر! میں نے تمہاری کسی بھی بات کا برا نہیں مانا۔ میں بس یہ نہیں سمجھ سکی کہ تمہیں اچانک ہو کیا گیا تھا۔"

"میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا لیزا! پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔" وہ جواباً" بہت آہستگی اور نرمی سے بولا تھا۔

وہ اب کبھی بھی اس سے تلخ لہجے میں کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا احسان مند ہو گیا تھا اس لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ لیزا محمود کے اندر کی اچھائیاں اور محبتیں ختم کرنے کا باعث کم از کم وہ ہرگز نہیں بنے۔ جلد یا بدیر زندگی لیزا محمود کو یہ سمجھا دے گی کہ نہ تو یہ دنیا اتنی اچھی جگہ ہے نہ ہی یہاں بسنے والے لوگ۔ مگر اسے دنیا اور لوگوں سے مایوس کروانے والوں میں وہ کیوں شامل ہو۔ اگر وہ محبتیں بانٹتی ہے تو اس کی خواہش ہوگی کہ وہ لڑکی سدا محبتیں ہی تقسیم کرتی رہے۔ زندگی کا بدصورت چہرہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے۔

لیزا اثبات میں سر ہلا کر مسکرائی تھی۔

"تم نہیں بتانا چاہتے، ٹھیک ہے۔ میں نے بالکل برا نہیں مانا۔ اب تم لیٹ جاؤ، کافی دیر سے بیٹھے ہوئے ہو۔"

وہ اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تو وہ فوراً" بولا۔

"میں خود لیٹ جاؤں گا لیزا! تم بیٹھو۔"

لیزا نے اس کے انکار کی پروا کیے بغیر اسے لیٹنے میں مدد دی۔ اس کے پیر میں شدید تکلیف تھی۔ اٹھ کر بیٹھنے اور پھر واپس لیٹنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ پیر کی تکلیف کے آگے بازوؤں اور سر پر لگی چوٹیں انتہائی معمولی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان تکلیف کی طرف دھیان ہی نہیں جا رہا تھا۔ پیر میں جتنی شدید درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے اندر سکون اور اطمینان اترتا محسوس کر رہا تھا۔ خود کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر اسے ایک ان جانی سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

کل ایکسیڈنٹ کے بعد جب وہ سڑک پر زخمی پڑا تھا، اس کے پیر، بازوؤں اور سر سے خون بہہ رہا تھا، تب بجائے پریشان ہونے کے، تکلیف اور درد محسوس کرنے کے، وہ خوش ہو رہا تھا۔ اپنا خون بہتا دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ ہاں، وہ خون اتنا ہی ارزاں تھا، اسے یوں ہی بہہ جانا چاہیے تھا، اس کا وجود اتنا ہی بے مصرف تھا، اسے اسی طرح کسی اجنبی سرزمین پر غیروں اور اجنبیوں کے بیچ دنیا سے ناتا توڑ جانا چاہیے تھا۔

شعوری طور پر وہ یہ کبھی بھی قبول نہ کرتا کہ یہ ایکسیڈنٹ درحقیقت ہوا کس کی وجہ سے تھا مگر لاشعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ غلطی گاڑی والے کی نہیں، اس کی تھی۔ خود کو انجان اور بے پروا ظاہر کرتا، وہ اس تیز رفتار گاڑی کو آتا دیکھ کر بھی اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہیں دائیں بائیں یا پیچھے نہ ہوا تھا۔ وہ گاڑی اسے ٹکر مارتی ہوئی دو قدم آگے جا کر رکی تھی۔ ڈرائیور نے فوراً" بریک لگائے تھے مگر رکتے رکتے بھی گاڑی اسے ٹکر مار ہی چکی تھی۔

وہ سڑک پر اوندھے منہ پڑا سرشاری سے مسکرایا تھا۔ وہ نہ مدد کے لیے چلایا تھا، نہ درد اور تکلیف سے کسی کو پکارا تھا۔ اس نے گاڑی کے ڈرائیور سے یہ درخواست بھی نہیں کی تھی کہ وہ اسے ہسپتال لے جائے۔ وہ سڑک پر سکون سے پڑا تھا۔ اگر گاڑی کا ڈرائیور اسے اٹھا کر ہسپتال نہ لاتا تو وہ اسی طرح سڑک پر پڑا رہتا تاوقتیکہ کوئی اور اس کی مدد کو نہ آتا، جو کہ وہ چاہتا تھا کبھی بھی نہ آئے۔

بظاہر تو سکندر شہریار ذہنی طور پر ایک نارمل اور صحت مند شخص تھا۔ باشعور، فہم و فراست رکھنے والا مرد۔ وہ خودکشی کی کوشش کیونکر کر سکتا تھا؟ خود اپنے آپ سے بھی وہ یہی کہہ رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ اس کی بے دھیانی اور کار کے ڈرائیور کی تیز رفتاری کے سبب ہوا ہے۔

اس کے اندر خود سے نفرت میں مبتلا شخص اس کے جھوٹ پر ہنس رہا تھا۔

ڈاکٹر اسے دیکھنے کے لیے آیا، ساتھ میل نرس بھی تھا۔ ڈاکٹر اسے سکندر کے بازوؤں اور سر کی بینڈیج تبدیل کرنے سے متعلق ہدایات دے رہا تھا۔ وہ سکندر کے زخمی پیر کو مختلف انداز میں ہلا جلا کر دیکھ رہا تھا۔ پیر کی پٹیاں فی الحال نہیں کھولی جانی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا ڈاکٹر کے پاس کھڑی اٹالین میں جلدی جلدی بولتی اس کی چوٹوں ہی کے متعلق ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ غالباً" اس کی رات کی بے سکونی اور تکلیف ڈاکٹر کو بتا رہی تھی۔

ڈاکٹر اور میل نرس وہاں سے چلے گئے۔ تب اس نے لیزا سے اپنا موبائل اٹھا کر دینے کو کہا۔ آفس ٹائم شروع ہو چکا تھا اسے آفس فون کر کے بتانا تھا کہ وہ آج نہیں آسکتا۔ اسے روما اپنے ہیڈ آفس بھی فون کر کے اپنے ایکسیڈنٹ کی اطلاع دینی تھی۔

وہ ہسپتال میں بیٹھ کر آفس کا کچھ ضروری کام کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اسے آفس سے کچھ معلومات اور چند فائلز درکار تھیں۔ اسے یہ تمام چیزیں ای میل کر دی جائیں، اس کو آفس فون کر کے یہ بھی کہنا تھا۔ یہ

سب سوچتے کے ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ کل ولا بورگیز جاتے وقت اس کے ساتھ اس کا لیپ ٹاپ بیگ اور بریف کیس بھی تھا۔ اس کے یہاں تمام ضروری کاموں کی تفصیلات لیپ ٹاپ میں موجود تھیں۔ اسے اپنا لیپ ٹاپ درکار تھا۔

”لیزا! تمہاری گاڑی میں میرا لیپ ٹاپ بیگ ہوگا پلیز وہ مجھے لادو اور پلیز اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ ساری رات بے آرام رہی ہو' گھر جا کر ریسٹ کرو۔“ وہ نرم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”تم خیریت سے ہو سکندر شہریار؟ کوئی ضرورت نہیں ہے آج آفس کا کوئی بھی کام کرنے کی۔ دو تین دن کام نہ کرنے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ لیپ ٹاپ پر کام کرنے کے لیے بیٹھو گے' بار بار جسم کو ہلاؤ جلاؤ گے' ہاتھوں اور پیروں پر دباؤ پڑے گا۔ سکون سے لیٹو۔ جو ڈاکٹر نے کہا ہے' وہ کرو۔“

لیزا نے باقاعدہ اسے ڈپٹا تھا۔

”بہت ضروری کام ہیں لیزا!“ وہ بے بسی سے بولا تھا مشکل یہ تھی کہ فی الحال وہ خود اٹھ کر جا نہیں سکتا تھا ورنہ خود جا کر لیزا کی گاڑی سے اپنا لیپ ٹاپ لے آتا۔

”ہوں گے ضروری' مگر وہ ضروری کام سکندر شہریار کی صحت اور اس کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔“

وہ بہت محبت اور اپنائیت سے بولی تھی' بہت پروا کرنے والا انداز تھا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں دل میں کہیں بہت زور سے جا کر چبھی تھی اس کی بات۔

”سکندر شہریار کی زندگی۔“ تلخی سے بولتا وہ یکدم ہی چپ ہو گیا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سکندر شہریار کی زندگی سے زیادہ بے مول اور بے وقعت اس دنیا میں کسی کی بھی زندگی نہیں' سات سمندر دور' اس سے بہت دور بسنے والی صرف ایک ہستی ہے' جو اس کی موت پر روئے گی' باقی دنیا میں کسی کو بھی اس کی زندگی یا اس کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اس ہستی کے ساتھ شاید لیزا محمود بھی چند آنسو اس کے لیے بہا لے کہ یہ لڑکی سراپا محبت ہے۔ یہ صرف سکندر شہریار کی نہیں بلکہ ہر کسی ہی کی تکلیف پر رو پڑتی ہو گی۔ لیزا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا' کیا کہتے کہتے رک گئے تم؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے مختصراً بولا تھا۔

”کاموں کے لیے پریشان مت ہو۔ تمہاری چوٹیں ٹھیک ہو جائیں' کام بھی سارے ہو جائیں گے۔“ وہ اس کی طرف جھک کر دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

”میل نرس آتا ہو گا' تم اپنی بینڈیج تبدیل کرواؤ۔ میں گھر جا رہی ہوں' تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔“

اس نے خاموشی سے محض سر اثبات میں ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے آفس فون کر دیا تھا۔ روبرٹو کل رات ہی اپنی فیملی کے ساتھ گھوم پھر کر واپس آیا تھا' اس نے آج سے ہی آفس جوائن کر لیا تھا۔ سکندر کی اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس کے ایکسیڈنٹ کا سن کر فکر مند ہوا تھا۔ تفصیلات پوچھ رہا تھا مگر وہ اپنی چوٹوں سے زیادہ آفس کے کاموں کے لیے فکر مند تھا۔ اس نے روبرٹو سے وہ تمام ڈاکومنٹس ای میل کرنے کو کہا تھا' جو اسے آفس سے دور بیٹھ کر آفس کا کام کرتے ہوئے درکار تھے۔ وہ اسپنج باتھ اور بینڈیج کی تبدیلی والے تمام کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ نیم گرم پانی سے ہاتھ' منہ اور جسم کا اوپری حصہ دھلنے سے وہ خود کو کافی تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا مزید کئی دنوں تک اپنی ان چوٹوں کے ناز اٹھانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

وہ آج ہی ہاسپٹل سے چھٹی لے کر چلا جانا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ کل کا دن اپنے ہوٹل میں گزارے گا پھر پرسوں سے آفس۔۔۔

لیزا دوپہر میں پھر ہسپتال میں موجود تھی۔

”تم سوئیں نہیں گھر جا کر؟“

”سو گئی تھی' دو گھنٹے کی نیند لے لی' کافی ہے۔ تم اپنی سناؤ' تکلیف کچھ کم ہوئی؟“

وہ اس سے کیا کہتا کہ تکلیف جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ اتنا ہی اچھا محسوس کرتا ہے۔ اس نے محض سرہاں میں ہلا دیا تھا۔ لیزا اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”تم نے لنچ کر لیا؟“

”ہاں۔“

”تم میوزک سنو گے؟ میں تمہارے لیے اپنا آئی پوڈ لے آئی۔ میوزک میں تمہاری پسند تو مجھے پتا نہیں اس میں اٹالین گانے بھی ہیں اور انگلش سونگز بھی ہیں۔“

اس نے بیگ سے نکال کر اپنا آئی پوڈ اسے دیا۔ وہ یہ کہہ کر اس کے خلوص کی توہین نہیں کر سکتا تھا کہ اسے میوزک' موویز' کتابیں کسی بھی چیز میں رتی برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو زندہ لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ برسوں ہوئے اس نے خود کو زندہ لوگوں میں شمار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”میں کچھ انگلش میگزینز اور کتابیں بھی لائی ہوں مگر پھر وہی بات کہ تمہاری پسند مجھے پتا نہیں تھی۔ بس جو مجھے پسند ہیں' وہ لے آئی۔“

وہ اس کے لیے یہ سارا اہتمام یوں کر رہی تھی' گویا وہ یہاں کئی دنوں تک پڑا رہنے والا ہے۔ اسے سوچ کر ہنسی آئی۔

”تم مسکرا کیوں رہے ہو؟“ اس نے اس کے لبوں پر آئی مسکراہٹ فوراً دیکھ لی تھی۔

”کچھ نہیں' ویسے ہی۔“

”ویسے یہ موقع اچھا نہیں ہے سینور سکندر! تم زخمی ہو کر بیڈ پر پڑے ہو' تمہارے کہیں پر بھی چلے جانے' بھاگ جانے کا کوئی خطرہ موجود نہیں ہے۔ اس بہترین موقع سے فائدہ اٹھا کر میں تمہاری پینٹنگ کیوں نہ بنا لوں۔ تم چاہے جتنا بھی ناراض ہو گے' منہ پھلاؤ گے مگر اٹھ کر جا تو کہیں نہیں سکو گے۔“

وہ شرارت بھرے انداز میں بولی تھی اور وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”مصورہ! میں نے تمہیں اپنی دوست سمجھا تھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میری دوست میری مجبوری کا فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

اس نے تاسف سے سر ہلا کر جیسے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک اجنبی ملک میں چلنے جلنے' چلنے پھرنے سے قاصر ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا چاہے اسے اپنی صحت اور زندگی کی پروا تھی یا نہیں مگر بہرحال اسے یہاں وقت پر اپنا کام مکمل کر کے وہاں اپنے ہیڈ آفس رپورٹ کرنی تھی۔ یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی اور وہ۔۔۔

وہ لیزا کے ساتھ بڑے ہلکے موڈ میں ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ باتیں کرنے' اس کے ساتھ وقت گزارنے کو انجوائے کر رہا تھا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً یہ کمال اس لڑکی کا تھا ورنہ ایک عمر گزری' وہ تو ہنسنے والی باتوں پر بھی ہنسنا بھول بیٹھا تھا۔

”نہیں سینور سکندر! میں آپ کی مجبوری کا فائدہ ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پینٹنگ اس وقت بناؤں گی جب آپ خود مجھے اپنی خوشی سے یہ اجازت دیں گے۔“

وہ مسکراتے ہوئے جواباً بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

لیزا سے باتیں کرتے کرتے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی' اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ دو' تین گھنٹے سوتا رہا تھا' بغیر کسی دوا کے؟ نہیں' شاید دوپہر کو نرس نے جو پین کلرز دیے تھے۔ ان میں سکون اور نیند لانے والی بھی کوئی دوا شامل رہی ہو گی۔ اس نے فوراً خود سے کہا تھا۔

چلو نیند دوا کے ساتھ آئی تھی مگر اس کے وہ خواب؟

اس نے فوراً ہی اپنے اندر سے ابھرتے اس سوال کو ذہن سے جھٹکا۔

”اٹھ گئے تم۔“ وہ اس کے پاس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ لائی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

”ہاں کافی دیر سو گیا میں۔“

”اچھا ہے ناں۔ جتنا آرام کرو گے' خود کو ریلیکس

رکھو گے اتنی ہی جلدی ٹھیک ہو پاؤ گے۔" وہ مسکرا کر پرخلوص انداز میں بولی تھی۔

"تمہارے لیے اسنیکس اور کافی آئی تھی' تم سو رہے تھے تو میں نے واپس لوٹا دیا۔ اب بول کر آتی ہوں۔ ویسے تم کافی کی جگہ چائے تو نہیں لینا چاہتے؟ اصل میں یہاں کافی کا استعمال زیادہ ہے۔ لوگ چائے کچھ خاص پسند نہیں کرتے۔"

وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"کافی ہی ٹھیک ہے' بلکہ تم اپنے لیے بھی لے کر آنا۔" وہ بغیر تکلف کے بولا تھا۔ لیزا سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔

وہ مشرومز اور پنیر والا سینڈوچ کھا رہا تھا' لیزا کو کیز کھا رہی تھی۔ کھانے کے لیے اٹھ کر بیٹھنے میں اس نے لیزا کی مدد لینے سے منع کرنا چاہا تھا مگر اس نے پھر بھی اسے مدد دی تھی۔

"لیزا! ابھی ڈاکٹر آئے گا ناں تو تم اس سے کہنا' مجھے ہسپتال سے چھٹی چاہیے۔"

ڈاکٹر تک اپنا مدعا پہنچانے کے لیے اسے لیزا کی ضرورت تھی۔ وہ آج ہی ہاسپٹل سے چلا جانا چاہتا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ یکدم ہی یوں اچھلی تھی گویا کوئی بہت ہی عجیب بات سن لی ہو۔

"کل شام تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ابھی تمہاری چوٹیں بالکل تازہ ہیں اور تم ہسپتال سے ڈسچارج ہونا چاہتے ہو' خیریت ہے ناں؟" وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولی تھی۔

"لیزا! بیڈ پر لیٹ کر آرام ہی کرنا ہے ناں وہ میں اپنے ہوٹل میں کر لوں گا۔ یہاں ہسپتال میں اس طرح پڑ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں بالکل ہی معذور ہو گیا ہوں۔ تم اسے کچھ بھی کہو مگر ہسپتال کا روایتی ماحول مجھ پر نفسیاتی طور پر اتنا منفی اثر ڈال رہا ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو ٹھیک ہونے میں بہت ٹائم لوں گا۔"

لیزا جواباً اس بات کی مخالفت میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر روبرٹو اندر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔

"Buona Sera۔" اس نے اٹالین میں شام اور رات کا سلام ان دونوں کو مشترکہ طور پر کیا تھا۔

"یہ کیا کر لیا تم نے میرے پیچھے ہیں؟" وہ اس سے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ وہ جواباً مسکرایا تھا۔

"بیٹھو روبرٹو!" لیزا نے اپنی کرسی روبرٹو کے لیے خالی کر دی تھی۔ روبرٹو نے مسکرا کر لیزا کو دیکھا تھا۔

"تم ہو سکندر کے پاس' چلو یہ اچھا ہے۔ صبح جب سکندر نے مجھے اپنے ایکسیڈنٹ کا بتایا میں یہی سوچے جا رہا تھا کہ اٹالین نہ آنے کی وجہ سے اسے یہاں مشکل ہو رہی ہو گی۔"

"دوستی کی ہے سینور سکندر سے تو اپنے دوست کا خیال تو رکھوں گی ناں روبرٹو!"

وہ سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے روبرٹو اور لیزا انگریزی ہی میں باتیں کر رہے تھے۔ روبرٹو اس بات پر ذرا سا بھی حیران نہیں تھا کہ لیزا اس کے پاس ہسپتال میں کیوں ہے؟ ہاں' وہ یونہی تو ہر کسی کے ساتھ نیکیاں اور اچھائیاں کیا کرتی تھی۔ روبرٹو نے اسے لیزا کے بارے میں یہی تو بتایا تھا ناں؟ جب روبرٹو اسپین میں تھا تو لیزا اس کی بیوی کو ہسپتال لے کر گئی تھی' اس کے پاس وہاں رہی تھی۔ یہ اچھائیاں' یہ غیر معمولی سلوک و توجہ خصوصیت کے ساتھ اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ یہ اس لڑکی کے مزاج کا حصہ تھا' یہ اس لڑکی کے واقف ہر شخص کے لیے تھا۔

پھر آخر روبرٹو حیران ہوتا بھی کیوں؟ وہ اس کی بچپن کی دوست تھی' جانتا تھا وہ اپنی دوست کے مزاج کو۔

"ہاں! یہ بات تو ہے۔ تم سے اچھی دوستی نبھانے والا کون ہو سکتا ہے لیزا؟" روبرٹو نے مسکرا کر لیزا کی بات کا جواب دیا تھا۔ "میں نے سارے ڈاکیومنٹس تمہیں ای میل کر دیے تھے' مل گئے ناں تمہیں؟"

"کہاں دیکھ پایا ہوں میں۔ میرا لیپ ٹاپ لیزا کی گاڑی میں پڑا ہے یہ مجھے لا کر نہیں دے رہی۔ اور اپنے موبائل پر میں نے اٹیچ منٹ کھولنے کی کوشش کی تو ساری اٹیچ منٹ کھل نہیں سکیں۔"

وہ روبرٹو کی بات کے جواب میں قدرے فکر مندی سے بولا تھا۔ اسے دفتر کے کاموں کی فکر تھی۔

"ہاں تو بالکل ٹھیک کر رہی ہوں میں۔ بائی دا وے تمہارا لیپ ٹاپ اور بریف کیس اب میری گاڑی میں نہیں بلکہ میں نے اپنے گھر لے جا کر حفاظت سے رکھ دیا ہے۔ باتیں سنو ذرا ان محترم کی روبرٹو! مجھ سے فرما رہے ہیں میں ڈاکٹر سے کہہ کر انہیں ہسپتال سے ڈسچارج کروا دوں۔ ذرا اس کی چوٹیں دیکھو اور پھر یہ بات سنو۔"

اس نے پہلے اسے اور پھر روبرٹو کو ایک ہی وقت میں مخاطب کیا تھا۔

"مجھے ہاسپٹلز کا ماحول سوٹ نہیں کرتا۔ طبیعت الجھتی ہے روبرٹو! ریسٹ کرنا ہے' باقاعدگی سے بینڈیج چینج کرواتے رہنا ہے تو یہ سب تو میں ہوٹل جا کر بھی باآسانی کر سکتا ہوں۔ میرا یقین کریں آپ لوگ میں یہاں رہ کر اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہو سکوں گا جتنا جلدی یہاں سے جا کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

اس کے لیے روبرٹو اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ہسپتال سے چھٹی کروانے کی وجوہات سے آگاہ کرتا۔ اس نے روبرٹو سمیت اپنے کسی بھی جاننے والے' ملنے والے کو یہ حق نہیں دے رکھا تھا کہ وہ اس کی ذاتیات میں دخل دے مگر یہاں مسئلہ لیزا محمود کا تھا۔ وہ اسے ٹوک نہیں سکتا تھا اور نہ ہی خفا ہو کر اسے اس موضوع پر بولنے سے روک سکتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہاں روبرٹو موجود تھا بلکہ اس لیے کہ اب وہ لیزا کے ساتھ تلخ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"اگر یہ بات ہے' تم نے یہاں سے جانا ہی ہے تو پھر تم میرے گھر چلو گے۔ ہوٹل تو میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔"

لیزا اس کی بات کے جواب میں فوراً" دھونس بھرے انداز میں بولی تھی۔ اس کا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا تھا۔ وہ یہ کیا نیا قصہ نکال بیٹھی تھی۔ اب یہ ایک نئی مصیبت تھی۔

"یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے لیزا!" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔

"کیا مناسب نہیں ہے؟" لیزا نے اسے غصے سے دیکھا تھا۔

"لیزا ٹھیک کہہ رہی ہے سکندر! اگر تمہیں لگتا ہے کہ ہسپتال کا ماحول تمہیں سوٹ نہیں کر رہا تو پھر تمہیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں تمہاری دیکھ بھال ہو سکے۔ لیزا اگر تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہے تو یہ تو بہت اچھا ہے۔ وہاں اس کی ممی ہیں وہ تمہارا خیال رکھ لیں گی' تم سہولت سے رہ لو گے۔"

روبرٹو نے اپنی رائے پیش کی تھی۔ وہ ہسپتال سے جانے کی بات بول کر پچھتا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے اتنا زیر بار آ چکا تھا' مزید کوئی بھی احسان لینے کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"مجھے اصل میں عادت نہیں ہے اس طرح کسی کے بھی گھر پر رہنے کی۔ میں ایزی فیل نہیں کروں گا۔" اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے اس نے لیزا کو انکار کیا۔

وہ اپنی عادت کے مطابق صاف' دو ٹوک اور بے مروتی بھرا انکار اسے کر نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر اسے اب لیزا سے بات کرتے ہوئے یہ فکر رہتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اس کا دل دکھے۔

"تم وہاں اچھا محسوس کرو گے' یہ میری گارنٹی ہے سکندر! اور اگر تمہیں اچھا نہ لگا تو تم مجھے صاف صاف بتا دینا۔ میں خود تمہیں اسی وقت تمہارے ہوٹل چھوڑ آؤں گی' یہ میرا وعدہ ہے۔"

وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ کے پاس آ گئی تھی۔ اور دوستانہ لہجے اور اپنائیت بھرے انداز میں بولی تھی۔

"مان جاؤ سینور سکندر! تمہاری دوست لیزا محمود کا گھر کم از کم تمہارے ہوٹل سے تو زیادہ آرام دہ ہے۔"

وہ بے بس سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی اپنائیت' خلوص اور محبتوں کو پانے کا ذرا سا بھی حقدار نہیں تھا مگر وہ اس لڑکی کو انکار کیسے کرے؟ اپنائیت بھرا اصرار کر رہی تھی۔ وہ دوستانہ انداز میں

حق جتا رہی تھی اور اس اپنائیت اور دوستانہ حق سے انکار کرنے کے لیے اسے لازما" بے مروتی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرنا پڑتا جو وہ اس کے ساتھ کر نہیں پا رہا تھا۔

وہ لیزا محمود کے گھر ہرگز نہیں جانا چاہتا تھا مگر اخلاقی دباؤ میں یوں آگیا تھا کہ اسے اس کے گھر جانا ہی پڑ رہا تھا۔

روبرٹو آدھا پون گھنٹہ بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا۔ لیزا نے اس سے اس کی چھٹی کی بات کی تھی۔ کافی مشکلوں سے ڈاکٹر نے اسے ڈسچارج کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وہ بھی یہ کہہ کر مریض اپنی ذمہ داری پر جلدی ڈسچارج ہو رہا ہے۔ اس نے سکندر کو کل آکر دکھانے کی تاکید کی تھی۔

* * *

"آرام سے، آہستہ آہستہ اترو۔" وہ اس کے اپارٹمنٹ آگیا تھا۔ لیزا نے گاڑی بیس منٹ میں لے جاکر روکی تھی، اب وہ اسے ہاتھ پکڑ کر باہر نکلنے میں مدد دے رہی تھی۔ اسے اپنے دائیں پاؤں پر بالکل بھی زور نہیں ڈالنا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات پر وہ راستے سے آئرن کرچز خرید کر لائے تھے۔ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ کم از کم بھی وہ اگلا ایک ہفتہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے اور اگر چلنا ناگزیر ہو ہی جائے تو پھر بیساکھی کے سہارے اپنے دائیں پیر پر بالکل بھی وزن ڈالے بغیر چلے۔

وہ بیساکھی کے سہارے اپنا سارا وزن بیساکھی اور بائیں پاؤں پر ڈالے دائیں پاؤں کو محض گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ لیزا اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"تمہیں درد تو نہیں ہو رہا ناں سکندر!" "تم سے چلا جا رہا ہے ناں؟"

مین دروازے سے اندر داخل ہوتے، لفٹ میں جاتے، باہر نکلتے، اس کے اپارٹمنٹ تک آتے آتے وہ یہ سوال نجانے کتنی بار دہرا چکی تھی۔ اسے ہنسی آگئی تھی۔

"ہنسو مت، مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ ضدی اتنے ہو کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر ہی دم لیا ہے۔ جبکہ ابھی دو تین دن تمہیں ہسپتال میں رہنا چاہیے تھا۔" وہ اس کے ہنسنے پر چڑ کر ناراضی سے بولی تھی۔ لیزا کے بیل بجانے پر اپارٹمنٹ کا دروازہ ایک بڑی عمر کی خاتون نے کھولا تھا۔ وہ چونکہ غائبانہ تعارف حاصل کر چکا تھا، چنانچہ جانتا تھا، یہ لیزا کی نینی ہیں۔ بچپن میں اس کی آیا تھیں اور اب روم میں لیزا کے فلیٹ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے شلوار قمیض اور دوپٹہ پہن رکھا تھا، بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ چہرے پر نرمی اور محبت بھرا تاثر تھا۔

"السلام علیکم۔" ساری زندگی کبھی اس طرح کسی کے گھر منہ اٹھا کر نہیں گیا تھا۔ بہت عجیب محسوس کر رہا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! آؤ اندر آؤ۔" انہوں نے پرشفقت انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ ان کی اردو میں گفتگو سنتے ہی اسے لیزا کی گالیاں یاد آئیں۔ اپنی نینی ہی سے فرمائش کرکے اس نے اردو میں گالیاں سیکھی تھیں ناں۔ اسے لیزا کی وہ خطرناک اردو یاد کرکے دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔

"نینی! آپ نے اور میں نے مل کر سکندر کی بہت کیئر کرنی ہے۔ بیمار ہے! ڈاکٹر ابھی اسے ڈسچارج نہیں کر رہا تھا۔ یہ ضد کرکے ہسپتال سے چھٹی لے کر آیا ہے۔"

وہ لیزا اور اس کی نینی کے ساتھ چلتا ایک کمرے میں آگیا تھا۔ لیزا کا اپارٹمنٹ خوب صورت تھا۔ آرٹسٹک لک دے رہا تھا۔ لگ رہا تھا، یہ لیزا کا اس کے عزیز از جان روما میں اپنا فلیٹ ہے جسے اس نے بڑی محبت سے سجا اور سنوار رکھا ہے۔

"بیٹا! تم بالکل تکلف مت کرنا۔ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو بے جھجک مجھ سے کہہ دینا۔"

وہ بیساکھی کو ٹائلز پر مضبوطی سے جما کر اس پر اپنا وزن ڈال کر بیڈ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، تب نینی اس سے بولی تھیں۔ اسے بیٹھنے میں کچھ وقت کا سامنا تھا اس لیے اس نے محض سر اثبات میں ہلا دیا۔ لیزا جو اس کے بالکل پاس کھڑی تھی اس نے اسے فورا" ہی بیٹھنے میں مدد دی تھی۔

"چائے، کافی کچھ لاؤں تم لوگوں کے لیے؟" نینی نے لیزا کو اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نینی! کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ ایسا کریں، ڈنر ہی کا انتظام کرلیں۔" لیزا اس کی بیساکھی بیڈ کی سائڈ ٹیبل کے ساتھ ٹکا کر رکھ رہی تھی۔

"کھانا تو میں پہلے ہی تیار کر چکی ہوں۔"

وہ بیڈ کے اوپر اپنا دایاں پاؤں خود ہی اٹھا کر رکھ رہا تھا مگر لیزا نے جلدی سے پٹیوں میں جکڑے اس کے پاؤں کو بڑی آہستگی سے ایسے کہ اسے ذرا بھی تکلیف نہ ہو، اٹھا کر بیڈ پر رکھا۔ ساتھ وہ نینی کو جواب بھی دے رہی تھی۔

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا نینی! بس پھر اب تھوڑی دیر میں آپ میرا اور سکندر کا کھانا یہیں لے آئیے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!" نینی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیزا نے اس کی کمر کے پیچھے تکیے لگا دیے تھے۔

"تکلیف تو نہیں ہو رہی پاؤں میں؟ اتنا چلے ہو۔"

وہ بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

"لیزا! میں تمہارے اصرار پر آ تو گیا ہوں مگر مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اس طرح تمہیں اور تمہاری نینی کو اپنی وجہ سے پریشان کرنا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ پاؤں میں درد والے سوال کا نفی میں جواب دینے کے بعد۔

"مجھے اور نینی کو کوئی تکلیف نہیں ہو رہی سکندر! دوست آخر ہوتے کس لیے ہیں؟ کیا صرف ہنسی مذاق کرنے اور اچھے وقت پر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے؟ تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، تم تکلیف میں ہو اور اٹلی تمہارا ملک بھی نہیں ہے۔ تم نہ یہاں کی زبان جانتے ہو، نہ راستوں سے واقف ہو۔ اس پریشانی میں بحیثیت دوست میں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں کہ تمہارے ساتھ رہوں۔"

وہ بھی جوابا" سنجیدگی سے بولی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ لیزا کچھ بھی کہتی، بہرحال اسے اس طرح یہاں آکر خاصی شرمندگی ہو رہی تھی، چاہے وہ اسے بضد ہو کر، اصرار کرکے اس کی مرضی کے خلاف دھونس اور حق جتا کر لائی تھی تب بھی۔

"یہ تمہارا کمرا ہے؟" اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ آج رات کی بات ہے۔ وہ کل یہاں سے چلا جائے گا۔

"ہاں!" وہ جوابا" مسکرائی تھی۔ اس نے ایک پیار بھری نگاہ اپنے کمرے میں ڈالی تھی۔ اس کی نگاہ سامنے دیوار پر لگی ایک تصویر پر گئی تھی۔ لیزا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

"یہ میری اور میری بہن سیم کی تصویر ہے۔"

تصویر میں لیزا اور اس کی بہن پانچ چھ سال کی بچیاں تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال رکھی تھیں۔ دونوں بے تحاشا ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش لگ رہی تھیں۔

"رائٹ سائڈ والی تم ہو، ہے ناں؟" اس نے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس، بالوں کی دو پونیاں بنائے خوب صورت اور خوب صحت مند سی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں! میں ہوں۔ بہت موٹی تھی میں بچپن میں۔" وہ تصویر کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنسی تھی۔

"یہ سیم کی برتھ ڈے پارٹی والے دن کی تصویر ہے۔"

"سیم تمہاری بہن کا نک نیم ہے؟" اسے ایسا لگا تھا جیسے لیزا کو اپنی بہن کی باتیں کرنا اچھا لگ رہا ہے اس لیے اس نے اخلاقا" اس حوالے سے گفتگو بڑھائی۔

"ہاں، اس کا پورا نام سمانتا ہے۔ ہم لوگ پیار سے اسے سیم بلاتے ہیں۔" لیزا کے چہرے پر اس کی بہن کی محبت کے رنگ بکھرے تھے۔

"تمہاری بہن بھی اٹلی میں رہتی ہے؟"

"نہیں، اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ پاکستان میں رہتی ہے۔" وہ اس بار کچھ دکھ بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ شاید وہ اپنی بہن کو بہت مس کرتی تھی۔ وہ لیزا کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"مجھ میں اور سیم میں بہت پیار ہے سکندر! ہم دونوں صرف بہنیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کی بیسٹ فرینڈز بھی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب میں اور سیم ایک دوسرے سے بات نہ کریں۔"

لیزا کی بات اس کے دل کو بڑی تیز جا کر چبھی تھی۔ وہ پچھلی زندگی کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر پھر بھی لیزا کا اس کی بہن کے لیے پیار دیکھ کر اسے بھی کوئی یاد آ گیا تھا۔

"جو بات بہن بھائیوں کی ہوتی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہوتی ناں! سکندر مجھے لگتا ہے آپ کے بھائی یا بہن آپ کے جتنے اچھے دوست بن سکتے ہیں، اتنا اچھا دوست اور کوئی نہیں بن سکتا۔ ان کے سامنے آپ خود کو عیاں کرنے سے جھجکتے بھی نہیں ہیں۔ بھائی، بہن کا پیار قدرت نے بڑا انمول بنایا ہے۔" وہ اپنی دھن میں، بڑے جذب سے بول رہی تھی۔

"بھائی!" اس پر ایک وحشت سی طاری ہوئی تھی۔

"لیزا! میں کچھ دیر آرام کرلوں؟" اپنے اندر کی وحشت سے گھبرا کر اس نے لیزا سے کہا۔ وہ اس کی بدلتی کیفیتوں سے انجان مسکرا کر بولی۔

"ہاں تم کچھ دیر ریسٹ کرلو۔ پھر ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔"

لیزا اس سے مسکرا کر بولتی کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ وحشتوں میں گھرا کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔

* * *

اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی جب امو جان نے اسے فون پر یہ خبر سنائی تھی کہ اس کے پاپا کو اس کا خود اپنے لیے کوئی لڑکی پسند کرلینا برا نہیں لگا ہے۔

"تمہارے پاپا سے میں نے بات کی ہے زین! وہ ام مریم کی فیملی سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر ام مریم اور اس کی فیملی انہیں پسند آ گئی تو انہیں اس کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تھینک یو امو جان تھینک یو سو مچ۔ آپ نے مجھے بہت بڑی خوش خبری دی ہے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پاپا کو یہ نہ لگے کہ میں اپنی منگنی وغیرہ کی بات جلدی کر رہا ہوں۔ آئی مین ابھی تو میری انڈر گریجویٹ اسٹڈیز بھی مکمل نہیں ہوئیں۔" خوشی کا بے پایاں احساس تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"میں بھی اسی حوالے سے تھوڑی فکر مند تھی زین! مگر تمہارے پاپا نے اس بات کو اتنے مثبت انداز میں لیا۔ بولے "ہمارے بچے امریکہ میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے ہیں۔ یہاں تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے لڑکیاں بوائے فرینڈ گرل فرینڈ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا بیٹا تو پھر بیس سال کا ہونے والا ہے اور ایک لڑکی پسند کرنے اور اس سے شادی کا سوچنے کے لیے درست راستہ اپنا رہا ہے تو ہم اس کے لیے رکاوٹ کیوں بنیں؟""

زندگی میں پہلی بار اس کے باپ نے اس کے لیے وہ سوچا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اس کی آرزوؤں اور خوابوں کو روند ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اسے اس پل بے اختیار اپنے باپ پر پیار آیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اس کے دل کو، اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی، پہلی مرتبہ اس کے دل کی خوشی کا انہوں نے خیال کر لیا تھا۔

وہ بے پناہ خوش تھا۔ اس کا سب سے بڑا خوف کہ پاپا اس بات پر کیا رد عمل ظاہر کریں گے، دور ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی ام مریم سے بھی اس خوشی کو شیئر کیا تھا۔

"سچ زین..... تم نے اپنے پیرنٹس سے بات بھی کر لی؟" ام مریم نے خوشی کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

کتنی اہم تھی یہ لڑکی اس کے لیے۔ کتنا اہم تھا اس کا ساتھ اس کے لیے۔ امو جان سے ام مریم کے متعلق بات کرنے کے بعد اس نے ام مریم کو اس بابت کچھ نہ بتایا تھا۔ اندر ہی اندر ایک خوف تھا، نجانے پاپا کیا کہیں، کس طرح کا رد عمل ظاہر کریں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا؟ وہ ام مریم کو کسی بھی طرح کا کوئی دکھ دینے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شہریار خان کا رد عمل مخالفت میں ہوتا، تب وہ کیا کرتا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا اور اب جب سب کچھ بالکل ٹھیک ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا، تب اسے ایسا کچھ سوچنے کی ضرورت بھی کہاں رہی تھی۔ زندگی پہلی بار اس کے ساتھ سب کچھ ویسا کر رہی تھی جیسا وہ چاہتا تھا۔ اسے پہلی بار زندگی پر پیار آ رہا تھا۔

"میرے پاپا اور امو جان تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتے ہیں مریم!" وہ اس کے حسین چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیتا ہوا بولا تھا۔

"ٹھیک ہے زین! میں نے ابھی تک اپنے گھر میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ میں اپنے پاپا سے بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔"

"وہ مان جائیں گے ناں مریم؟" اسے ایک نیا خوف لاحق ہوا تھا۔

"میں نے اپنے لیے اتنا ہینڈسم، ذہین اور چارمنگ لڑکا ڈھونڈا ہے۔ وہ کیوں نہیں مانیں گے زین؟" مریم اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جواباً ہنس پڑا تھا۔

"میں ایسا کچھ خاص ہینڈسم ہوں نہ ذہین۔ تمہیں لگتا ہوں۔"

"تم جو ہو، مجھے ویسے ہی لگتے ہو زین! میں سب سے پہلی تمہاری طرف اٹریکٹ ہی اس لیے ہوئی تھی کیونکہ تم مجھے بہت ہینڈسم اور چارمنگ لگے تھے۔"

وہ مسکراتا ہوا خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ تعریف کرتی تھی تو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی تعریفیں سن سن کر اب کبھی کبھی اسے خود ہی شک سا ہونے لگتا کہ شاید اب تک کی زندگی میں سکندر کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کرنے کی دھن میں وہ خود کو انڈر اسٹیمیٹ (under estimate) کرتا رہا تھا ورنہ اتنا عام سا بھی نہیں تھا وہ۔

* * *

ام مریم کے پاپا اپنے آفیشل کام سے امریکہ آنے والے تھے۔ کام چاہے انہیں نیویارک میں تھا مگر ظاہر ہے انہوں نے اپنی بیٹی سے ملنے تو لاس اینجلس آنا ہی تھا۔ کچھ دنوں بعد ام مریم نے اسے یہ اطلاع دی تھی۔ وہ فون پر اپنے پاپا کو اس کے متعلق پہلے ہی بتا چکی ہے۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا اور یہ بھی کہ اس کے پاپا ایک روشن خیال آدمی ہیں۔ وہ بیٹی کی شادی اس کی پسند کی جگہ پر ہی کرنا چاہیں گے۔ ابھی اس کے پاپا کے آنے میں کافی دن باقی تھے اور وہ ابھی سے ہی پرجوش سا تھا۔ کچھ خوف، کچھ اندیشے بھی تھے دل میں اور بہت سی امیدیں، آرزوئیں اور خواب بھی دل میں آ بسے تھے۔ وہ دن گن گن کر انتظار کر رہا تھا۔

جیسے ہی ام مریم نے اپنے پاپا کے امریکہ آنے کی تاریخ کنفرم کی، اس نے جھٹ گھر فون کر کے امو جان کو یہ بات بتائی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! وہ یہاں پہنچ جائیں، پھر میں اور تمہارے پاپا ان سے اور ام مریم سے ملنے لاس اینجلس آ جائیں گے۔"

اس کی امو جان محبت سے گندھے لہجے میں بولی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ام مریم ان کے بیٹے کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے، اس کی زندگی کا پہلا خواب ہے۔

ام مریم اپنے چچا کے گھر رہتی تھی۔ اس کے پاپا کو بھی آ کر وہیں ٹھہرنا تھا اور وہیں ان دونوں فیملیز کی ملاقات ہونی تھی۔ شہریار خان اور اس کی امو جان لاس اینجلس آ گئے تھے۔ وہ ان دونوں کو ام مریم کے گھر لے آیا تھا۔

وہ بے حد نروس تھا۔ اگرچہ دل میں یہ یقین راسخ تھا کہ ام مریم اس کے مغرور اور خود پسند پاپا کو بہت پسند آئے گی کہ وہ ان کے اعلیٰ ترین معیار کے عین مطابق تھی۔ مگر اس کی فیملی، اس کے پاپا؟ وہ دعا کر رہا تھا کہ ام مریم کے پاپا اور اس کی فیملی شہریار خان کے معیار پر

پوری اتر جائے۔

وہ پیسے کو اہمیت دیتے تھے مگر ساتھ ہی وہ اعلا حسب نسب کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس کے لیے بے معنی تھیں، سو اس نے ان سب کے بارے میں جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ام مریم کے آباؤ اجداد انڈیا میں کہاں سے تھے اور اس کے دادا، پردادا کیا کیا کرتے تھے اس میں اسے دلچسپی نہ ہو، مگر اس کے پاپا کو ہوتی تھی۔

اور زندگی اس پر واقعی مہربان ہو چلی تھی۔ ام مریم کے پاپا، اس کا اعلا حسب نسب سب کچھ شہریار خان کے اعلیٰ معیار کے مطابق تھا۔ وہ بڑوں کے بیچ میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ باتوں باتوں میں شہریار خان نے ام مریم کے والد کا پورا شجرہ نسب معلوم کر ڈالا تھا اور اب وہ بڑے مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے اپنے ہم پلہ خاندان کی لڑکی کو چنا ہے۔ اس نے باپ کی نگاہوں میں پسندیدگی بھانپ لی تھی۔ اس کی امو جان مسکرا زیادہ رہی تھیں بول کم رہی تھیں۔ جہاں شہریار خان بول رہے ہوتے تھے، وہاں وہ خاموش ہی رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں شہریار خان سے اجازت لی تھی پھر اس کے بعد ام مریم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ام مریم ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ اس کے والدین سے ملنے کے لیے اس نے شلوار قمیص اور دوپٹے پر مشتمل خوب صورت لباس زیب تن کیا تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کا اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنی امو جان اور شہریار خان کے چہروں پر پسندیدگی محسوس کی۔

یہاں آجاؤ بیٹا!" امو جان نے پر شفقت انداز میں اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تھا۔ وہ اس کی امو جان کے برابر میں اور اس کے پاپا کے عین مقابل بیٹھی تھی۔

"کیا پڑھ رہی ہیں بیٹا آپ؟" شہریار خان نے قدرے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

ام مریم کے بولنے کا وہی انداز تھا جس سے وہ دلوں کو مسحور کر لیا کرتی تھی۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں، اس کے گفتگو کے انداز میں شہزادیوں جیسی آن بان اور نزاکت تھی۔ وہ مقابل کو اپنی شخصیت کے سحر میں لمحوں میں گرفتار کر لینے والی اہلیت کی مالک تھی۔ اسے ام مریم پر فخر کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے شہریار خان اس سے گفتگو کرتے جا رہے تھے، ویسے ویسے ان کے چہرے پر ام مریم کے لیے پسندیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے شوق، مشاغل، مستقبل کے ارادے، شہریار خان ان سب کے متعلق اس سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ لبوں پر دھیمی سی مسکان لیے انہیں حیران کر رہی تھی۔

اتنی سی عمر میں وہ جو جو کچھ پڑھ چکی تھی اور جو جو اس نے حاصل کر لیا تھا، اس سے شہریار خان واضح طور پر متاثر نظر آ رہے تھے۔ جیسے وہ ام مریم کے سحر میں گرفتار ہوا تھا ایسے ہی وہ اپنے باپ کو بھی اس کے سحر میں مبتلا پا رہا تھا۔ اس کے خوابوں کی اس شہزادی نے اس کے باپ کا بھی دل موہ لیا تھا۔

شہریار خان کو ام مریم بطور اپنی ہونے والی بہو کے دل و جان سے پسند آ گئی تھی۔ وہ آج صرف ام مریم کے والد سے ملاقات کرنے آئے تھے، باقاعدہ رشتہ مانگنے کا کوئی ارادہ آج کے لیے نہیں تھا، مگر ام مریم انہیں اتنی پسند آ گئی تھی کہ وہ اس روز ہی باقاعدہ رشتہ مانگے بغیر رہ نہیں سکے تھے۔

ان کے رشتہ مانگنے پر وہ بھی حیران تھا، ام مریم بھی حیران تھی اور اس کی امو جان بھی۔ گو وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی امو جان کو بھی ام مریم بہت اچھی لگی ہے۔ "آناً فاناً" سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ کیا کسی کو اس کی محبت اتنی آسانی سے بھی مل سکتی ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ دونوں طرف کی فیملیز نے اس کے اور ام مریم کے رشتے کو قبول کر لیا تھا۔

شہریار خان کی خواہش تھی کہ ان دونوں کی باقاعدہ منگنی کر دی جائے۔ زندگی سے اس کے سارے گلے شکوے لمحہ بھر میں دور ہو گئے تھے۔ مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایک روز بعد ویک اینڈ تھا اور وہی دن منگنی کے لیے طے کر لیا گیا تھا۔ سادگی سے تقریب منعقد کی جانی تھی۔ ام مریم کے چچا ہی کے گھر پر۔

اگلے روز اس کی امو جان منگنی کی انگوٹھی خرید لائی تھیں اور ساتھ ہی کسی پاکستانی یا انڈین بوتیک سے ام مریم کے لیے منگنی کا جوڑا بھی۔ وہ اور شہریار خان اس کے اپارٹمنٹ ہی پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ منگنی کے بعد اسی رات ان دونوں کی واشنگٹن روانگی تھی اور اس سے اگلی صبح ام مریم کے پاپا کی امریکہ سے واپسی تھی۔

اس نے سکندر کو اپنی منگنی کی اطلاع دینی ضروری نہ سمجھی تھی مگر شہریار خان اور اس کی امو جان نے اسے فون کر دیا تھا۔ ان دونوں نے اس سے منگنی پر آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا خوشی خوشی امو جان کا ام مریم کے لیے لایا منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی دیکھ رہا تھا۔ شہریار خان کو سکندر کو فون ملاتا دیکھ کر اس کے منہ کا مزا خراب ہو گیا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی کے موقع پر سکندر کی بالکل بھی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ اپنی خوشی میں اس کی موجودگی اور اس کی شمولیت ہی نہیں چاہتا تھا۔

"اوہ! تمہارا پیپر ہے۔ ہاں میں بالکل بھول گیا تھا کل تو تمہارا پیپر ہو گا۔"

اس نے شہریار خان کو فون پر بولتے سنا۔ سکندر کے ایگزامز چل رہے تھے، اس کا آنا مشکل تھا۔ اس نے طمانیت محسوس کی تھی۔

"ڈیٹ آگے بڑھا لیں؟ مشکل لگ رہا ہے سکندر! اچھا میں پوچھتا ہوں۔"

شہریار خان نے فون پر گفتگو ختم کی تو امو جان نے ان سے پوچھا تھا۔

"کیا کہہ رہا ہے سکندر؟"

"کہہ رہا ہے منگنی دو، تین دن آگے بڑھا لیں۔ کل تو اس کا پیپر ہے اور پرسوں بھی کوئی Presentation وغیرہ ہے۔"

"سکندر کے بغیر تو بالکل مزا نہیں آئے گا۔" امو جان سنجیدگی سے بولی تھیں۔

وہ جلدی سے سر نفی میں ہلا کر بولا تھا۔

"لیکن مریم کے پاپا کی پرسوں صبح کی فلائٹ ہے۔ مریم مجھے بتا رہی تھی اس کی دادی کافی بیمار ہیں اور اس کے پاپا کو فوراً" ان کے پاس جانا ہے۔"

مریم نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی دادی بے شک بیمار تھیں مگر ایسا کچھ نہیں ہو گیا تھا کہ پرسوں صبح اگر اس کے پاپا روانہ نہ ہوتے تو کوئی قیامت آ جاتی۔ اگر وہ مریم سے کہتا تو اس کے پاپا کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا وہ تین چار دن بعد کی اپنی سیٹ بک کروا لیتے مگر جب وہ ایسا چاہتا ہی نہیں تھا تو کہتا کیوں؟ امو جان چاہتی تھیں کہ ان کے گھر کی پہلی خوشی میں ان کے سارے گھر والے موجود ہوں۔ وہ دو ہی تو بھائی ہیں۔ ایک بھائی کی خوشی ہو اور دوسرا بھائی موجود نہ ہو، ایسا کس طرح ہو سکتا تھا؟

شہریار خان تو ظاہر ہے اپنے ولی عہد کی موجودگی صرف اسی تقریب میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر محفل میں چاہتے تھے۔ اس کے ماں، باپ سکندر کی کمی محسوس کر رہے تھے، مگر اسے اپنے بھائی کی کمی قطعاً" محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کے نہ آنے پر زیادہ خوش تھا۔ اگر سکندر آ جاتا تو اس کی خوشی بدمزا سی ہو جاتی۔

سکندر نے اسے کچھ ہی دیر بعد فون کیا تھا۔ وہ خوش بھی ہو رہا تھا، اسے مبارک باد بھی دے رہا تھا اور اس سے یہ اصرار بھی کر رہا تھا کہ وہ منگنی کی تقریب دو، تین روز آگے بڑھا لے تاکہ وہ بھی اس میں شریک ہو سکے۔ وہ صاف لفظوں میں اس سے یہ نہ کہہ سکا تھا کہ اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی میں اسے اس کی موجودگی قطعاً" درکار نہیں ہے۔ اس نے غیر جذباتی اور سپاٹ سے لہجے میں ام مریم کے والد کے امریکہ میں مزید نہ رک سکنے ہی کا جواز پیش کر دیا تھا۔

"پھر بھی یار کوشش تو کرو۔ کیا پتا وہ اپنی سیٹ آگے کروا لیں۔ آخر کو ان کے ہونے والے داماد کے اکلوتے بھائی کی منگنی میں شرکت کا سوال ہے۔ کیا پتا وہ زین شہریار کے بھائی کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اپنی سیٹ

آگے کروا ہی لیں۔"

وہ شوخ و شریر لہجے میں بولا تھا۔

"بہت مشکل ہے سکندر! انہیں فوری واپس جانا ہے۔ منگنی کا دن آگے نہیں کیا جا سکتا۔" وہ بے مروت اور خشک سے لہجے میں بولا۔

"اچھا۔" اس کے سپاٹ اور دو ٹوک انکار نے سکندر کو مایوس کیا تھا۔ اسے اس کے آہستہ آواز میں بولے "اچھا" سے اندازہ ہو گیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے زین! میں موجود نہیں بھی ہوا تب بھی میری دعائیں تو تمہارے ساتھ ہی ہیں۔ میری ہونے والی بھابھی کو میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق ہے اور بہت جلد میں ان سے ملوں گا بھی۔"

سکندر پُر جوش سا ہو کر یوں بول رہا تھا جیسے اس کی منگنی پر بہت خوش ہو۔ اسے سکندر کی خوشی مصنوعی اور بناوٹی لگ رہی تھی۔ زندگی میں ہمیشہ ہر چیز اس نے پہلے حاصل کی تھی اور زین نے بعد میں۔ یہاں وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اس سے پیچھے رہ جانے پر خوش کیونکر ہو سکتا تھا؟ ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی اور اس کے بھائی کی منگنی ہونے جا رہی تھی وہ بھی اتنی حسین اور بے مثال لڑکی کے ساتھ۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ سکندر دل سے اس کے لیے خوش ہوتا۔

✱ ✱ ✱

اس کی منگنی کا دن اس کے اور ام مریم دونوں کے لیے بے حد یادگار دن تھا۔ ام مریم اس کی امو جان کا لایا جوڑا پہنے، مشرقی انداز کی دلہن کا روپ اپنائے بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ خود کو زمین پر نہیں، کہیں آسمانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ام مریم کو اپنے ہاتھوں سے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس کے پاپا اور امو جان نے اسے ڈائمنڈ کا بیش قیمت سیٹ تحفے میں دیا تھا۔ اس کے اپنے باپ سے سارے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ آج کے بعد اسے زندگی سے بھی کوئی شکایت باقی نہ رہی تھی۔

اس کے پاپا اور امو جان پروگرام کے مطابق منگنی کے بعد اسی رات واشنگٹن واپس روانہ ہو گئے تھے اور اگلی صبح ام مریم کے پاپا بھی واپس چلے گئے تھے۔

وہی زندگی تھی۔ وہی کیمپس کی بھاگ دوڑ، وہی پڑھائی کی مصروفیت مگر پھر بھی اب سب کچھ بدلا بدلا لگتا تھا۔ وہ اور ام مریم اب پہلے سے بھی زیادہ وقت ساتھ گزارا کرتے تھے۔ اب ان کے رشتے کو ایک نام مل چکا تھا، بزرگوں کی رضامندی مل چکی تھی۔ اب کہیں کوئی خوف، کوئی اندیشے نہ تھے۔

✱ ✱ ✱

کرسمس کی چھٹیاں آنے والی تھیں۔ چھٹیوں کے لیے کچھ خاص پلان نہیں کیا تھا اس نے۔ اس روز امو جان کا اس کے پاس فون آیا تھا۔

"تمہارے پاپا کا پیغام ہے تمہارے اور مریم کے لیے۔" سلام دعا کے بعد انہوں نے کھنکتے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

"کیا امو جان؟" اس نے محسوس کیا تھا ام مریم جیسی بے مثال اور شاندار لڑکی کا انتخاب کرنے کے بعد سے وہ باپ کی نگاہوں میں تھوڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ساری زندگی اسے نظرانداز کرتے رہنے کے بعد انہیں اب کہیں جا کر یہ یقین آیا ہے کہ وہ انہیں کا بیٹا ہے۔ انہی کی طرح اعلا معیار رکھنے والا، انہی کی طرح بہتر نہیں بلکہ بہترین کا انتخاب کرنے والا۔

"انہوں نے مجھ سے کہا ہے ہمیں کرسمس کی چھٹیوں میں ام مریم کو گھر انوائٹ کروں تاکہ وہ یہاں آ کر ہمارے رہن سہن اور طور طریقوں کے بارے میں تھوڑا بہت جان سکے۔ تم چھٹیوں میں اسے لے کر گھر آجاؤ بیٹا!"

"واقعی پاپا نے ایسا کہا ہے امو جان؟" اسے حیرت سی حیرت تھی۔ اس کے مغرور پاپا اور کسی کو اس طرح انوائٹ کریں؟

"ہاں زین! ان کی خواہش ہے، یہ چھٹیاں تم اور مریم ہمارے ساتھ گزارو۔"

"ٹھیک ہے امو جان! ہم دونوں ضرور آئیں گے۔"

اس نے ام مریم سے پوچھے بنا ہی ہامی بھرلی تھی۔ اس کی محبت پر ایسا بھروسا اور ایسا یقین تھا، پتا تھا وہ اس کی کسی بھی خواہش کو کبھی رد نہیں کرے گی اور یہاں تو جانا بھی اسے اپنی ہونے والی سسرال میں تھا۔ اپنی سسرال تو وہ بصد شوق جانا چاہے گی۔

اور اس کا یہ یقین سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ ام مریم نے اس کی بات سنتے ہی بڑی خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ہاں! میں چلوں گی۔ انکل نے اتنے پیار سے بلایا ہے، میں کیوں نہیں جاؤں گی؟"

وہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ اس کے گھر جانے کے لیے بڑی پُر جوش تھی۔

جیسے ہی چھٹیاں شروع ہوئیں اس نے اسی روز ام مریم کو ساتھ لے کر واشنگٹن کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہ ام مریم کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے، وہ بے حد خوش تھا۔ ام مریم بھی اپنی سسرال جانے پر بہت خوش تھی۔ اس کے ساس سسر نے اسے دل و جان سے انوائٹ کیا تھا، وہ خوش کیوں نہ ہوتی؟

مگر بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا، اس بار اپنے گھر جانے پر اس کی زندگی میں کیا قیامت آجانے والی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیوں کی عمر بے حد مختصر تھی۔ وہ واشنگٹن اپنے گھر خوشیاں منانے نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنی خوشیوں کو ختم ہوتا، بکھرتا اور فنا ہو جاتا دیکھنے کے لیے جا رہا تھا۔

✱ ✱ ✱

لیزا کی نینی نے ان دونوں کا کھانا انہیں کمرے ہی میں دے دیا تھا۔

"اور کچھ تو نہیں چاہیے بیٹا؟" انہوں نے لیزا سے پوچھا تھا جو اس کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھی تھی۔ کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔

"نہیں نینی! بس اب آپ آرام کیجیے۔ کھانے کے بعد اگر ہمارا کافی کا موڈ بنا تو وہ میں خود بنالوں گی۔"

لیزا ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ نینی کمرے سے چلی گئی تھیں۔ لیزا اس کے لیے پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی۔

"نینی نے پاکستانی کھانے بنائے ہیں تمہارے لیے۔"

وہ اس کے لیے پلیٹ میں یخنی پلاؤ ڈالتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جواباً بالکل چپ رہا تھا۔ اس کی سوچوں پر ابھی بھی ایک وحشت سی طاری تھی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیزا کا اپنی پروا کرنا، خیال رکھنے والا انداز بھی اس وقت اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"بس، اور مت ڈالو۔" سنجیدگی سے بولتے ہوئے اس نے اسے اپنی پلیٹ میں مزید کوئی بھی چیز ڈالنے سے روک دیا تھا۔

وہ خاموشی سے پلاؤ کھانے لگا تھا۔ کسی بھی طرح کا ذائقہ اور خوشبو محسوس کیے اس نے تین چار منٹ میں اپنی پلیٹ ختم کر دی تھی۔ وہ خالی پلیٹ واپس ٹرے میں رکھ رہا تھا جبکہ لیزا نے تو ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"بس میں کھا چکا۔"

"اور یہ جو اتنی ساری پاکستانی ڈشز نینی نے بنائی ہیں یہ کون کھائے گا؟" وہ کچھ خفگی اور کچھ اصرار سے بولی تھی۔

"تھوڑا سا تو اور لو ناں؟"

اس نے بغور لیزا کی طرف دیکھا۔ "تم اپنے سب جاننے والوں کی بہت پروا کرتی ہو، ان کا بہت خیال رکھتی ہو، ان کے ساتھ بڑی نیکیاں کرتی ہو، یہ تم پہلے ہی مجھ پر ثابت کر چکی ہو لیزا! مزید کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بری طرح چڑ کر بولا تھا۔ لیزا کے ساتھ کبھی تلخ نہیں ہو گا، کبھی کوئی دل دکھانے والی بات نہیں کرے گا، وہ لمحہ بھر میں خود سے کیے سارے عہد و پیمان بھول گیا تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ نیکیاں کرتی ہے تو کرے مگر اس پر بلاوجہ کیوں اپنے احسان رکھ رہی ہے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو سکندر؟"

"تم روبرٹو کی بیوی کا اس کی غیر موجودگی میں دھیان رکھتی ہو' اپنی بچپن کی آیا کو عزت اور احترام سے اپنے گھر کی بزرگ کا درجہ دے کر رکھتی ہو۔ بہت اچھی بات ہے لیزا! الله تم ہر ایک کے لیے محبت اور خلوص دل میں رکھتی ہو۔ تمہارے دل میں سب کے لیے ہمدردی ہے' ترس ہے' مگر مجھے تمہاری ہمدردی اور تمہارے ترس کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ساتھ کی جانے والی تمہاری نیکیاں مجھے احسان لگ رہی ہیں۔ مجھے تمہاری نیکیوں اور اچھائیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیزا!"

اس بار وہ چڑ کر تو نہیں بولا تھا مگر سرد اور سپاٹ' بے مروت سے انداز میں ضرور بولا تھا۔ لیزا چند لمحے بغور اسے دیکھتی رہی تھی۔

"تم اور کچھ بھی نہیں لینا چاہتے؟ سوئٹ ڈش بھی نہیں؟"

ایک پل کے بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھی تھی تو یہ بات پوچھی تھی..... وہ اپنی دل دکھانے والی بات کے جواب میں اس کا کوئی سخت رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اتنے سکون سے بات بدلتے دیکھ کر اس کا موڈ شدید خراب ہوا تھا۔

"میں اب سونا چاہتا ہوں۔"

لیزا نے کھانے کے چند ہی لقمے لیے تھے۔ اس نے اپنا کھانا اسی طرح ادھورا چھوڑ کر کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھالی تھی۔

"ٹھیک ہے تم سو جاؤ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کال یا میسج کر کے بلا لینا۔ میں جاگی ہوئی ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے بولتی' کمرے کی لائٹ آف کرتی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

لیزا کے ساتھ اس انداز میں' اتنی بدتمیزی سے بات کرنے کے بعد وہ مزید بے سکون ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں جہاں کہیں پر بھی جو کچھ تھا' جو کچھ ہو چکا تھا اس میں لیزا کا کیا قصور تھا جو وہ اس کے ساتھ اس لہجے میں بات کر گیا تھا۔ وہ اس کا احسان نہیں لینا چاہتا' تو ٹھیک ہے' نہ لے مگر اس کے لیے بدتمیزی اور بے رخی کی تو کوئی ضرورت نہیں۔ وہ چپ چاپ گم صم سا بیڈ پر اسی طرح بیٹھا تھا اس نے لیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے خود پر بہت غصہ آرہا تھا۔

لیزا جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر گئی تھی۔ وہ اس کمرے کے در و دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر لیزا کا میک اپ کا سامان' ہیر برش' پرفیومز وغیرہ رکھے تھے۔ خوب صورت وارڈ روب میں یقیناً اس کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہوں گے۔ وہ اسی کے گھر میں' اسی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اسے اپنی بدتمیزی پر کچھ اور بھی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کل صبح ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ کمرے کا دروازہ بجا تھا۔

قدرے حیران سے ہوتے اس نے "جی آجائیں" بولا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ لیزا کی نینی ہوں گی' اس کی بدتمیزی کے بعد اتنی جلدی لیزا کے دوبارہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

وہ لیزا تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اس پر وہ مخصوص مسکراہٹ نہیں تھی جو ہمہ وقت اس کے لبوں کا احاطہ کیے رکھتی تھی۔ سنجیدگی کے ساتھ ناراضی سے' بغیر مسکراہٹ کے ساتھ ہی سہی پر وہ آئی تو تھی اس کے پاس۔ ابھی جبکہ وہ تین گھنٹے قبل ہی وہ اس کے ساتھ خاصی بدتہذیبی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

"تم نے دوا لے لی؟" اس کے قریب آکر اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

دوا کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس نے گم صم سے انداز میں سر نفی میں ہلا دیا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہے اس کے چہرے سے ظاہر تھا مگر ناراضی میں بھی وہ اس کی فکر کرنا نہیں بھولی تھی۔ لیزا نے سوئچ بورڈ کی طرف جا کر کمرے کی لائٹ جلائی تھی۔

"جب دوسروں کے احسان لینے کا شوق نہیں ہے تو تو اپنا خیال رکھنا چاہیے ناں؟"

ناراضی سے بولتے ہوئے اس نے گلاس میں پانی ڈالا تھا۔ اب وہ ٹیبلٹ اور کیپسول نکال رہی تھی۔ لیزا نے دوا اس کے ہاتھ پر دھری۔ اس نے بغیر کچھ کہے وہ پانی سے نگل لی۔

"تم نے مرہم لگایا؟" وہ بغور اس کے بازوؤں کے زخم دیکھ رہی تھی۔ آج ہسپتال سے ڈسچارج ہونے سے قبل ڈاکٹر نے اس کے بازوؤں پر سے بینڈیج اتار دی تھی۔ اسے زخم پر لگانے کے لیے مرہم دیا تھا۔

اس کے ایک بازو پر کہنی سے لے کر کلائی تک ذرا زیادہ گہرا زخم تھا جبکہ دوسرے پر معمولی نوعیت کی چوٹ تھی۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ لیزا بیڈ کے ساتھ رکھی اس کرسی پر فوراً" بیٹھ گئی تھی جس پر بیٹھ کر کچھ دیر قبل وہ اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

اس نے بغیر کچھ کہے مرہم کی ٹیوب ہاتھ میں اٹھائی تھی۔ وہ اس کا بازو ہاتھ میں لے کر اس کے زخم پر بہت آہستگی اور نرمی سے مرہم لگا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی' اس کے چہرے پر سنجیدگی اور ناراضی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم ابھی تک جاگی ہوئی تھیں؟"

لیزا نے صرف سر ہاں میں ہلایا تھا۔

"کچھ پینٹ کر رہی تھیں؟" اس نے پھر سر ہاں میں ہلا دیا تھا۔

"کیا؟"

"ایک لینڈ اسکیپ۔" وہ اس کے سوالوں کے مختصر ترین اور ٹو دی پوائنٹ جواب دے رہی تھی۔ وہ ایک بازو پر مرہم لگا چکی تو اس نے خود ہی اپنا دوسرا بازو بھی اس کے آگے کر دیا۔

"تمہارا یہاں کوئی باقاعدہ اسٹوڈیو ہے؟ میں نے سنا ہے آرٹسٹ لوگ اپنے گھروں میں اپنا ایک پراپر قسم کا اسٹوڈیو ضرور رکھتے ہیں۔"

اس کے طویل سوال کے جواب میں لیزا نے محض سر ہاں میں ہلایا تھا۔ وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں سوالات کر رہا تھا' وہ سنجیدگی سے سر ہاں یا نہ میں ہلا کر یا پھر یک لفظی جملہ بول کر اسے جواب دے رہی تھی۔

"کہاں ہے تمہارا اسٹوڈیو؟"

"اوپر۔"

"مجھے دکھاؤ گی؟"

"دیکھ لینا۔"

"کب؟"

"جب تمہارا دل چاہے۔" وہ ایک کے بعد ایک سوال کر رہا تھا اور وہ بغیر اس کی طرف دیکھے' سپاٹ سے انداز میں جواب دیے جا رہی تھی۔ گویا وہ اس سے بہت سنجیدگی سے ناراض تھی۔

"اور تم مجھے پینٹ کب کرو گی؟" اس لڑکی کے چہرے پر اس کی زندگی سے بھرپور وہ مسکراہٹ دیکھنے کی ایسی شدید خواہش ابھری تھی اس کے دل میں کہ بے اختیار وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا لاتعلقی' بے نیازی اور ناراضی کا تاثر لمحہ بھر میں لیزا کے چہرے سے غائب ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے تو اس نے اسے حیران ہو کر دیکھا تھا' وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف نرمی سے دیکھ رہا تھا۔

"سکندر..... کیا واقعی؟ کیا تم سچ میں......"

اس کی وہ مخصوص مسکراہٹ اس کے لبوں پر واپس آچکی تھی۔ وہ خوشی اور حیرانی سے تصدیق چاہنے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"کیا میرے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لیے تم ایسا کر رہے ہو؟"

وہ یک دم ہی دل گرفتہ سی ہوئی تھی۔ اس نے یہ الفاظ یوں ادا کیے تھے گویا اسے سکندر کے ان لفظوں سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔

"تمہارے خلوص اور تمہاری اپنائیت کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا لیزا! اور چکانا چاہتا بھی نہیں ہوں۔"

وہ بہت سچائی سے بول رہا تھا۔ وہ اپنے دلی جذبات اور سوچیں کچھ بھی چھپانے کی کوشش کیے بغیر اس وقت اس سے بات کر رہا تھا۔

"پھر؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میری آرٹسٹ دوست لیزا محمود کی اگر یہ خواہش ہے کہ وہ میرا چہرہ پینٹ کرے تو میں چاہتا ہوں روما سے واپس جانے سے قبل اس کی یہ خواہش ضرور پوری کر کے جاؤں۔"

وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا تھا۔ وہ اس کے دوسرے ہاتھ پر بھی مرہم لگا چکی تھی۔ وہ بے حد خوش نظر آرہی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ! مجھے بالکل بھی یقین نہیں آرہا سکندر! تم جیسا سڑیل مجھے اپنا چہرہ پینٹ کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔ میرے خدایا! کہیں یہ خواب تو نہیں۔"

"لیزا محمود! میرے بارے میں اپنے یہ غیر پارلیمانی الفاظ آپ واپس لیجیے۔" وہ اس کی سی ٹون میں شگفتگی سے بولا۔

"سڑیل کو سڑیل ہی کہوں گی ناں..... سڑیل، بدتمیز، بد اخلاق، بے مروت سکندر شہریار صاحب نے مجھے اپنی پینٹنگ بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ خدایا اگر یہ خواب ہے تو میں اس سے جاگوں نہ۔"

وہ اپنے لیے اتنے شاندار القاب سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ لیزا بھی ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی دیکھ کر اسے سکون کا احساس ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ ناراض تھی، ہنس نہیں رہی تھی تب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

رات کافی ہو رہی تھی۔ وہ اسے سونے کا کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر جانے لگی تھی۔ اس نے لائٹ دوبارہ آف کر دی تھی۔

"میں جاگی ہوئی ہوں سکندر! اسٹوڈیو میں کام کر رہی ہوں، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھے بلا لینا۔"

وہ وہاں سے جانے کے لیے پلٹی تھی۔ مگر پلٹتے پلٹتے جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

"تم مجھے اپنی دوست سمجھتے ہو سکندر! میں اپنے دوست سکندر شہریار کا خیال رکھ رہی ہوں، اس کی پروا کر رہی ہوں خلوص اور اپنائیت کے ساتھ۔ پھر سے احسان اور نیکی کے لفظ میرے لیے مت بولنا سکندر! دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ بہت سنجیدگی اور آہستگی سے بولی تھی۔ وہ جواباً چپ رہا تھا۔ لیزا کمرے سے چلی گئی تھی۔

* * *

صبح ہو گئی تھی۔ اسے دوا لے کر بھی رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ اسے رات بھر پیر میں کافی تکلیف بھی رہی تھی۔ وہ درد کو نظر انداز کرتا رہا تھا۔ ساری رات جاگ کر صبح ہونے کا انتظار کیا تھا۔ اسے ہسپتال میں اسی سکون آور دوا کے ساتھ رات میں اور پھر دوپہر میں بھی اتنی گہری نیند کس طرح آگئی تھی کل نیند آئی تھی تو آج بھی آنی چاہیے تھی۔

وہ بیساکھی کے سہارے اٹھ کر باتھ روم گیا تھا۔ بیساکھی کے سہارے کھڑے ہونے اور منہ ہاتھ دھونے میں قدرے وقت کا سامنا تھا مگر اپنی چوٹوں، تکلیفوں اور زخموں کی اس نے پہلے پروا کب کی تھی جو اب کرتا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو لیزا کمرے میں کھڑی تھی۔

"گڈ مارننگ!" وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ "ویری سوری! میں بغیر اجازت اندر آگئی۔ دراصل میں کافی دیر سے دروازہ ناک کر رہی تھی، تم نے کوئی جواب نہیں دیا تو مجھے فکر ہوئی۔"

"تم سوئی نہیں؟" وہ بیساکھی کے سہارے واپس بیڈ کی طرف جانے لگا۔ لیزا جلدی سے اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تھی۔ وہ کل کے مقابلے میں تیز تیز قدم اٹھا کر بیڈ تک اس کی مدد کے بغیر ہی پہنچ گیا تھا۔ لیزا نے اسے بیڈ پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ اسے مدد کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ منع کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں سیدھی پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔

"تھوڑی دیر سو گئی تھی۔ میرا سونا جاگنا تو بس ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ناشتہ کر کے پھر سے سو جاتی ہوں، کبھی کبھی دن میں لیٹ جاتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"نینی سے میں بول کر آئی ہوں۔ وہ ناشتہ بنا رہی ہیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے لوز سی ٹی شرٹ جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ بالوں کو کیچر میں لپیٹا ہوا تھا۔ وہ دھلے ہوئے منہ کے ساتھ بھی اتنی ہی پیاری لگ رہی تھی جتنی میک اپ کے ساتھ لگا کرتی تھی۔

"رات بھر میں تمہارا ارادہ بدلا تو نہیں ناں؟" وہ کس حوالے سے یہ سوال پوچھ رہی تھی وہ جانتا تھا۔

"نہیں۔" وہ جواباً مسکرایا تھا۔ "تم سے پینٹنگ بنوائے بغیر میں روما سے واپس نہیں جاؤں گا۔ بس یہ جو ایکسیڈنٹ کی وجہ سے تھوڑا میرا آفس کے کاموں کا حرج ہوا ہے، مجھے وہ کام نمٹا لینے دو، پھر ایک دن پورا تمہارے نام ہوگا۔ تم تسلی سے اپنی پینٹنگ بنانا۔"

وہ زندگی کے چند مختصر سے دن یہاں گزار کر واپس چلا جائے گا۔ ایک بار یہاں سے گیا تو زندگی میں اس لڑکی سے دوبارہ کبھی ملے گا بھی نہیں۔ وہ ملنا چاہے گا ہی نہیں۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ زندگی کے یہ چند دن اس لڑکی کے خلوص اور دوستی کا جواب خلوص اور دوستی ہی سے دے۔

کچھ دنوں کے لیے ملی اس پیاری لڑکی کا ساتھ پردیس میں اسے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ وہ ان دنوں ہنس بھی رہا ہے، باتیں بھی کر رہا ہے، کسی کسی پل خود کو زندہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے، وہ بھی بغیر کسی احساس جرم کے۔ اس نے لیزا کے حسین چہرے کی طرف بغور دیکھا تھا۔ یہ لڑکی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی، اسی لیے نہ تو یہ اسے ملامتی نگاہوں سے دیکھتی ہے، نہ دل میں یہ سوچتی ہے کہ سکندر شہریار بڑا ڈھیٹ اور بے غیرت آدمی ہے۔ اسے کوئی حق نہیں ہے زندگی کے ایک بھی لمحے کو انجوائے کرنے کا، مسکرانے کا، خوش ہونے کا۔

یہ زندگی سے بھرپور لڑکی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اور اسے اس کا اپنے بارے میں کچھ

بھی نہ جاننا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ پردیسیوں سے ملنے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے' آپ ان سے جو آپ نہیں ہیں' وہ بن کر مل سکتے ہیں۔ جو کچھ آپ اپنے بارے میں چھپا لینا چاہتے ہیں' با آسانی چھپا لیتے ہیں۔

اس نے سوچ لیا تھا وہ لیزا ہی کے مشورے پر عمل کرتا روما میں اپنے باقی دنوں کو رومن ہالی ڈیز ـــــ کی طرح یہ یاد رکھے بغیر گزارے گا کہ وہ سکندر شہریار زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح جینے کا کوئی حق نہیں رکھتا کہ وہ تو کب کا مر چکا ہے' سنگسار کیا جا چکا ہے' تختہ دار پر چڑھایا جا چکا ہے۔

* * *

ناشتے کے بعد وہ بیڈ پر ہی اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ درد اور تکلیف کو خاطر میں لائے بغیر آفس کا کام کر رہا تھا۔ لیزا نے کہا تھا انہیں شام چار بجے ہسپتال جانا تھا۔ وہاں ڈاکٹر کے تفصیلی معائنہ اور پیر کی بینڈیج وغیرہ کی تبدیلی میں نجانے کتنا وقت لگنا تھا' اسی لیے وہ چاہتا تھا آج آفس ٹائم ختم ہونے سے قبل جو زیادہ اہم اور فوری کیے جانے والے کام ہیں' وہ نمٹا کر ڈاکیومنٹس آفس ای میل کر دے۔ لیزا ناشتے کے بعد اسے دوا اور اس کا لیپ ٹاپ دے کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ اسے وقتاً" فوقتاً" باہر سے لیزا اور اس کی نینی کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"لیزا لنچ میں کیا بناؤں؟" اس نے نینی کی آواز سنی۔ جواب میں لیزا کی آواز آئی تھی۔

"میں سکندر سے پوچھ لیتی ہوں نینی!" فوراً" ہی کمرے کا دروازہ ہلکے سے تھپتھپا کر لیزا اندر آئی تھی۔

"جو ڈش تمہیں پسند ہے' وہی بنوا لو۔ میں بھی وہی کھاؤں گا۔"

وہ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولا تھا۔ وہ جواباً" مسکرائی تھی۔

"کان بڑے تیز ہیں تمہارے۔" وہ اندر آ کر اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"کچھ خاص ڈش کھانے کا دل چاہ رہا ہے تو بتا دو۔ نینی کھانے بہت مزے کے بناتی ہیں چاہے وہ پاکستانی ہوں' چاہے اٹالین یا چائنیز۔"

ابھی وہ جواباً" کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ موبائل اٹھانے کے لیے اسے اپنی جگہ سے تھوڑا ہلنا پڑتا' لیزا نے فوراً" ہی اسے موبائل اٹھا کر دے دیا تھا۔ موبائل پر چمکتے نام کو دیکھ کر اس نے لیزا کی طرف دیکھا تھا۔ وہ یہ کال لیزا کے سامنے ریسیو نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ ڈاکٹر آمنہ شہریار خان کی کال تھی' اس کی امو جان۔ ماں سے بات کرتے ہوئے جس طرح کے جذبات اس کے چہرے پر آ جاتے تھے' وہ انہیں لیزا کے سامنے عیاں کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا' مگر لیزا جیسے اس کے بغیر کہے ہی یہ بات سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کال کو ریسیو کرنے کے لیے تنہائی چاہتا ہے سو فوراً" ہی کرسی پر سے اٹھ گئی۔

"تم کال ریسیو کرو۔ میں نینی کو کھانے کا کہہ آؤں۔"

لیزا کمرے سے چلی گئی تھی۔ اس نے فوراً" ہی کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم امو جان!" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا' مگر اس سنجیدگی میں بھی اس میں بہت سے جذبات شامل تھے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو سکندر؟" ہمیشہ کی طرح ان کا لہجہ نرم اور مہربان تھا۔ وہ بیٹے کی جدائی سے ہلکان ہیں' یہ تاثر لیا غم میں ڈوبا انداز تھا ان کا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور کرب ابھر آیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں امو جان!" اپنے ایکسیڈنٹ کے متعلق انہیں کچھ بھی بتائے بغیر اس نے آہستگی سے اپنی خیریت سے متعلق اطمینان دلایا تھا۔

"ابھی روم ہی میں ہو؟"

"جی امو جان!" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"آفس کے کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ گھوم پھر بھی رہے ہو کہ نہیں؟ ہر طرف تمہاری فیورٹ

ہسٹری بکھری ہو گی روم میں۔" وہ شگفتگی سے بولی تھیں۔ وہ جواباً" اداسی سے مسکرایا تھا۔

وہ انہیں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہسٹری' آرٹ' لٹریچر اب اسے کوئی چیز مسحور نہیں کرتی۔ جس سکندر کو وہ جانتی تھیں' وہ اب وہ سکندر نہیں ہے۔

"جی! کافی گھوم پھر رہا ہوں۔" وہ لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہوا بولا تھا۔

"پتا ہے سکندر! شادی کے دو ماہ بعد میں اور تمہارے پاپا اٹلی' اسپین اور فرانس گھومنے گئے تھے۔ ہم روم ہی میں تھے جب مجھے یہ خوش خبری ملی تھی کہ میں ماں بننے والی ہوں' تم میری زندگی میں آنے والے ہو۔"

کیا اس کا اپنے ماں' باپ کی زندگی میں آنا خوش خبری تھا؟ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

"شاید اسی لیے روما مجھے اتنا فیسی نیٹ کرتا ہے امو جان!"

اپنے دل میں بکھرتے درد کو نظر انداز کر کے وہ مسکرا کر بولا تھا۔ آمنہ دھیمے سُروں میں ہنسی تھیں۔ اسے بہت سی چیزوں اور بہت سی باتوں کے لیے قصوروار ماننے کے باوجود ان کی ممتا نے اس سے محبت کرنا کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے دل کے زخم جیسے پھر سے تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اپنے وجود کو شعلوں کی لپیٹ میں پا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کانٹوں پر گھسیٹا جا رہا ہے۔

"چھٹیاں ملیں تو گھر آؤ ناں بیٹا!" ایک دکھ بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری' جیسے خود پر بھی نہیں بلکہ اپنی ماں کی بے بسی پر اسے ترس آیا ہو۔

"جی امو جان! موقع ملا تو آؤں گا۔" وہ سچ بول کر ماں کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ وہ بھی جانتی ہیں کہ وہ وہاں کبھی بھی نہیں آئے گا اور وہ وعدہ کرنے والا بھی جانتا ہے کہ اس نے وہاں کبھی نہیں جانا' پھر لفظوں سے یہ بات کہی جائی' دل دکھایا جانا ضروری تو نہیں؟

جواب میں آمنہ بالکل چپ ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی تھیں۔ وہ ان کا بیٹا تھا' ان کے وجود کا حصہ' کیسے نہ جان پاتا یہ بات کہ وہ اس وقت رو رہی تھیں۔ ماں کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔ وہ خود کو درد اور تکلیف کی انتہاؤں پر محسوس کرتا بالکل خاموش تھا۔ اس کی اپنی ماں سے ہمیشہ ایسی ہی بات ہوتی تھی۔ چند منٹوں کی' مختصر سی بات' جس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے وہ کبھی بھی نہیں کہہ پاتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

"آپ اپنا خیال تو رکھ رہی ہیں ناں امو جان! میڈیسن لینی چھوڑی تو نہیں ناں؟"

"ہاں بیٹا میں اپنا خیال رکھ رہی ہوں۔ تم بھی اپنا خیال رکھ رہے ہو کہ نہیں؟" وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھیں۔ وہ اب اسی نرم اور محبت بھرے لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔

"آپ میری بالکل فکر نہ کریں امو جان! میں اٹلی آ کر تو کچھ زیادہ ہی کھا پی رہا ہوں۔ کل آفس کے بعد کا سارا ٹائم میں نے روم گھومتے ہوئے گزارا تھا' آج بھی آفس کے بعد کا ٹائم روما کی ہسٹری میں گم ہو کر گھومتے پھرتے ہوئے گزاروں گا۔"

وہ ہنستے مسکراتے انداز میں جھوٹ پر جھوٹ بولتا ماں کو اپنی زندگی کے بہت نارمل اور بہت خوشگوار ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! اپنا خیال رکھنا' اللہ حافظ۔"

"آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا امو جان! اللہ حافظ۔" اس نے مسکرا کر بولتے ہوئے فون بند کیا تھا۔

فون بند کرتے ہی اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کی سطح گیلی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو چھوا تو آنکھ سے گرتا آنسو اس کے ہاتھ پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین چنا

عام سی لڑکی

"آج کل کے لڑکوں کا پتا نہیں کیا مسئلہ ہے' ادھر منگنی ہوئی نہیں' ادھر رابطے کے لیے بے چین۔" عافیہ کی جھلائی ہوئی آواز پہ سنجیہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیوں بھئی کیا ہو گیا؟"

"اب ہمارے منگیتر کو ہی لے لیں' جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں منگنی کو' اور ہو گئے شروع' دو' چار دن سے گھر کے پی ٹی سی ایل پر فون کر رہے ہیں کیا کر رہی ہو؟ ٹھیک تو ہو؟ پڑھائی کیسی جاری ہے؟ تمہارے پاس سیل فون ہے؟ نہیں ہے تو میں دلا دوں؟ میں چاہتا ہوں ہم دونوں ہر وقت رابطے میں رہیں.... وغیرہ وغیرہ۔"

"پھر تم نے دیا انہیں اپنا سیل فون نمبر؟" سنجیہ کو تجسس ہوا۔

"تو بھلا میں پاگل ہوں جو انہیں اپنا سیل فون نمبر دے دوں گی۔ مجھے کیا ضرورت ہے شادی سے پہلے رابطے بڑھانے کی۔ میں نے تو فٹ سے منع کر دیا کہ میرے پاس سیل فون ہے ہی نہیں اور نہ ہی میں یہ مصیبت پالنے کا شوق رکھتی ہوں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"بہت غلط کیا یار! تمہیں یوں بے رخی نہیں اختیار کرنی چاہیے' وہ کوئی ایرا غیرا نہیں' تمہارا منگیتر ہے۔ پھر یہ رابطہ تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے کا' سمجھنے کا۔" سنجیہ نے اس کے منگیتر کی حمایت کی۔

"یار! میں اس جاننے اور سمجھنے کی لاجک (فلسفہ) کو نہیں سمجھ پائی۔ جب پوری زندگی پڑی ہے تو پھر وقت سے پہلے نزدیکیاں بڑھانے کی کیا تک ہے؟ ویسے بھی میں کوئی عام لڑکی نہیں کہ ایک منگیتر کے ملتے ہی آپے سے باہر ہو جاؤں۔ مجھے لڑکوں سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ چاہے وہ میرا منگیتر ہی کیوں نہ ہو۔"

اس نے بڑے فخر سے گردن اکڑائی تو سنجیہ کو اس پر رشک آیا۔ کچھ دن پہلے وہ اپنی منگنی کی تصویریں بھی لائی تھی۔

اس کا منگیتر دانیال بہت ہینڈسم تھا۔ لڑکیاں تو منگنی ہوتے ہی ہواؤں میں اڑنے لگتی ہیں۔ خصوصاً" اتنا ہینڈسم منگیتر پا کے' اور ایک وہ تھی اتنی نارمل اور فارمل۔

"تم واقعی عام لڑکی نہیں ہو عافیہ!" سنجیہ نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

* * *

رات کو سونے کے لیے جوں ہی عافیہ اپنے کمرے میں آئی۔ حسب معمول سب سے پہلے اسے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ اس نے بستر پہ لیٹ کے تکیے کے نیچے سے اپنا سیل فون نکالا۔

روزانہ کی طرح آج بھی بے شمار ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ اس نے ان باکس کھولا۔ یوں تو بہت سے نمبرز سے ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے لیکن اس نے بطور خاص مدثر اور آفاق کے ایس ایم ایس چیک کیے۔"

مدثر سات بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہت باتونی اور ہوشیار' اس کی بے شمار لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن اس کے خیال میں عافیہ سب سے مختلف تھی۔

اسے ہنسی آگئی۔ آخر ہر لڑکا یہ ہی بات کیوں کہتا ہے؟ اسے سو فیصد یقین تھا کہ جتنی بھی لڑکیوں کے ساتھ اس کی دوستی ہو گی' وہ سب کو یہ ہی بات کہہ کر متاثر کرتا ہو گا' لیکن اسے شاید پتا نہیں تھا کہ عافیہ ان لڑکیوں میں سے نہیں جو لڑکوں کی چکنی چپڑی باتوں پہ ریجھ جائے۔ اگر وہ مدثر سے چیٹ کرتی بھی تھی تو اس کے اصرار سے مجبور ہو کر اور پھر یہ اس کے لیے وقت گزاری تھی نہ کہ دوستی۔

آفاق کا معاملہ الگ تھا۔ وہ حد درجہ حساس اور پریشان حال انسان تھا۔ دوست اگرچہ وہ اسے بھی نہیں مانتی تھی' پر یہ ضرور تھا کہ اسے آفاق سے تھوڑی بہت ہمدردی تھی۔

وہ ہر وقت اپنے گھر کے حالات بیان کرتا رہتا' وہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتا تھا۔ چونکہ اس کے ابو کی وفات ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے چچا اور تایا اس کے ساتھ بہت ناروا سلوک کرتے تھے۔ وہ حد درجہ پژمردہ اور مایوس تھا' وہ کہتا تھا۔

"عافیہ! تم سے بات کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

کبھی عافیہ کو اس پر ترس آتا اور کبھی ہنسی۔ آخر دنیا کے سب مردوں کو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے عورت کی ہی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ وہ اپنے دکھڑے اپنے دوست حضرات سے بھی تو بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن نہیں' ان کا نشانہ عورت ہی ہوتی ہے۔

شاید وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عورت دنیا کی سب سے بے وقوف شے ہے۔ سو اس کا فائدہ ہم کیوں نہ اٹھائیں۔

"ہونہہ! بے وقوف تو خود میرے ہاتھوں بنے جا رہے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ جس کے ساتھ وہ اپنا حال دل بیان کر رہے ہیں' وہ تنہائی میں ان پر کتنا ہنستی ہے۔" وہ کھی کھی کرنے لگی۔

پھر اچانک ہی اسے دانیال کا خیال آیا۔ وہ بھی تو مرد ہے' خوب صورت ہے' ہینڈسم ہے' اس کی زندگی میں بھی کئی طرح کے دکھڑے ہوں گے۔ جنہیں شیئر کرنے کے لیے اسے "فرینڈز" کی ضرورت پڑی ہوگی۔

دنیا کے ہر مرد کی طرح اس نے بھی عورت کو بے وقوف سمجھنے کی غلطی کی ہوگی۔ کیوں نہ ان محترم کا بھی امتحان لیا جائے؟ دیکھیں تو جناب کس مزاج کے ہیں۔

عافیہ کو یاد تھا' دانیال نے کئی مرتبہ اپنے سیل فون سے اسے فون کیا تھا۔ آئی پہ اس کا نمبر دیکھ کر ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔

اس نے ڈائری نکالی اور اس میں نمبر نوٹ کر کے اس پر ایس ایم ایس کیا۔

"ہائے۔"

فون ہاتھ میں لیے وہ جواب کا انتظار کرنے لگی' لیکن کافی دیر تک جواب نہیں آیا تو اس نے پھر ایس ایم ایس کیا۔

"ہیلو۔" کچھ توقف کے بعد جواب آیا۔

"جی کون؟"

"انسان۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں' سیل فون کا استعمال انسان ہی کر سکتا ــــ جانور یا جن بھوت نہیں۔" اعتماد قابل دید تھا۔

وہ ہنسی' پھر پوچھا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"نام جان کر کیا کریں گے؟" عجیب سے انداز میں پوچھا گیا۔

"دوستی۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"جان پہچان۔"

"جان پہچان بنانے کا فائدہ؟"

"ضروری تو نہیں ہر کام میں فائدہ دیکھا جائے؟" عافیہ نے اعتراض کیا۔

"بنا فائدے کے تو اس دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا۔"

"اچھا چھوڑیں' رہنے دیں' مت بتائیں اپنا نام۔"

"خیر' ایسی بھی بات نہیں' مجھے دانیال کہتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں؟"

"بزنس۔"

"اوہ! لینڈ لارڈ قسم کے بندے ہیں آپ تو؟"

"عام بندہ ہوں' محنت کرنے والا۔" سادہ جواب دیا۔

"آپ کا اسٹار؟"

"Libra (لبرا)"

"اور ہابیز"

"فارغ وقت مل جائے تو اسنوکر کلب چلا جاتا ہوں کھیلنے کے لیے۔"

"پسندیدہ کھانا؟"

"بریانی۔"

"پسندیدہ مووی؟"

"کوئی خاص نہیں۔"

"میرے بارے میں آپ کی رائے؟"

"آپ کے بارے میں تو میں جانتا ہی نہیں' حتیٰ کہ آپ کا نام بھی نہیں' پھر آپ کے بارے میں رائے کیسے دے سکتا ہوں۔"

"میرا نام علینہ ہے۔" اس نے غلط بیانی کی۔

"وہ تو آپ لڑکی ہیں؟"

"تو آپ ابھی تک کیا سمجھ رہے تھے؟"

"کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔" اس نے صفائی سے کہا۔

"اب تو دنیا کے تمام مردوں کی طرح آپ کو بھی یہ ہی لگ رہا ہوگا کہ تمام لڑکیاں کتنی فضول اور بے وقوف ہوتی ہیں۔"

"پتا نہیں' میں نے ایسا نہیں سوچا۔ ہاں مگر ایک بات میں جانتا ہوں' ان کے پاس فضول کاموں کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ؟" عافیہ کو جھٹکا لگا۔ وہ ہی عام مرد' عام سوچ رکھنے والا۔

"اپنے آپ کو ہی دیکھ لیجئے' آپ مجھے نہیں جانتیں' نہ یہ جانتی ہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں' اچھا ہوں یا برا ہوں' پھر بھی اپنے پرسنل فون سے مجھے ایس ایم ایس کر رہی ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ میں آپ کے نمبر کو غلط طریقے سے بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ میرے کچھ غلط قسم کے دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں آپ کا نمبر دے کر آپ کو پریشان بھی کر سکتا ہوں۔ مگر آپ نے کچھ نہیں سوچا۔ جسے آپ جانتی نہیں اسے دوستی کی آفر دے کر آپ اپنا وقت ہی تو برباد کر رہی ہیں' ایک فضول سے کام کے لیے۔" اس نے ایک لمبی تقریر کر دی۔

"مانا کہ یہ فضول کام ہے' لیکن لڑکے بھی تو یہ ہی کرتے ہیں۔" اس نے سنبھل کے جواب دیا۔

"سب نہیں کرتے ہوں گے۔" فوراً جواب آیا۔

"آپ کو نہیں پتا۔"

"آپ کو بہت پتا ہے۔" شاید مذاق اُڑایا گیا تھا۔

"ہاں' آپ سے زیادہ ہی پتا ہے۔" اس نے جل کر جواب لکھا۔

"کیوں آپ کے پاس اور کوئی کام نہیں ہے؟" اس نے عافیہ کو لاجواب کر دیا۔

"میرے کام سے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔"

"ایز یو وش۔" وہ خاموش ہو گیا۔ دوبارہ کوئی ایس ایم ایس نہیں آیا۔

"اچھا ایک بات پوچھوں آپ سے مسٹر دانیال!" کچھ سوچ کر عافیہ نے دوبارہ ایس ایم ایس کیا۔

"جی ضرور۔"

"کیا آپ میرڈ (شادی شدہ) ہیں؟"

"No۔" صحیح جواب آیا۔

"انگیجڈ ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"ہم م م۔۔۔ اب سمجھ میں آیا۔" عافیہ نے مسکراتے ہوئے لکھا۔

"کیا؟"

"یہ ہی کہ آپ کو اپنی منگیتر سے ہی بات کرنے سے فرصت نہیں ہوگی تو بھلا کسی اور سے دوستی کیوں کریں گے۔" عافیہ دلچسپی سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔"

"غلط فہمی؟" عافیہ چونکی۔

"کیونکہ میری منگیتر کو آپ جیسی لڑکیوں کی طرح ان فضول کاموں سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بہت سمجھ دار اور نیک لڑکی ہے۔ اس کے خیالات کا مقابلہ تو دنیا کی کوئی لڑکی نہیں کر سکتی۔ آپ کو یہ جان کر حیرت تو ہوگی مگر یہ بالکل سچ ہے کہ اس کے پاس سیل فون بھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ موبائل افورڈ نہیں کر سکتی۔ یا پھر گھر والوں کی طرف سے اس پر کوئی پابندی ہے۔ بلکہ اس نے خود اپنی مرضی سے جھنجھٹ نہیں پالا۔ یہاں تک کہ منگنی کے بعد بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ میں نے اصرار بھی کیا کہ میں رابطے میں رہنا چاہتا ہوں لیکن اس نے صاف منع کر دیا۔ اگرچہ مجھے برا لگا تھا' لیکن پھر یہ سوچ کر بہت فخر محسوس ہوا کہ جو لڑکی میری شریک سفر بننے جا رہی ہے' وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔"

دانیال کا میسج مکمل ہوتے ہی عافیہ کو یوں لگا' جیسے وہ پاتال میں گر گئی ہو۔

پچھلے دو سال سے اس کے پاس سیل فون تھا۔ ان دو سالوں کے اندر اس کے نمبر پر کتنے ہی اجنبی نمبرز سے کال اور ایس ایم ایس آتے رہے تھے۔ وہ کال ریسیو نہیں کرتی تھی البتہ ایس ایم ایس کے جواب دے دیتی تھی۔

اس کے ذہن میں کئی نام ابھرے۔ اسد' بلال' مدثر' آفاق۔۔۔ جن سے اس نے موبائل پر لمبی لمبی چیٹ کی تھی۔ اس کے باوجود وہ دعوا کرتی تھی کہ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔

آئینہ سامنے تھا اور وہ خود سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ شرم سے اس کا سر جھک گیا اور اس نے چپکے سے اعتراف کیا۔

"ہاں میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔"

اور پھر عہد کیا۔

"مگر اپنے منگیتر کے لیے مجھے خاص بننا ہے۔"

⁂

نسیم آمنہ

ستم گراں

لڑکی بادِ صبا کے کسی مہکتے ہوئے جھونکے کی طرح ان کے برابر سے گزر کر جا چکی تھی اور مسعود بت بنا ابھی تک اسے جاتے دیکھے جا رہا تھا۔

”کیسی ہے؟“ جازی نے رائے چاہی۔

”زبردست!“ مسعود بے ساختہ بولا۔ ”جیسا سنا تھا‘ ویسا ہی پایا۔ مگر یار! لفٹ ملنے کے چانسز ہیں؟“

”ہم جیسوں کے لیے تو نہیں۔“ جازی نے مایوسی سے شانے اچکائے۔ اس کا تجربہ خاصا تلخ رہا تھا۔ لڑکی نے سیدھے منہ بات کرنا ہی گوارا نہ کیا تھا۔ ورنہ ایسی شرمیلی بو بو..... دکھائی نہ دیتی تھی کہ راہ چلتے کسی لڑکے سے بات کرنے میں ہچکچائے۔ جدید تراش کے لباس میں نک سک سے تیار، ایک ایسی متوالی چال کے ساتھ چلتی تھی جو خود پکارتی ہو کہ آؤ مجھے چھو جو تب ہی تو جازی کا حوصلہ بھی بڑھا تھا۔

”البتہ تم ٹرائی کر سکتے ہو۔“ اس نے مزید کہا۔

زبیر نے مسعود کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ ”مگر اپنا یہ حلیہ ذرا ٹھیک ٹھاک کر کے۔ ورنہ وہ تمہیں بھی ہماری کیٹگری میں شامل کر کے بہ یک جنبش قلم ریجیکٹ کر ڈالے گی۔“

”کرتی رہے۔ اسے مجھے قبول کرنا ہو گا۔ جیسا کہ میں ہوں۔ میرے بیک گراؤنڈ کو نہیں یارو! تم تو اچھی طرح جانتے ہو‘ مجھے اس طرح کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں خود پر کسی قسم کی پالش کروانی توہین سمجھوں گا اور یوں بھی اچھا خاصا شریف دکھائی دیتا ہوں کوئی

ناولٹ

لفنگا نہیں۔"

وہ تینوں اتنے پرانے اور گہرے دوست تھے کہ یک جان تین قالب کہے جاسکتے تھے اور مسعود تو ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھا۔ ایک بے انتہا نامور اور باثروت خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ باپ دادا کی بے انتہا زمین وجائیداد کے باوجود اس میں ذرہ بھر بھی تو غرور نہ تھا۔ وہ انتہائی سادگی پسند، بے تکلف اور پرخلوص تھا۔ ہر قسم کے تکلفات سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ حالانکہ اس کے..... جازی اور زہیر کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر مسعود نے کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح ان سے منفرد اور مختلف ہے۔ وہ ان ہی کی طرح اوڑھتا پہنتا۔ ان ہی کی طرح کھاتا پیتا تھا۔ انہی کی طرح اس نے اپنے تصرف میں ایک پھٹیچر سی موٹر سائیکل رکھی تھی جو مہینوں کے اکثر دنوں میں مرمت کے لیے کسی نہ کسی موٹر گیراج میں رہتی تھی اور وہ تینوں پیدل مارچ کرتے دکھائی دیتے تھے۔

مسعود اپنے پر آسائش محل نما آبائی مکان کی بناوٹی زندگی سے سخت گھبراتا تھا۔ وہاں اس کا دم گھٹتا تھا۔ جتنے دنوں وہ وہاں رہتا سخت بے آرام اور اکتایا ہوا رہتا تھا اور پھر جیسے رسہ تڑا کر ہاسٹل بھاگ آتا تھا۔ یہاں پھر وہی یار دوستوں کی خوش گپیاں، ہنسی قہقہے ہوتے۔ بہانے بنا کر سڑکیں ناپی جاتیں۔ ایک دوسرے کو اپنی غربت اور مفلسی کے دکھڑے سنائے جاتے۔ اکثر تو جھوٹے سچے دردناک نقشے کھینچ کر کسی نہ کسی سے ادھار اگلوایا جاتا اور خوب عیش اڑائے جاتے تھے۔

مسعود کو ان کے درمیان دیکھ کر کوئی کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لمبی چوڑی جاگیر کے مالک ملک فتح محمد کا نازوں پلا اکلوتا بیٹا ہے۔

وہ تینوں دوست آوارہ اور بگڑے ہوئے تو ہرگز نہیں تھے۔ مگر ایسے کوئی زاہد خشک بھی نہ تھے کہ دنیا کے حسن و رعنائی سے منہ ہی موڑ لیں۔ ہلکے پھلکے افیئر اور چند چٹخارے دار قصے سراسر جائز قرار دیے جاتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ کوئی بھی معاملہ کبھی سنجیدگی کی حدود تک نہ پہنچا تھا۔ کیونکہ فی الحال زندگی میں ایسی سنجیدگی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ابھی تو وہ محض طالب علم تھے۔ عملی زندگی کا میدان کوسوں دور پڑا تھا۔ ابھی تو زمین پر قدم جمانے کے لیے ایک مدت درکار تھی۔ بس جو چکر جہاں تک خوش اسلوبی سے چلتا، چلنے دیا جاتا۔ کئی ایک جگہ سے تو خالی جیب ہونے کے انکشاف پر منہ کی بھی کھانی پڑتی تھی۔ زہیر اور جازی پھر خوب آنسو بہاتے تھے کہ دنیا بڑی لالچی اور لڑکیاں بڑی مفاد پرست ہو چلی ہیں۔ ایسے میں مسعود بصد خلوص ان کے آنسو پونچھا کرتا تھا۔

پچھلے ہفتے اتفاقاً کوئی لڑکی جازی سے ٹکرائی تھی اور وہ اس کی چال پر مرمٹا تھا۔ لڑکی نے جب مڑ کر صلواتیں سنانی شروع کیں تو وہ اس کی من موہنی صورت پر بھی عاشق ہو گیا اور بقول زہیر کے دیدے پٹ پٹاتے ہوئے اس کی مغلظات یوں سنتا رہا۔ جیسے لڑکی کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔

مسعود کسی ذاتی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس تاریخی موقع سے محروم رہ گیا۔ دراصل جازی کو اپنی چرب زبانی، اپنی دلکش مسکراہٹ اور اپنی نگاہوں کے تیروں پر بڑا ناز تھا۔ لڑکیاں بہت کم اس سے بے رُخی برتتی تھیں۔ زہیر بونگا سا تھا اور اپنے بے ڈھنگے انداز واطوار کی بنا پر بارہا ایسی سچویشن سے گزر چکا تھا۔ بعد میں جازی اس کی خوب ہنسی اڑاتا تھا۔

زہیر کو پہلی بار اس کا ریکارڈ لگانے کا موقع ملا تھا۔ وہ تو خوشی سے اچھل اچھل پڑا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ تماشا ساری دنیا دیکھے، پر اسے اس تماشے کا کوئی تیسرا گواہ تک نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ مسعود تک موقع پر موجود نہ تھا۔ بہرحال ہفتے بھر سے لڑکی کے حسن، اس کی چال ڈھال اور اس کی تیزی طراری کے قصے سن سن کر مسعود کے کان پک چکے تھے۔ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اتنے دنوں تک سامنا ہونے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ دراصل اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے وہ ان دنوں زمین کے کسی مقدمے کے سلسلے میں پیشیاں بھگتانے میں مصروف رہا۔ آج بالآخر سامنا ہوا تو بے اختیار جازی کی تعریفوں کی تائید کرنی پڑی۔

وقت ضائع کرنے کا تو وہ قائل ہی نہیں تھا۔

"اجازت ہے؟" اس نے جازی سے پوچھا۔

"سو بار اجازت۔" جازی کو دوبارہ گالیاں سننے کا کوئی شوق نہ تھا۔ یوں بھی وہ زبردستی کا قائل نہ تھا جب لڑکی نے پہلی ہی بار اسے درخور اعتنا نہ سمجھا تو وہ کیوں خوامخواہ گلے کا ہار بنتا۔ آخر اس کی بھی تو کوئی عزت نفس تھی۔ وہ تو صرف مسعود سے اپنے ذوق انتخاب کی داد چاہ رہا تھا۔ اب اگر مسعود کو خود سے "آبیل مجھے مار" کہنے کا شوق چڑھا تو وہ کیا کرتا۔

مسعود ایک ہاتھ سے بال سنوارتا کالر اکڑائے۔ ایک ادائے بے نیازی سے آگے بڑھا۔

"خیال کرنا۔ زبان چلانا تو خوب جانتی ہے۔ کہیں ہاتھ نہ چلا بیٹھے۔" زہیر نے پیچھے سے یاد دلایا۔

مسعود نے لاپروائی سے اونہہ کہہ کر گردن جھٹک ڈالی۔ لباس اس کا لاکھ معمولی سہی یہ بات لاشعوری طور پر اس کی خود اعتمادی بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی تھی کہ وہ ایک رئیسانہ پس منظر رکھتا ہے۔ وہ اپنی امارت کا کبھی شو آف کرتا تو نہیں تھا مگر پھر بھی غیر ارادی طور پر زہیر اور جازی اندر ہی اندر ایک قسم کے احساس کمتری کا شکار رہتے تھے۔

اگر مسعود..... جاگیردار کا بیٹا نہ ہوتا تو اس کی چال میں اتنا اعتماد اور اس کی گردن میں اتنا تناؤ کبھی نہ ہوتا۔ اس کی خاندانی ثروت اور وجاہت تو اس کی اونچی پیشانی سے ٹپکتی تھی۔ اس وقت بھی ان ہی کی طرح گھسی ہوئی جینز اور معمولی سی شرٹ میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ کی طرح ان کے درمیان نمایاں تھا۔

مسعود لڑکی تک پہنچ چکا تھا۔ بلکہ اسے مخاطب بھی کر چکا تھا۔ لڑکی رک گئی۔ مڑ کر مسعود کو دیکھنے لگی اور ادھر ان دونوں کے دل دھڑکنا بھول گئے۔

مسعود نے جھک کر زمین پر سے کوئی شے اٹھا کر لڑکی کی طرف بڑھائی پھر لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر جازی اور زہیر کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہو گئیں۔ ورنہ وہ تو گرج چمک کے منتظر تھے مگر لڑکی نہ صرف مسکرائی بلکہ اچھی خاصی ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے غالباً "شکریہ" کا لفظ ادا کرتے ہوئے مسعود کے ہاتھوں سے وہ شے لے لی۔ چند جملوں کا تبادلہ ہوا اور لڑکی لہراتی بل کھاتی اپنی راہ پر گامزن ہو گئی۔

مسعود نے پلٹ کر انہیں کامیابی کا علامتی انگوٹھا دکھایا اور ان سے آملا۔

"ایسا کیا جادو پھونک ڈالا؟" جازی اس کی دلفریب مسکراہٹ پر جل کر خاک ہوا جا رہا تھا۔

"اور وہ کیا رشوت دی گئی تھی۔ کیا اس کا لونگ گواچا تھا؟" زہیر بھی کچھ کم حیران پریشان نہ تھا۔ جہاں جازی کی پرسنالٹی اور ڈائیلاگ بازی کام نہ دکھا سکی وہاں مسعود نے منٹوں میں کام کر دکھایا تھا۔

مسعود خوب اترا رہا تھا۔ "کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اپنے پارکر کی قربانی دینی پڑی۔ لفٹ حاصل کرنے کا پرانا نسخہ۔"

"وہ تمہارا قیمتی قلم!" زہیر نے آنکھیں پھیلائیں۔

"اس کی مسکراہٹ سے زیادہ قیمتی تو نہ تھا۔" مسعود پر اس مسکراہٹ کا نشہ طاری تھا۔

"یاد رہے، محترمہ خیر سے بڑی جھوٹی اور حریص بھی ہیں۔ یعنی کہ اتنی ڈھٹائی سے پرائی شے پر اپنا دعوا کر لیا۔ مزے سے مسکرا کر رکھ لیا۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے، کس طبیعت کی لڑکی ہوگی۔" جازی حسد کا شکار تھا۔

"کسی بھی طبیعت کی ہو۔ مجھے اس کی یہی ادا تو پسند آئی۔ حسن اپنا خراج تو لیتا ہی ہے۔ ویسے ایک لمحے کے لیے تو میں بھی حیران رہ گیا جب اس نے شکریہ کے ساتھ قلم پرس میں رکھ لیا۔" مسعود ہنس پڑا۔

"شکریہ کے علاوہ اور بھی تو باتیں ہوئی تھیں۔"

جازی کے دل میں کھدبد مچی ہوئی تھی۔

"ہاں۔ یونہی ذرا سا تعارف ہوا تھا۔ روشنا نام ہے' یہاں قریب ہی کالج میں پڑھتی ہے۔ اب تو روز ہی ملاقات ہوگی۔"

"لگتا ہے' پار کر کے ساتھ تمہارا دل بھی پار کر گئی ہے۔" زہیر نے مسعود کی بے تابی و بے خودی دیکھ کر تبصرہ کیا۔

"شاید۔" مسعود کہیں کھو گیا۔

* * *

شاید نہیں "یقیناً" ہی ایسا ہوا تھا۔ مسعود پھر روزانہ ہی روشنا کی راہ میں کھڑا ہونے لگا۔ جازی اور زہیر کو "لازما" اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ تعارف کے مراحل طے ہونے کے بعد بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ روشنا پہلے پہل تو مسکراہٹیں اچھالتی رہی۔ رسمی دعا سلام بھی ہوتی رہی' پھر بے تکلفی بڑھی تو ملاقاتوں کی نوبت آگئی۔ وہ ہنس ہنس کر ان سے کہتی تھی کہ وہ پہلی نظر میں ہی سمجھ گئی تھی کہ موصوف لفٹ لینے کے چکر میں ہیں اور پرانا گھسا پٹا نسخہ آزما رہے ہیں۔ پھر یہ کہ کچھ تو لڑکا خود اس کے دل کو بھی بھایا تھا۔ اور کچھ اس نے اسے سبق دینے کا سوچا' اس لیے بلا تامل قلم رکھ لیا۔"

مسعود جھینپ جاتا تھا۔

روشنا نے جازی سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی صورت اسے کچھ دیکھی بھالی لگتی ہے۔

وہ تینوں "فوراً" ہی آئیں بائیں شائیں کر کے بات گھما گئے۔ یہ تو شکر تھا کہ روشنا کی یادداشت اتنی اچھی نہ تھی۔

ویسے اس کا اصل نام تو روشن تھا۔ کالج میں بھی یہی نام درج تھا مگر اسے اپنے اس فرسودہ نام سے چڑ تھی۔ اس لیے اس نے خود ہی اپنا نام روشنا رکھ ڈالا تھا۔ اسے اپنے گھر کا فرسودہ ماحول بھی پسند نہ تھا۔ اس کا تعلق ایک متوسط اور روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مگر اسے اپنے گھر کی گھٹی گھٹی فضا سخت ناپسند تھی۔ وہ پرانی روایات سے بغاوت کرنا چاہتی تھی' ادھر مسعود بھی اپنے گھر کے ماحول سے فرار چاہتا تھا۔ شاید یہی قدر مشترک تھی جو ان دونوں کو اتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث بنی۔ ویسے روشنا ابھی تک مسعود کی حقیقت سے ناواقف تھی۔ وہ ابھی تک مسعود کو ایک عام سے گھرانے کا لڑکا سمجھتی تھی اور اسی بنا پر اس سے بلا جھجک ملتی جلتی تھی۔

رفتہ رفتہ جازی اور زہیر نے خود کو ان دونوں کے درمیان کباب میں ہڈی سمجھنا شروع کر دیا۔ معنی خیز جملوں کا تبادلہ' والہانہ نگاہوں کا تصادم۔ مسعود کی پرشوق گفتگو' روشنا کی شرماہٹیں ان سب کے درمیان وہ اپنے آپ کو سخت نکو سمجھتے۔ انہوں نے غیر محسوس طور پر ان دونوں کی کمپنی میں گھسنے سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ مسعود نے جب یہ اندازہ لگایا تو وہ ان دونوں سے خوب جھگڑا۔

"تم دونوں مجھ سے کوئی الگ تھوڑی ہی ہو۔ یارو! میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔"

"تم روشنا کے بغیر بھی ادھورے ہو اور جب ہم سب ملیں گے تم مکمل ہونے کے بجائے ڈیڑھ ہو جاؤ گے اور زیادتی کسی بھی شے کی خراب ہوتی ہے۔ بونگے سے زہیر نے فلسفیانہ انداز میں سمجھایا۔

"ہر شے کا اپنا اپنا مقام ہے۔ دوست محبوبہ کی اور محبوبہ دوست کی جگہ نہیں لے سکتی۔ ہم لوگ جہاں مس فٹ ہو جائیں' وہاں ہمیں زبردستی نہیں گھسنا چاہیے۔" جازی نے کہا۔

"ہمارا خیال ہے کہ تم دونوں تنہا زیادہ جچتے ہو۔ دوستی الگ اور محبت الگ نبھائی جاتی ہے۔" یوں مسعود کا وقت ان سب کے درمیان بٹ گیا۔ بہرحال وہ اب بھی اس کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی محبت سے اسی طرح واقف تھے۔

* * *

وہ دیکھ رہے تھے کہ مسعود اس کے عشق میں سرتاپا غرق ہو چلا ہے۔ اس کی توجہ پڑھائی کی طرف سے بھی ہٹتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ان کے درمیان ہوتا تو بھی اس کے حواسوں پر روشنا سوار رہتی تھی۔ اس کی گفتگو زیادہ تر روشنا کے گرد ہی گھومتی تھی۔ "روشنا یہ کہتی ہے۔ روشنا نے اس رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ روشنا کو یہ پسند ہے۔ یہ ناپسند ہے۔"

روشنا کے خاندان' اس کے ماں باپ' بہن بھائیوں اور ہر شے سے غائبانہ واقف تھا۔ جازی کو اب اس کی دن بدن بڑھتی ہوئی دیوانگی سے خوف آنے لگا تھا۔ مسعود پیار کو ترسا ہوا لڑکا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ ماں بھی اس کے بچپن میں گزر گئی۔ باپ بارعب اور اولاد سے فاصلے پر رہنے کا قائل تھا۔ پیار کی تشنگی مسعود کے ساتھ پل کر جوان ہوئی تھی جب ہی تو وہ ذرا سی محبت پا کر جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ جب ہی تو وہ دوستوں کو والہانہ عزیز رکھتا تھا۔ اب اس کے پیار کا محور روشنا تھی۔ وہ اب بہت مطمئن' بہت مسرور' بہت سیراب تھا۔

مگر محبت کی یہ سچائی جازی کو روشنا میں نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے پیار میں وہ حدت و شدت نہ تھی۔ اس کی محبت جانے کیوں جازی کو سطحی اور بناوٹی دکھائی دیتی تھی۔ روشنا ابھی آگ کے اس دریا میں نہ اتری تھی جس میں مسعود...... دیوانہ وار ڈوبا ہوا تھا۔ وہ صرف مسعود کے جذباتی مکالموں' اس کی بے قراریوں پر شرماتی تھی۔ خوش ہوتی تھی اور بس۔

کبھی کبھی تو جازی کو یوں لگتا جیسے کہ وہ مسعود کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ جان بوجھ کر اسے تڑپا کر اپنی اہمیت کا اندازہ لگاتی ہو۔ وہ اکثر مسعود کو وقت دے کر بھول جاتی اور مسعود انتظار میں تڑپتا رہ جاتا اور پھر جب روشنا بعد میں بڑی معصومیت سے کہتی کہ وہ بھول گئی تھی تو جازی کو سب سراسر جھوٹ لگتا۔

روشنا کی آنکھیں اس جھوٹ کا ساتھ نہ دیتی تھیں۔ وہ خود کو جتنا بھولا اور جتنا معصوم ظاہر کرتی تھی۔ جازی کو اتنی لگتی تو نہ تھی۔ مگر یہ باتیں مسعود کو کون سمجھاتا۔

جازی نے تو اس افیئر کو بھی یونہی وقت گزاری کا ذریعہ سمجھا تھا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ مسعود اس خطرناک حد تک سنجیدہ ہو جائے گا کہ اسے دل کا روگ ہی بنا ڈالے گا۔ روشنا کبھی جھوٹ موٹ بھی خفا ہو جاتی تو مسعود کی جان پر بن جاتی تھی۔ وہ ایک ہی دن میں برسوں کا بیمار دکھائی دینے لگتا۔ شیو بڑھا کر مجنوں بنا پھرتا تھا اور شاید یہ دیکھ کر روشنا کا مان بڑھ جاتا تھا۔ اس کی ادائیں اور قاتلانہ ہو جاتی تھیں۔

جازی اب دل ہی دل میں اسے سخت ناپسند کرنے لگا تھا۔ یہ لڑکی آسیب کی طرح مسعود سے چمٹ گئی تھی۔ مسعود کی آنکھوں پر تو محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مگر جازی کو وہ کسی بھی طرح اپنے اتنے اچھے' پرخلوص' اتنی ڈھیر ساری خوبیوں کے مالک دوست کی شریک حیات بننے کے لیے موزوں دکھائی نہ دیتی تھی۔ اسے تو وہ ایک سطحی اور مادہ پرست لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ مسعود نے کتنے ہی تحائف اس کی نذر کیے تھے اور جنہیں وہ بلا تامل قبول کرتی رہی تھی حالانکہ بظاہر اس کے سامنے مسعود کی یہ حالت تھی کہ وہ

جازی اور زہیر سے ادھار لیتا رہتا تھا اور بھی کتنے ہی دوستوں کا ادھار اس پر چڑھا ہوتا تھا۔ اکثر ادھار پیسے چکانے کے معاملے پر اس کا جازی اور زہیر سے جھگڑا بھی چلتا رہتا تھا۔ اس کی جیبیں اکثر خالی ہی دکھائی دیتی تھیں۔ کیونکہ سارا جیب خرچ مہینے کے شروع میں ہی وہ اپنی شاہ خرچیوں پر اڑا دیا کرتا تھا اور اس کے والد حساب کتاب کے معاملے میں خاصے سخت تھے۔

مسعود معمولی کپڑوں میں ملبوس رہتا تھا۔ اس کے پاس پرانی سی موٹر سائیکل تھی اور وہ اکثر پیٹرول کی مہنگائی کا رونا روتا رہتا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے روشنا اسے ایک مفلوک الحال طالب علم ہی سمجھتی تھی۔ ایسے میں جب وہ مسعود کے قیمتی تحفے اپنا حق سمجھ کر لیتی اور کبھی پلٹ کر نہ پوچھتی کہ یہ تحفے دینے کے لیے اسے کسی سے ادھار تو نہیں لینا پڑا تو جازی کو وہ ایک نہایت خود غرض اور لالچی قسم کی لڑکی لگتی تھی جبکہ مسعود کا کہنا تھا کہ روشنا وہ لڑکی ہے جو بظاہر اس کے غریب ہونے کے باوجود اس سے سچی محبت کرتی ہے۔

* * *

روشنا کی اس سچی محبت کی اصلیت بہت جلد کھل کر سامنے آگئی لگتا تھا۔ ان دنوں مسعود کے ستارے گردش میں آئے ہوئے تھے۔ پہلے تو اسے اپنے باپ کی ناگہانی موت کے صدمے سے گزرنا پڑا۔ مسعود لاکھ اپنے والد سے دور — رہا تھا۔ مگر ملک فتح محمد نے اسے بے حد محبت و شفقت سے پالا تھا۔ مسعود تو یوں بھی بے حد جذباتی تھا۔ اس سے یہ صدمہ برداشت نہ کیا گیا۔ وہ نڈھال ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے میں جازی اور زہیر اس کا سہارا بنے ہوئے تھے۔

دوسری طرف اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زمین و جائیداد پہ اس کے چچا اور تایا قابض ہو گئے۔ اس سلسلے میں ان کی پہلے ہی اپنے مرحوم بھائی سے ٹھنی ہوئی تھی۔ مقدمات چل رہے تھے۔ ایک نیا مقدمہ داخل دفتر — ہو گیا مگر اس کے چچا اور تایا کمال ہوشیاری سے بھاری رشوتیں دے کر اپنے حق میں تاریخیں ڈلواتے گئے۔

انہوں نے اجرتی قاتلوں کے ذریعے مسعود کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔ جازی اور زہیر کے اصرار پر بالآخر مسعود کو ایک طرح سے اپنی ہی جاگیر سے بے دخل ہو کر شہر آنا پڑا۔ جازی اور زہیر حالات کا سکون سے جائزہ لے کر قانون کے سہارے اس کے رشتے داروں کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہ رہے تھے۔ کتنے ہی دن تو ان ہی الجھنوں میں گزر گئے۔

مسعود نے گھبرا کر روشنا کی محبت کی چھاؤں میں پناہ چاہی تو ایک اور ہی انکشاف سے زمین پیروں تلے سے کھسک گئی۔ روشنا بڑے مزے سے اپنے ایک لندن پلیٹ کزن کی منگنی کی انگوٹھی انگلی میں پہنے گھوم رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ملال تک نہ تھا۔

"اب میں کیا کرتی۔ تم لوگ تو غائب ہی ہو گئے۔ اتنا اچھا رشتہ تھا۔ کوئی اور لے اچکتا۔ میرے ماں باپ کی بھی مرضی تھی۔ میں کیسے انکار کرتی۔" وہ اس قیمتی انگوٹھی کی نمائش کرتے ہوئے ـــ معصومیت سے گویا ہوئی۔

غم و غصے سے جازی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے بمشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے مسعود کے سارے بحران کے بارے میں بتایا۔

روشنا مسعود کے والد کی موت پر افسوس کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔ اس کے ذہن پر لندن سوار تھا۔ ہر بات کا سرا اپنے کزن اور لندن کی طرف جا مڑتا تھا اور آخر میں وہی مشرقی لڑکی کی ان دیکھی مجبوریوں کا رونا۔

مسعود کا چہرا مردوں سے بدتر ہو رہا تھا۔ رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ جازی کو یوں لگا، جیسے وہ ابھی چکرا کر گر پڑے گا۔ روشنا سے اس بے وفائی کا تو اس نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا۔ اسے اپنے چچا اور تایا کی دغابازیوں، مکاریوں اور اپنی جائیداد چھن جانے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا صدمہ اسے روشنا کے منہ سے یہ سب سن کر ہوا تھا۔

روشنا اجنبی بنی اٹھ گئی۔ جازی بمشکل تمام مسعود کو ہاسٹل تک لایا تھا۔ مسعود پھر جو بیمار ہو کر بستر پر پڑا تو دنوں نہ اٹھ سکا۔ کوئی بھی علاج کارگر نہ ہو رہا تھا۔ زہیر اور جازی دونوں سخت پریشان تھے۔ ہاسٹل کے جس کمرے میں ان تینوں روم میٹس کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔ وہاں اب خاموشیوں کے ڈیرے تھے۔ مسعود اداس پڑا رہتا یا پھر کتاب کی اوٹ لیے بظاہر پڑھتا دکھائی دیتا مگر جازی جانتا تھا اس کا ذہن اس وقت کہاں ہو گا۔ اپنے عزیز از جان دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔

* * *

آخر اس نے ایک بار قسمت آزمائی چاہی کہ شاید مسعود کی اس دگرگوں حالت کے بارے میں سن کر روشنا کا دل پگھل جائے۔ اس کی سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھے۔ اور وہ خاندانی روایتوں سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ مگر روشنا کی آنکھوں پر تو لندن کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ اول تو وہ جازی سے کسی ریسٹورنٹ میں ملنے پر ہی آمادہ نہ ہوئی۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ ایک غیر لڑکے سے گھر سے باہر یوں میں کیسے مل سکتی ہوں۔"

حالانکہ غیر لڑکوں سے ریسٹورنٹ وغیرہ میں ملاقات کرنے سے "بڑی" باتیں وہ پہلے بھی ہنسی خوشی کر چکی تھی وہ اس بات پر بھی برافروختہ ہوئی تھی کہ جازی نے یوں اس کے گھر فون کیوں کیا۔ فون اس کا منگیتر بھی تو ریسیو کر سکتا تھا۔ جازی بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر پی گیا۔ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے اپنے دوست کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔"

"وہ مسعود! کیا ہو گیا ہے اسے۔" وہ تجاہل عارفانہ سے بولی۔

جازی نے جلدی جلدی تفصیل بتانی شروع کی مگر روشنا نے درمیان میں ہی ٹوک ڈالا۔

"کیا مصیبت ہے۔ میرے پاس اس وقت اتنی لمبی بحث سننے کا وقت نہیں ہے۔ کوئی بھی آسکتا ہے۔" اس پر اپنے منگیتر کا ہوّا سوار تھا۔

"مسعود تو سدا کا جذباتی ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ ایسے رومانٹک ہیرو بننے کا دور اب گزر چکا ہے۔ حقیقت پسند بنے۔ آخر میں نے بھی تو حقیقت قبول کر لی ہے۔ اپنے خاندان کی عزت کی خاطر سہی۔ بس اس سے کہہ دو۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔" وہ جلد از جلد جان چھڑانے کی فکر میں تھی۔

"تمہیں ایسا ہی کرنا تھا تو تم نے اسے محبت کے جھوٹے جال میں کیوں پھانسا؟ اس کے دل سے کھیلنے کا حق تمہیں کس نے دیا؟ اس سے جھوٹے وعدے کیوں کیے؟ جھوٹی قسمیں کیوں کھائیں؟" جازی اب مزید برداشت نہ کر سکا۔

"مائنڈ یو مسٹر جازی! جو کچھ بھی کرتی ہوں، وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ بیچ میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں۔" روشنا بے رخی سے بولی۔ "یہ میری حماقت تھی جو میں اس جیسے کنگلے سے محبت کر بیٹھی۔ آخر کیا ہے اس میں، نہ تعلیم نہ گھربار نہ نوکری۔ اب تو سنا ہے، رشتے داروں نے گھر سے بھی نکال دیا ہے۔ کیا وہ مجھے اپنے ساتھ سڑکوں پر رکھے گا؟"

"یہ سب وقتی پریشانیاں ہیں۔ تم نے اس کے بارے میں اور کچھ بھی سنا ہو مگر شاید یہ نہ سنا ہو گا کہ وہ کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ کتنی بڑی جائیداد کا مالک ہے۔ تم تو شاید اس کی دولت کا حساب بھی نہ کر سکو۔ بس یہ چند دن پریشانیوں کے گزر جانے دو پھر وہ تمہیں ایسی زندگی دے گا جس کا تم نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔ وہ تمہارے تصور سے زیادہ دولت مند ہے۔"

روشنا طنزیہ ہنس پڑی۔ "یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یہ سبز باغ کسی اور کو دکھایئے۔ میں بیسویں صدی کی باشعور لڑکی ہوں۔ وہ کتنے پانی میں ہے، سب جانتی ہوں۔"

"محبت کو کھیل بنانا شعور کی بلندی نہیں، ذہن کی

پستی ہے۔ گھٹیا پن ہے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ لڑکیاں محبت کو دولت کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔ وہ اداس ہے۔ تنہا ہے۔ دکھی ہے۔ اسے تمہارے پیار، تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔"

"میں نے دکھی انسانیت کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ یوں بھی اب میری منگنی ہو چکی ہے۔ مجھے اس قصے سے علیحدہ ہی رکھو۔" روشنا شاید فون رکھنا چاہتی تھی۔

جازی پھٹ پڑا۔ "مجھے یہ کہنے دو روشن صاحبہ کہ میں نے آج تک تم جیسی پتھر دل، بے حس، خود غرض اور حریص لڑکی نہیں دیکھی۔"

"آنکھیں کھلی رکھ کر دیکھو، ہزاروں مل جائیں گی۔" روشنا تڑخ کر بولی۔

جازی غم و غصے سے سلگ اٹھا تھا۔

"ہاں، تم جیسی لڑکیوں کا مشغلہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مسعود جیسے سادہ اور معصوم لڑکوں کو الو بنا کر ان سے روپیہ پیسہ اور تحفے بٹورتی رہیں۔ مسعود بے وقوف تھا جو تمہارے مکر و فریب کو نہ پہچان سکا ورنہ میں نے تو اول روز سے ہی تمہاری اصلیت بھانپ لی تھی۔"

"اتنے ہی چہرا شناس تھے تو کچھ عقل اس احمق کو بھی سکھا دی ہوتی۔" روشنا استہزائیہ بولی۔

"تمہارے عشق نے اس کی عقل پر پتھر ڈال دیے تھے لیکن یاد رکھو، روشن! تمہیں اپنے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ اگر میرے دوست کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہیں مرتا تمہارا دوست۔ بہت دیکھے ہیں ایسے مجنوں۔" روشنا نے ایک ہلکے سے قہقہے کے ساتھ ریسیور پٹخ ڈالا۔

جازی لوٹا تو مسعود سے نظریں چرا رہا تھا۔ مسعود ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ زہیر کا منہ بھی لٹک گیا۔ جازی آج خوب آس دلا کر گیا تھا کہ مسعود کی محبت اسے ضرور حاصل ہو گی۔ وہ آج کسی بھی طرح روشنا میں منگنی توڑنے کی ہمت پیدا کرے گا۔

جازی واقعی ایسا کر گزرتا اگر روشنا مسعود کے ساتھ سنجیدہ ہوتی اور سچ مچ خاندانی دباؤ کی وجہ سے منگنی پر مجبور ہوئی ہوتی۔ لیکن روشنا تو جیسے خود ہی مسعود سے دامن چھڑانے کی فکر میں تھی اور قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

جازی اور زہیر، مسعود کو تسلیاں دیتے تھے کہ دنیا روشنا پر ختم نہیں ہو گئی۔ وہ اس کے قابل ہی نہ تھی۔ ایک بے وفا، دھوکے باز لڑکی کے لیے یوں اپنا آپ برباد کر لینا مردانگی کی توہین ہے۔ اسے تو روشنا کو ایک ناخوشگوار باب کی طرح اپنی زندگی سے نکال پھینکنا چاہیے۔ دنیا میں وفا شعار، نیک سیرت، پرخلوص لڑکیوں کی کوئی کمی تھوڑی تھی۔ خدا نے یقیناً "جیون ساتھی" کے طور پر اس کے لیے ایک ایسی لڑکی چن رکھی ہو گی جو ایسی ہی خوبیوں کی مالک ہو گی اور اپنے پیار و خلوص کے مرہم سے ساری محرومیوں کی تلافی کر دے گی۔

مسعود سب کچھ سنتا مگر یوں لگتا، ساری نصیحتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا ہے۔

* * *

ان مایوس کن حالات میں مسعود کے رشتے کے ایک ماموں اس کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔ وہ زبردستی ہی مسعود کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے گئے کہ اپنوں کے ہوتے ہوئے اس کا یوں بے یار و مددگار ہاسٹل میں پڑا رہنا مناسب نہیں لگتا۔ مسعود نے لاکھ کہا کہ وہ پہلے بھی تو ہاسٹل میں ہی رہتا تھا اور اب کسی پر بوجھ بننا ہرگز نہیں چاہتا۔ اس نے جازی اور زہیر کی محبتوں کا حوالہ بھی دیا مگر ماموں کا کہنا تھا کہ پہلے کی بات اور تھی۔ ان حالات میں اسے گھریلو فضا کے سکون کی ضرورت تھی اور اپنے عزیزوں اور چاہنے والوں کی زیادہ سے زیادہ دل جوئی کی ضرورت تھی۔

زہیر اور جازی نے بھی ان کی حمایت کی تو مجبوراً مسعود کو سامان باندھنا پڑا۔

مسعود کے ماموں نہایت خدا ترس اور قانع قسم کے شخص تھے، ایک اچھی سرکاری پوسٹ پر تھے۔ چاہتے تو اس عہدے کا فائدہ اٹھا کر لاکھوں کا ہیر پھیر کر سکتے تھے۔ مگر وہ رزق حلال کے سختی سے قائل تھے۔ ان کی کوئی کنواری جوان بیٹی بھی نہ تھی۔ اس لیے مسعود سے ان کا کوئی مفاد وابستہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ان کے خلوص اور نیک نیتی پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ حالانکہ مسعود کا ایمان اب خون کے رشتوں پر سے بھی اٹھنے لگا تھا۔ مگر اس کے ماموں ایک نئی مثال بن کر سامنے آئے۔

ماموں کے ہر قسم کی قیمتی آرائش و آسائش سے محروم چھوٹے سے گھر میں اسے بلا کا سکون اور بے حد محبت ملی۔ اس کی سادہ دل مامی نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا۔ ان کا بیٹا اسکالرشپ پر بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے گیا ہوا تھا۔ مسعود کے لیے نہ صرف اس کا کمرا کھول دیا گیا بلکہ اسے صحیح معنوں میں بیٹے کی جگہ بھی تسلیم کر لیا گیا۔

ماموں نے ہی پھر اس کے ساتھ کورٹ کچہریوں کے چکر لگائے۔ مقدمے کی پیشیاں بھگتائیں۔ حالانکہ مسعود بیزار تھا۔ کسی تنہا گوشے میں جوگ لینے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ ماموں نے اس کی ہمت بندھائی۔ حوصلہ دلایا، اپنے حق کے لیے لڑنے کا گر سمجھایا اور پھر بالآخر مسعود یہ قانونی جنگ جیت گیا۔ ایک صبر آزما انتظار کے بعد مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔

اسے اپنا حق وراثت، اپنی زمین، جائیداد سب کچھ واپس مل گیا۔ اس کے چچا اور تایا کو منہ کی کھانا پڑی۔ اس مقدمے بازی کے نتیجے میں ان کی عزت اور نیک نامی یوں بھی خاک میں مل چکی تھی۔

وہ دن مسعود کی زندگی کا ایک اہم ترین دن تھا۔ اس کی آزمائشوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اس کے ماموں، مامی، جازی اور زہیر اس کی اس خوشی میں مکمل طور پر شریک تھے۔ ڈھیروں مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ خیرات نذر نیاز کی گئی۔

* * *

مسعود سجدہ شکر بجا لایا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ اپنے باپ دادا کی جاہ و حشمت اس کے لیے ایک مضبوط بنیاد تھی۔ وہ اپنی پشت پر سے یہ پناہ گاہ چھن جانے کے بعد بہت بے بس ہو گیا تھا۔ اسے اب دولت کی اہمیت سے انکار نہیں تھا۔ مگر وہ اب بھی دولت کا پجاری نہیں بنا تھا۔ اس نے اپنی جاگیر میں پہنچ کر اپنے باپ کی دستار سنبھال لی اور سارے انتظامات اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ مگر اب بھی اس میں غرور نہ آیا تھا۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ فراخ دل ہو گیا تھا۔

اپنی تعلیم مزید جاری رکھنے کی اس نے کوئی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ اب اسے جاگیر اور زمینوں کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ تاہم زہیر اور جازی سے اس کا میل ملاپ اسی طرح قائم رہا۔

وہ دونوں ہر تعطیل مسعود کی حویلی میں گزارتے تھے۔ جہاں وہ شہزادوں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ اس تجربے سے گزر کر اس میں ایک تبدیلی البتہ آ گئی تھی کہ وہ نمود و نمائش کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ دولت سے کچھ عرصے کی محرومی نے اس کے دل میں اس کی قدر و قیمت پیدا کر دی تھی۔ اس نے اپنی حویلی شاندار طریقے سے سجائی تھی۔ وہ چمکتی دمکتی قیمتی کاروں میں سفر کرتا اور اعلا ہوٹلوں میں کھانا کھانا پسند کرتا تھا۔

جازی اور زہیر کے لیے وہ اب بھی ان کا وہی پرانا، بے تکلف دوست تھا۔ مسعود نے انہیں آفر کر رکھی تھی کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ اس کی جاگیر میں اس کا ہاتھ بٹانے آ جائیں۔

مسعود کی معیت میں جازی اور زہیر بھی خوب جی بھر کر زندگی کی آسائشوں اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے۔

مسعود فارغ ہوتا تو اکثر وہ لوگ شہر میں لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ مسعود "ملک مسعود" کا بھاری بھرکم چولا اتار پھینکتا۔ پھر وہی بے تکلف قہقہے، دھول دھپا، وہی چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ یوں لگتا جیسے کچھ عرصے کے لیے وہی پرانے بے فکری کے دن لوٹ آئے ہوں۔

* * *

شاید وقت کے پہیے نے الٹا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔

اچانک ایک روز ایسی ہی ایک ڈرائیو میں روشنا سے ٹکراؤ ہو گیا اور شاید مسعود کے زخم ہرے ہو گئے۔ جس محبت کو اس نے بڑی مشکل سے زبردستی سُلایا تھا، وہ دوبارہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔

روشنا کسی سواری کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ سیاہ شیشوں کے پار اس پر نظر پڑتے ہی مسعود کا پاؤں بے اختیار بریک پر دب گیا۔

اس کی اکارڈ ایک جھٹکے سے رکی، روشنا اپنے قریب گاڑی رکنے پر چونکی اور زہیر اور جازی اسے سامنے دیکھ کر چونکے۔

"لفٹ مس؟" مسعود نے کھڑکی کا تاریک شیشہ ذرا سا نیچے کھسکاتے ہوئے بھاری آواز میں پوچھا۔

"شیور، تھینک یو۔" روشنا اسی کھنکتی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی۔ اس کی آب و تاب اور اس کی متوالی چال ابھی تک ویسی تھی۔

مسعود نے آنکھوں پر گہرے شیشوں کے گلاسز چڑھا لیے تھے، پُرتکلف سوٹ اور چمکتی ہوئی گاڑی نے یقیناً اس کی شخصیت بدل ڈالی تھی۔ روشنا پہلی نظر میں اسے ہرگز نہیں پہچان پائی اور جب پہچانی تو قریب قریب اچھل پڑی۔

"یہ، یہ تم؟" اسے جیسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ گنگ ہو گئی تھی۔

مسعود گلاسز اتارتے ہوئے ایک ادا سے سر کو خم کرتے ہوئے مسکرایا۔

"مسعود۔ ایٹ یور سروس میڈم!" روشنا سے اپنا جوش و خروش چھپانا مشکل ہو گیا۔

"مگر تم یوں۔ یہ سب؟ میرا مطلب ہے، کس کی اُڑا لائے ہو۔" اس نے کار کی چمکتی ہوئی سطح کو چھو کر دیکھا۔ "اور تمہارا تو حلیہ ہی بدلا ہوا ہے۔ لگتا ہی نہیں، تم وہ مسعود ہو۔"

"حالات بہت کچھ بدل ڈالتے ہیں محترمہ!" پچھلی سیٹ سے جازی نے سرد آواز میں کہا۔ روشنا کی نگاہ اب ان پر پڑی تھی۔

"اوہ تو آپ سب ہیں۔ وہی پرانا گروپ۔" زہیر نے تو اسے دیکھتے ہی برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جازی نے البتہ بڑے تحمل کا ثبوت دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ طنز کرنے سے باز نہ رہ سکا۔

"وفاداری بشرط استواری۔ دوستی اور محبت میں خلوص اور وفا شامل ہو تو تب ہی وہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔"

روشنا نے زہیر کا طرزِ عمل دیکھا، جازی کے لہجے کی چبھن محسوس کی تو اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"یہ تو ہے۔ مگر میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ یہ کایا پلٹ کیسی ہے؟ تم لوگوں نے کہیں ڈاکا شاکا تو نہیں ڈالا۔"

"ہم لوگ تو خود لوٹ لیے گئے ہیں۔ ڈاکے کیا ڈالیں گے۔" مسعود نے کہا۔ "تمہیں بتایا تو ہو گا کبھی جازی نے کہ میرے ددھیال والوں نے میری جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب سب کچھ واپس مل گیا ہے اور تمہارے سامنے ہے۔" اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا یا شاید روشنا کو دیکھ کر ہو گیا تھا۔

جازی پہلو پہ پہلو بدلے جا رہا تھا۔ زہیر کی ناگواری بھی عیاں تھی۔

روشنا کا چہرا یوں ہو گیا، جیسے اپنی کسی فاش غلطی کے ادراک نے اسے تہی دامن کر ڈالا ہو۔

"ہاں بتایا تو تھا۔" وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بڑبڑائی۔ پھر زبردستی کی ہنسی ہنس کر بولی۔ "مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ ایک گپ لگی تھی۔"

"اب تو آ گیا یقین؟" مسعود نے قدرے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اپنی آنکھوں سے دیکھ کر"

روشنا نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بیٹھو، کہاں جاؤ گی؟" مسعود کے کہنے پر شاید اسے بھی یاد آیا کہ وہ لفٹ لینے لگی تھی۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

"نن ..... نہیں۔ میرے خیال میں مجھے ییلو کیب آسانی سے مل جائے گی۔"

"ییلو کیب تو پہلے بھی آسانی سے مل سکتی تھی۔"

مسعود ڈھکے چھپے انداز میں چوٹ کرتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "مگر سوچ لو مجھ جیسا خوبرو کار والا پھر آسانی سے نہیں ملے گا۔"

روشنا کچھ لمحے سوچتی رہی پھر بیٹھ گئی۔ "تمہاری باتیں اب بھی ویسی ہیں۔"

"لیکن میں ویسا نہیں رہا؟" مسعود نے کار اسٹارٹ کر ڈالی۔ روشنا نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم تو پہلے سے زیادہ اسمارٹ ہو گئے ہو۔"

"شکریہ۔" مسعود کو واقعی خوشی ہوئی تھی۔ بہت عرصے بعد جازی نے اس کے چہرے پر مسرت کی ایسی بے پناہ چمک دیکھی تھی۔ وہ اور زہیر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پچھلے ڈنک کا زہر ابھی اترا نہیں تھا اور مسعود ایک ہی سوراخ سے اپنے آپ کو دوبارہ ڈسوانا چاہ رہا تھا۔ ورنہ روشنا کو دیکھ کر گاڑی روکنا، اس پر یہ عنایتیں، یہ مسکراہٹیں بے سبب تو نہیں تھیں۔ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو روشنا پر دوسری نگاہ ڈالنا گوارا نہ کرتا۔ بلکہ اس پر پھٹ پڑتا۔ خوب دل کا غبار نکالتا۔ مگر یہ مسعود یوں پیش آیا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اتنے بلند ظرف کا بھی کوئی نہ ہو۔

"تم نے بتایا نہیں، کہاں اترو گی؟" مسعود بڑی ملائمت سے پوچھ رہا تھا۔

روشنا نے اپنے گھر کا پتا بتا دیا۔

"تو میکے آئی ہوئی ہو؟" مسعود نے کہا۔ جازی کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں تو روشنا کو اب اپنے کزن کے پہلو میں لندن میں ہونا چاہیے تھا یا پھر کم از کم یہاں اپنی سسرال میں۔

روشنا نے کوئی جواب نہ دیا۔

چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ گاڑی سبک رفتاری سے سڑک پر پھسلتی رہی۔ اندر کی فضا میں ایئر کنڈیشن کی خنکی اور ایئر فریشنر کی خوشبو رچی تھی۔ جازی نے دیکھا۔ روشنا گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ وہ جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ بار بار وہ چور نظروں سے مسعود کی طرف دیکھ رہی تھی بالآخر جھجکتے ہوئے بولی۔

"مسعود! میرا تو خیال تھا کہ تم لوگ مجھ سے سخت ناراض ہو گے، خاص کر تم۔"

"ناراضی کیسی؟" مسعود لاپروائی سے بولا۔ "میں اتنے چھوٹے دل کا نہیں ہوں اور پھر خاندان کی عزت پر قربان ہونے کا حوصلہ کسی کسی میں ہوتا ہے۔ میرے دل میں تو تمہاری قدر بڑھ گئی تھی۔"

زہیر نے جازی کو کہنی کا ٹھوکا رسید کیا۔ جازی دانت پیسنے لگا۔ "اس مسعود کے بچے میں غیرت نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔ اس کی جگہ وہ ہوتا تو اس لڑکی کو کبھی اپنی گاڑی میں نہ بیٹھنے دیتا۔ خود بیٹھ جاتی تو دروازہ کھول کر باہر دھکیل دیتا۔ کس قدر بھول پن دکھا رہی تھی اور مسعود اس سے کہیں زیادہ بھولا بن رہا تھا۔

روشنا روہانسی ہو گئی۔ "اور اس قربانی کا صلہ مجھے کیا ملا۔ وہ منگنی تو ٹوٹ بھی گئی۔ وہ کمینہ وہاں لندن میں برتن صاف کرتا تھا اور سب کہتے تھے، بہت بڑا بزنس مین ہے۔ روزانہ لاکھوں کی ڈیلنگ کرتا ہے۔ اب میں بیٹھی ہوں اپنے ماں باپ کے گھر۔ کوستی ہوں، انہیں اور اپنی قسمت کو۔"

"ویری سیڈ۔" مسعود افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر جازی کو حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ خوشی کا نعرہ لگا کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دے۔ دوسروں کا دل اجاڑنے والے یونہی اجڑتے ہیں۔ زہیر کی بھی یہی کیفیت تھی۔

"مگر ایک غلط بات کہی ہے تم نے۔ اپنے ماں باپ کو کیوں کوستی ہو، ماں باپ تو اولاد کا بھلا ہی چاہتے ہیں اور قسمت کو کوسنا بھی کم از کم میں پسند نہیں کرتا۔ ہر آزمائش اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔"

مسعود نے کہا تو روشنا آنسو پونچھنے لگی۔ "اب تم جیسا حوصلہ میں کہاں سے لاؤں۔"

"اُدھار مل سکتا ہے۔" مسعود ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے شرارتی انداز میں بولا۔

روشنا مسکرانے لگی۔ "تم کتنے اچھے ہو مسعود! میں اتنی پریشان رہی تھی، تمہارے بارے میں۔ مگر تم جانے کہاں چلے گئے تھے۔"

جازی اس سفید جھوٹ پر ہکا بکا رہ گیا۔ مسعود کے اس کے ماموں کے ساتھ چلے جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنی انا، خودداری کو بالائے طاق رکھ کر روشنا کو فون پر اس کے بارے میں بتایا بھی تھا اور روشنا نے پوری بات سننا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ "خس کم جہاں پاک" کہہ کر سلسلہ ہی منقطع کر دیا تھا۔

عورت کے فریب کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ روشنا عملی طور پر سب دکھا رہی تھی۔ روشنا دوبارہ ملتے رہنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہوئی۔ گاڑی سے اترتے وقت وہ بہت چہک رہی تھی۔

مسعود نے پھر ان دونوں کو ہاسٹل ڈراپ کیا۔ مگر ان دونوں کا موڈ سخت آف تھا۔

"یہ تمہارے منہ کیوں سوجے ہوئے ہیں؟" مسعود جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"تم نے اس خبیث لڑکی کو لفٹ کیوں دی۔ بلکہ اس سے بات بھی کیوں کی۔" جازی ناراض تھا۔

"مائنڈ یور لینگویج یار!" مسعود کو روشنا کے لیے اس کا لب و لہجہ اچھا نہیں لگا۔

"میں اس کے لیے اس سے بھی برے الفاظ بول سکتا ہوں۔" جازی چڑ کر بولا۔ "اور مجھے اس سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ لڑکی اس قابل ہی نہیں کہ اسے منہ لگایا جائے۔ کیا تم بھول گئے کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا؟"

مسعود کے چہرے پر تاریکی کے بادل چھانے لگے۔

"تم نہیں سمجھو گے۔"

"میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔ یہ جان کر کہ اس کا منگیتر لاکھوں کی نہیں برتنوں کی ڈیلنگ کرتا ہے۔ اسے تم یاد آ گئے۔"

"تم نے دیکھا نہیں۔ وہ کس طرح کسی بھی اجنبی سے لفٹ لینے پر تیار تھی۔ ایسی لڑکی کے کیریکٹر کے بارے میں تم کیا کہو گے؟" زہیر نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آج کے بعد سے تم اس سے نہیں ملو گے بلکہ اس کے سائے سے بھی دور رہو گے۔" جازی نے حتمی انداز میں کہا۔

"اور یہی خیال میرا بھی ہے۔" زہیر بولا۔

مسعود نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

"آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے رویے نے اس کی ہمت بڑھا دی ہے۔ اب وہ دوبارہ تمہیں اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرے گی۔ تم میں غیرت ہوتی تو اسے وہیں شوٹ کر دیتے۔ تم نے اس سے بات کرنا گوارا بھی کیسے کیا۔" جازی کو اس پر سخت غصہ آئے جا رہا تھا۔

"عشق میں غیرت، انا، خودداری نہیں ہوتی۔ آدمی بے بس ہو جاتا ہے۔" مسعود بے ساختہ بولا تھا۔

جازی بڑے زور سے چونک پڑا۔

"تو اس کے عشق کا بھوت ابھی تک اترا نہیں اور اور تم کہتے رہے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"سب کچھ ٹھیک ہے اور ٹھیک رہے گا۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" مسعود نے کہا۔

"لیکن بہر حال تم دونوں کا رویہ اس کے ساتھ خاصا نامعقول تھا۔ تمہیں اس طرح کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سارا وقت منہ پھلائے اور مجھے گھورتے رہے۔ جیسے بس چلتا ہو تو جانے کیا کر ڈالو گے۔ کیا سوچتی ہو گی وہ۔"

"کچھ بھی سوچتی رہے۔ تم کیوں فکر میں گھل رہے ہو۔ تمہارا اس سے اب کیا ناتا رہ گیا ہے۔"

مسعود کھسیا گیا۔

"وہ کچھ بھی سوچتی ہو لیکن یہ ضرور جانتی تھی کہ ہم دونوں اس وقت کیا سوچ رہے تھے۔ ہم تم لوگوں کی طرح دوغلے نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے چہرے، اپنے جذبات پر نقاب چڑھانے نہیں آتے۔ ہم سیدھے سادے دیہاتی لوگ ہیں۔ ملک مسعود! جو دل میں ہوتا ہے، وہی منہ پر بھی ہوتا ہے۔" جازی اچھا خاصا جذباتی ہو گیا۔ مسعود کا روشنا کی حمایت میں بولنا اسے سخت برا لگا تھا۔

"تو یار! میں بھی تو دیہاتی ہوں۔ مجھے کیوں خود سے الگ سمجھتے ہو۔" مسعود اس کی خفگی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

"تم ملک ہو۔ ہم کمی، کارندے، تمہارے نہ سہی کسی اور ملک کے سہی۔ تمہارا ہمارا کیا مقابلہ۔ بھلا ہم تمہیں مشورہ دینے والے کون ہوتے ہیں اور تم ان مشوروں کو کیوں سنو گے۔"

"خبردار جو منہ سے آئندہ ایسی بات نکالی۔" مسعود کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تو پھر یہ جان لو کہ ہم تمہارے دوست، تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔ مجھے بتاؤ کیوں تم یہ اداکاری کرتے ہو۔ اس نے تمہارے دل پر چوٹ لگائی۔ اور تم ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتے رہے۔ آئندہ ملنے کے وعدے وعید بھی کر لیے۔ اس فرمائش پر ایک تھپڑ نہیں رسید کیا تم نے اسے۔"

"آخر ہو نا جنگلی، اجڈ، گاؤں کے پینڈو۔ اس حرکت پر اس لڑکی نے میرے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ درج کرا دینا تھا۔" مسعود نے بات کاٹی۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" جازی جھنجھلا گیا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ وہ حسین..... ناگن نئی کینچلی بدل کر آئی ہے۔ یہ وہی تو تھی جس نے تمہیں موت کے قریب پہنچا دیا تھا۔ اگر تمہارے ماموں، مامی کی محبت نہ ہوتی یا میرے اور زہیر جیسے دوست نہ ہوتے تو تم نے تو اس کے فراق میں خودکشی کر لینا تھی۔"

مسعود چپ سا ہو گیا۔ مگر پھر اگلے لمحے سنبھل کر پھر اسی چونچال موڈ میں آ گیا۔ اس نے جازی کی پشت پر ایک دھموکا جڑ ڈالا۔

"یہ تمہاری اپنے بارے میں خوش فہمی کبھی نہ جائے گی۔"

"ناں۔ یہی تو تیری دوستی کا دیا ہوا مان ہے۔" جازی نے کہا تو مسعود نے بے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا۔

* * *

وہ دونوں اپنی بھرپور کوشش کے باوجود مسعود کو روشنا سے ملنے سے نہ روک سکے۔ ان کا سمجھانا بجھانا سب بے کار گیا۔ ساری نصیحتیں بودی ثابت ہوئیں۔ مسعود ہوں ہاں میں سر ہلاتا مگر روشنا کی ایک ہی ٹیلی فون کال پر بے خودی کی حالت میں اس کے پیچھے نکل کھڑا ہوتا۔ روشنا نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں اتری تھی۔ تین سال کے اس عرصے نے اس کی اداؤں کو نکھار دیا تھا۔ اس نے دل لبھانے کے نئے نئے طریقے سیکھ لیے تھے۔ وہ دلوں کو گھائل کرنے میں پختہ کار ہو چکی تھی۔ اپنے حسن میں معصومیت اور بانکپن کا امتزاج کر کے اس نے اسے دو آتشہ بنا ڈالا تھا۔

* * *

ڈھٹائی کی حد تو یہ تھی کہ اسے زہیر اور جازی کی ناگواری اور ناپسندیدگی کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ جازی سے تنہائی میں ملی اور بڑی سہولت سے جتایا کہ مسعود کو ٹھکرا کر اس نے جو غلطی کی تھی۔ وہ اب اس کی تلافی چاہتی ہے۔ جازی کو اگر اپنے دوست کی خوشیاں واقعی عزیز ہیں تو وہ ان دونوں کی راہ روکنے سے گریز کرے۔

"مسعود میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" وہ بڑے غرور سے بولی تھی۔

"وہ تو پہلے بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر دیکھ لو، رہ گیا اور خاصا ہنسی خوشی رہتا تھا۔" جازی جلا بیٹھا تھا۔

"وہ سب دکھاوا تھا۔ وہ اندر سے میرے بغیر اداس تھا۔"

"یہ دکھاوا کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ اس کے ماموں اس کے لیے ایک اچھی سی نیک لڑکی دیکھ کر رشتے کی بات چلا چکے ہیں۔ اور مسعود ہامی بھر بھی چکا تھا۔" جازی نے اطلاع بہم پہنچائی۔

مسعود کے ماموں واقعی اب اس کا گھر بسانے کے لیے سنجیدہ تھے اور ایک اعلا خاندانی گھرانے میں اس کی بات چلا رہے تھے۔ انہوں نے مسعود کی رائے چاہی تو

مسعود نے سارے اختیار ان کے ہاتھ میں دے دیے تھے مگر تب روشنا دوبارہ مسلط نہیں ہوئی تھی۔ اب جازی چاہتا تھا کہ یہ رشتہ جلد از جلد طے پا جائے۔ بیوی گھر آجاتی تو مسعود بھٹکنے سے بچ جاتا۔ اپنے محل نما گھر کی تنہائی، اپنے دل کی ویرانی اور پیار کی تشنگی ہی اسے دوبارہ روشنا کی طرف مائل کر رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" روشنا چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح ہو گئی۔

"مسعود کو اپنے ماموں کی طرف سے ایسا جذباتی سہارا ملا ہے کہ وہ کبھی ان کی بات ٹھکرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور یہ تو اس کے ماموں کی عزت کا معاملہ ہے۔ وہ زبان دے چکے ہیں۔" جازی، مسعود کے مزاج و خیالات سے واقف تھا۔ وہ احسان کرنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔

"مگر مسعود میرے لیے ساری دنیا ٹھکرا سکتا ہے۔" روشنا پورے یقین سے بولی۔

"کاش کہ روشن بی بی! تم نے بھی اس کے لیے اپنے کزن کی دولت کو ٹھکرا دیا ہوتا۔"

جازی نے کہا تو روشنا کا چہرا طرح طرح کے رنگ بدلنے لگا۔

"آپ مسعود کے گہرے دوست سہی مگر مجھ پر طنز کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔" وہ غصے سے اٹھ کر چلی گئی۔

پھر شاید اس نے مسعود کو جازی کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ زہیر تو یوں بھی دوسروں کے ذاتی معاملات میں زیادہ دخل دینے کا قائل نہیں تھا۔ مگر جازی مسعود کو غلط راستے پر جاتا دیکھ کر ٹوکے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ مسعود اکھڑا اکھڑا رہنے لگا ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت اب روشنا کی سنگت میں ہی گزرتا تھا۔ وہ مسعود کی مختلف کاروں میں اس کے ہمراہ اڑی اڑی پھرتی تھی۔ اس کے پاس قیمتی ملبوسات اور جیولری کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ مسعود اب بھی وہی شاہ خرچی دکھا رہا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے موقع پر وہ روشنا کو تحائف سے نوازنا نہ بھولتا تھا۔

جازی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسعود کی عقل کیوں سلب ہو گئی ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ روشنا کے پیچھے پاگل تھا۔ اس پر بے دریغ پیسہ لٹا رہا تھا۔ خدا جانے اس کی حمیت کہاں جا سوئی تھی۔

جازی نے جب بھی سمجھانا چاہا۔ وہ بات ہی ٹال جاتا۔ آخر اس روز جازی کے سر ہونے پر صاف صاف بولا۔

"وہ میری پہلی محبت ہے اور پہلی محبت بھلائی نہیں جاتی۔" یہ صاف اور کھلا اعتراف تھا کہ وہ اپنی راہیں جدا نہیں کر سکتا۔

"مگر اسے تم سے نہیں، تمہاری دولت سے پیار ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔" زہیر بھی دبی دبی زبان سے کہے بغیر نہ رہ سکا۔ آخر وہ بھی مسعود کا خیر خواہ تھا۔ اس سارے قصے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دنیا میں کیا ایک دولت مند میں ہی رہ گیا ہوں۔"

"دوسرے شاید اس کی دسترس میں نہ ہوں یا یوں تمہاری طرح جانتے بوجھتے بے وقوف بننے پر تیار نہ ہوں۔" جازی نے کہا تو مسعود ایک دم بھڑک اٹھا۔

"اعجاز، ایک تو تمہاری ہر وقت کی روک ٹوک مجھے زہر لگتی ہے۔ ہر وقت مجھے سبق پڑھاتے رہتے ہو۔ اپنے کسی فعل کا اختیار مجھے بھی ہونا چاہیے یا بس چابی کے گڈے کی طرح تمہارے اشاروں پر چلتا رہوں۔"

اس کے منہ میں یقیناً" روشنا کی زبان بول رہی تھی۔ جازی برا مان سکتا تھا۔ مگر اس نے برا نہیں مانا۔ اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تو تھی، لیکن وہ ضبط کر گیا۔ اسے اس کیفیت کا اندازا تھا جس سے مسعود گزر رہا تھا۔ متضاد کیفیتوں نے مسعود کو زود رنج اور تلخ بنا دیا تھا۔

"تم تو اسے بھول چکے تھے۔"

"کچھ نہیں بھولا تھا میں۔" مسعود نے کہا۔

"مصیبت تو یہی ہے کہ میری یادداشت بہت اچھی ہے، سب کچھ یاد تھا مجھے۔"

"تو پھر غالباً" مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت بھی نہیں کہ تمہارے ماموں تمہاری منگنی کی تیاریوں میں لگے ہیں۔" جازی نے کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میری منگنی میری پسند سے ہوگی۔"

"روشنا سے؟" جازی کے منہ سے پھسلا۔

مسعود کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ میں نے کب کہا؟"

"تمہارے سارے انداز یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ تم پھر سے اس کی محبت میں مبتلا ہو۔"

"تو پھر ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن یہ پھر سے کیوں۔ میں تو اسی سے محبت کرتا تھا۔" مسعود نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ تو زہیر اور جازی مترحم نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

اب کوئی جانتے بوجھتے آگ میں ہاتھ ڈالنا چاہے تو دوسرا کیا کر سکتا تھا۔

روشنا کا کردار ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح مسعود کے سامنے تھا۔ اس کی غربت کا حوالہ دے کر روشنا کا اپنے لندن پلٹ کزن کے لیے اسے ٹھکرانا اور اب پھر یوں اس کی امارت دیکھ کر پینترا بدل ڈالنا۔ مسعود کوئی بچہ تو نہیں تھا کہ اس بارے میں غور کرنے کی زحمت ہی نہ کرے۔ اب جب اس کے باوجود وہ روشنا سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ روکنے والے کون ہوتے تھے۔

اس کے انداز صاف ظاہر کرتے تھے کہ وہ اب ان کا اپنے اعصاب پر مسلط ہونا پسند نہیں کرتا۔ زہیر اور جازی نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی کہ مسعود سے میل ملاپ میں کمی کر دی۔ مسعود اپنی دنیا میں مست تھا۔ اس نے غالباً" ان دونوں کا گریز محسوس بھی نہیں کیا۔ وہ دونوں مسعود کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتے رہے۔

ادھر مسعود، روشنا کو لیے شادی کی شاپنگ کرتا پھر رہا تھا۔ وہ ہزاروں بے دریغ لٹا رہا تھا۔ روشنا نے ایک سے ایک قیمتی شے پسند کی تھی۔ ایک بار وہ دونوں اپنی خریداری انہیں دکھانے بھی آئے۔ روشنا کھلی جا رہی تھی۔ اتنی قیمتی خوب صورت چیزوں کا تو اس نے زندگی میں تصور بھی نہ کیا تھا۔ مسعود اس کی خوشی دیکھ دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا رہا۔ روشنا اپنے پروگرام بتا رہی تھی کہ انہوں نے شادی کس طرح ارینج کرنے اور ہنی مون ٹرپ پر کہاں جانے کا پلان بنایا ہوا ہے۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ سب خواب ہے۔" وہ وفور مسرت سے بار بار کہہ رہی تھی۔

زہیر اور جازی کو اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر مسعود کی شادی کہیں اور ہو رہی ہوتی تو ان کے جوش و خروش کا عالم ہی نرالا ہوتا۔ مگر اس وقت تو انہیں یہی لگ رہا تھا کہ مسعود جانتے بوجھتے کھائی میں چھلانگ لگا رہا ہے۔ مسعود کے بازو سے چپکی کھڑی روشنا کا چھچھورپن انہیں ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ ان کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر وہ مسعود کے گلے کا ہار بن جاتی تھی۔ مزے لے لے کر اپنے عروسی جوڑے اور اپنے ہونے والے ہنی مون کا ذکر چھیڑتی تھی۔

ان دونوں نے بجھے ہوئے دل سے انہیں شادی کی پیشگی مبارک باد دی۔

مسعود شادی کے کارڈز کے رنگ اور ڈیزائن کے سلسلے میں ان سے مشورے لے رہا تھا۔ جازی کا دل خاک ہوا جاتا تھا۔ جو اپنی دلہن کے سلسلے میں ان کے سارے مشورے رد کرتا گیا ہو، اسے کارڈ کے سلسلے میں کیا مشورہ دینا۔ اس نے مسعود کے پسند کیے ہوئے کارڈ کی ہی تائید کر دی۔

اسے لگتا تھا مسعود کی شادی ان کی دوستی کا دی اینڈ بھی ہوگی۔ اول تو روشنا انہیں قطعی پسند نہیں کرتی اور مسعود سے اس ساری بے تکلفی اور شادی کی شاپنگ دکھانے کا مقصد یہی جتانا تھا کہ وہ مسعود کو ہمیشہ کے لیے جیت چکی ہے۔ اور پھر مسعود بھی تو انہیں دودھ سے مکھی کی طرح باہر نکال چکا تھا۔ آنے والے وقت کا اندازا ابھی کے رویوں ہی سے لگایا جا سکتا تھا۔

روشنا اور مسعود کے چلے جانے کے بعد وہ دونوں

کتنی ہی دیر خاموش اپنے اپنے پلنگ پر پڑے رہے۔

مسعود سے پھر کئی دنوں تک ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں الجھا ہوا تھا۔

* * *

پھر اس روز سویرے ہاسٹل سے نکلنے سے پہلے روشنا کے فون نے جازی کو حیران کر دیا۔ روشنا اسی وقت اس سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اس کے مضطرب لب و لہجے نے جازی کو الجھا ڈالا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ انکار کرے یا اقرار۔ بھلا روشنا کو اس سے ایسا کیا کام ہو سکتا تھا۔ بہرحال اس نے پوچھا۔

"مجھے کہاں آنا ہو گا؟"

"میں اسی فلیٹ سے بول رہی ہوں جو مسعود نے مجھے لے کر دیا ہے۔" روشنا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پلیز تم فوراً" یہاں آجاؤ' مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔"

جازی کا دل دھڑک اٹھا۔

"خیریت تو ہے مسعود کہاں ہے؟"

مگر روشنا فون رکھ چکی تھی۔ جازی کے پاس سوچ بچار کی مہلت نہ تھی۔ روشنا کے انداز نے اس کے دل میں کھٹک پیدا کر دی تھی۔ وہ مسعود کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔

فلیٹ کا پتا اس کے علم میں تھا۔ یہ مسعود کی بے شمار عنایتوں میں سے ایک تھا۔

کچھ ہی دیر میں جازی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل ہوا کے دوش پر اڑاتا آیا تھا۔ دروازہ پہلی ہی کال بیل پر کھل گیا۔ اس کے سامنے روشنا اجاڑ حال کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ آنکھیں متورم تھیں۔ کپڑے بھی ملگجے ہو رہے تھے' ورنہ وہ ہمیشہ سے بنی سنوری رہنے کی عادی تھی۔

جازی دھک سے رہ گیا۔

"مسعود؟"

روشنا دروازے سے ہٹ چکی تھی۔ اندر مسعود کی مانوس خوشبو رچی تھی مگر مسعود نہ تھا۔ وہ بے اختیار روشنا کے پیچھے بیڈ روم تک آگیا۔

بیڈ کی ریشمی چادر پر گلاب کے پھولوں کی مسلی ہوئی پتیاں بکھری تھیں۔ مسعود وہاں بھی نہیں تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سرخ و سنہری رنگ کا دمکتا ہوا۔ شادی کارڈ پڑا تھا۔ روشنا نے بغیر کچھ کہے وہ کارڈ اسے تھمایا اور بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر سسکنے لگی۔

جازی نے کارڈ کھول کر جلدی جلدی نظریں دوڑائیں سنہرے حروف نے اطلاع پہنچائی کہ ملک مسعود احمد ولد ملک فتح محمد کی شادی خانہ آبادی طے پائی تھی یہ تقریب سعید اگلے ہی ہفتے منعقد ہو رہی تھی۔ مگر دلہن کا نام جازی کے لیے سراسر اجنبی تھا۔ وہ الجھی الجھی نظروں سے روشنا کو دیکھنے لگا۔ یہ معما اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"مسعود اس لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ جو اس کے ماموں نے اس کے لیے منتخب کی تھی۔" روشنا نے روہانسے انداز میں بتایا۔ اس کا چہرا آنسوؤں سے تر تھا۔

"یہ سب بہت پہلے سے طے تھا اور وہ مجھے دھوکے میں رکھ کر میرا مذاق اڑاتا رہا۔ مجھے جھوٹے خواب دکھا کر لطف اندوز ہوتا رہا۔"

بے اختیار جازی کا دل چاہا کہ وہ "یاہو" کا زوردار نعرہ لگا کر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اس کے ہر ایک انگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ مسعود تو واقعی بڑا استاد نکلا۔ روشنا ہی کیا وہ خود بھی تو دھوکے میں رہ گئے تھے۔ مسعود غالباً" انہیں بھی سرپرائز دینا چاہتا تھا اور وہ اتنے بدگمان ہو گئے کہ اتنے دنوں پلٹ کر اس کی خیریت تک دریافت نہ کی۔ حالانکہ شادی کی تاریخ سر پر کھڑی تھی۔ تاریخ تو نہ بدلی تھی۔ دلہن البتہ بدل گئی تھی۔

اس کی کیفیت روشنا سے چھپی نہ تھی۔ وہ دکھ سے بولی۔ "تمہیں خوشی ہوئی ہے۔ ضرور ہونی چاہیے۔ تم تو خود یہی چاہتے تھے مگر میں... میرا کیا ہو گا۔ میں مسعود سے محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

جازی کے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔

"یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔"

یہ جملہ ایک پرانی بازگشت بن کر ذہن میں ابھرا تھا اور ہونٹوں پر آگیا تھا۔ روشنا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"یہ سچ ہے۔ خدا کی قسم۔"

"وہی پرانا مکر' پرانا ہتھیار۔ مگر مسعود اب یہاں کہاں۔" جازی کا جی چاہ رہا تھا۔ جا کر مسعود کی پیٹھ ٹھونک ڈالے۔ روشنا آخر وقت تک خوش فہمی میں مبتلا رہی تھی کہ مسعود کی ہونے والی دلہن وہی ہے۔ مگر مسعود اتنا بے وقوف نہیں نکلا تھا۔ جتنا کہ دکھائی دیتا تھا۔

"مسعود نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اس نے میرے سارے خواب نوچ ڈالے۔ وہ میرے ساتھ اپنی دلہن کے لیے خریداری کرتا رہا اور مجھے پتا بھی نہ چلا۔" روشنا رو رہی تھی۔

"اس نے مجھے برباد کر دیا۔ میں اپنے گھر والوں کو' اپنے خاندان والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ جو وہ کہتا تھا۔ میں مانتی گئی۔ اس کے ساتھ اس فلیٹ میں رہنے پر بھی تیار ہو گئی۔ اور اب' اب اس نے بتایا کہ یہ فلیٹ بھی کرائے کا ہے۔ مجھے جلد ہی خالی کرنا ہے۔ اب میں کہاں جاؤں۔"

جازی کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس کی مسکراہٹ دم توڑنے لگی۔ روشنا اگر رونے کی اداکاری بھی کر رہی تھی تو یہ نہایت اعلا پائے کی اداکاری تھی۔

"کل رات بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ تب بھی اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ بس بات بات پر ہنستا رہا۔ ہنستا ہی رہا۔ مجھے اس کی ہنسی سے خوف آرہا تھا۔"

جازی کو مسعود کی وہی مخصوص عجیب پُراسراری مسکراہٹ یاد آگئی۔ جو ان دنوں اس کے ہونٹوں پر کھیلا کرتی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کی وہ چمک جو اسے اجنبی سا روپ دے جاتی تھی۔ وہ یکسر بدلا ہوا دکھائی دینے لگتا تھا۔

"اور آج' آج صبح اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔ وہ تین سالوں تک انتقام کی آگ میں جلتا رہا تھا۔ وہ مجھ پر خوب ہنسا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے لیے ان مسلے ہوئے پھولوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوں۔ میں نے اس کا راستہ روکا' روئی' منت کی۔ اس کے قدموں تک میں گر پڑی۔ مگر وہ نہیں رکا۔ اعجاز! وہ تمہارا دوست ہے' تمہاری بات ضرور مان لے گا۔ خدا کے لیے اسے واپس لے آؤ۔ مجھے اس کی دولت نہیں چاہیے۔ میں صرف مسعود کو چاہتی ہوں۔ کبھی میں نے اس سے جھوٹی محبت کی تھی... مگر اب نہیں۔" روشنا کی تڑپ اس کے آنسوؤں کی صداقت کی گواہی دینے لگی تھی۔

جازی گومگو ہو گیا۔

"اسے سمجھاؤ۔ اس سے کہو کہ میں بری ضرور تھی مگر ایسی نہیں تھی۔ جو اس نے مجھے بنا دیا ہے۔ لوگ مجھے کیا نام دیں گے۔ میں نے تو اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیا۔ اس کے انتقام کی یہ آگ مجھے خاک کر گئی ہے۔ میری مدد کرو اعجاز! وعدہ کرو' تم اسے واپس لے آؤ گے۔ وہ آئے گا ناں؟ تمہاری بات مان لے گا ناں؟" وہ بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔

جازی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ روشنا کی حالت زار پر خوشی کا اظہار کرے۔ یا کہ افسوس کا۔

اس کی تو یہ ہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ روشنا اس سلوک کی مستحق تھی یا نہیں؟

مسعود اپنا انتقام پورا کر کے شادیانے بجانے میں حق بجانب تھا یا نہیں؟

اس نے روشنا کے ساتھ اچھا کیا یا برا؟

اس کے بنائے ہوئے میزان نے روشنا کے لیے صحیح فیصلہ دیا یا نہیں؟

یہ مسعود کی مردانگی تھی یا اس کی کم ظرفی؟

وہ بس خاموش کھڑا کارڈ میں منہ دیے بلکتی ہوئی روشنا کو دیکھتا رہا۔

نایاب جیلانی

بادلوں کے پیچھے

باہر چمکتی دھوپ کا راج تھا۔ گرم لو کے تھپیڑوں نے گویا ہر شے کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا میرا دل سینہ توڑ کر گرم اور جھلسا دینے والی زمین سے لپٹ لپٹ کر بین کر رہا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے مما مجھے بہت سمجھاتی بجھاتی رہی تھیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ۔ مگر میں انہیں بھلا کیا بتاتی۔ میرا دل تو آتش کدہ بنا ہوا تھا۔ میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنا دی گئی تھی۔ میرے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا خودکشی کے برابر تھا۔

آج آٹھواں دن تھا اور مجھے لگتا تھا گویا میں صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ میرا انگ انگ تھکن زدہ تھا۔ آنکھیں گویا رو رو کر تھک چکی تھیں۔

میں بھلا کس کا گریبان پکڑتی، کسے مجرم ٹھہراتی۔ میری بات پر بھلا کس نے ایمان لانا تھا۔ میں مما کو کچھ بتا ہی تو نہیں پائی تھی۔ بھلا بتاتی بھی کیا؟ یہ میرا اپنا ہی تو فیصلہ تھا۔ مما نے مجھے کس قدر سمجھایا تھا مگر میں اپنی سادگی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔

مجھے چہرے پڑھنے کا دعوا تو کبھی نہیں رہا تھا مگر میں حیران تھی کہ بعض لوگ کس طرح صورت بدل بدل کر سامنے آتے ہیں۔ ہر دفعہ ان کا نیا چہرہ نظر آتا تھا۔

مکمل ناول

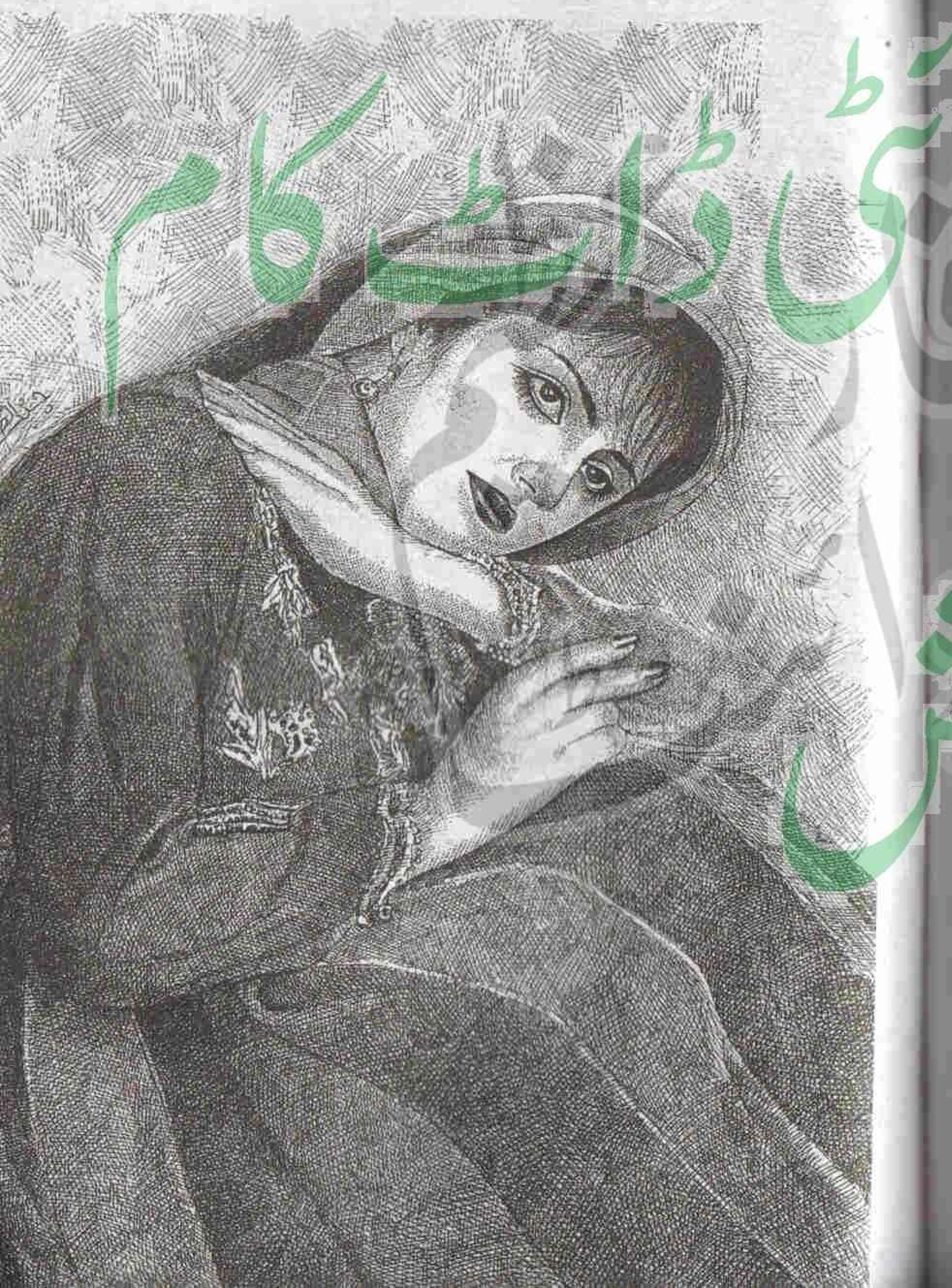

ایسا چہرہ جو کسی بھی سادہ دل رکھنے والے کو دھوکے میں مبتلا کر سکتا تھا۔

میری سادگی میرے لیے ہمیشہ نقصان کا باعث بنی تھی مگر اس دفعہ تو میرے دل کا نقصان ہو گیا تھا' یوں لگتا تھا گویا کسی نے میرا دل نوچ کر کسی پتھر کے نیچے رکھ کر کچل دیا ہے۔

مجھے اس سے بے تحاشا محبت جو ہو گئی تھی اور میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بھی اس طرح کسی اور کی جھوٹی داستان سن کر بدگمان ہو جائے گا۔ اس کی بدگمانی کے گھاؤ نے میرے دل میں نیزے اتار دیے تھے۔

مگر میرے ساتھ بھلا ہوا کیا تھا ؟

* * *

ان دنوں میرے ستارے گردش میں تھے۔ نجانے کس منحوس گھڑی میں دو ماہ سے ڈیڈ پڑا فون خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا اور مما تک یہ منحوس خبر بغیر کسی دشواری کے پہنچ چکی تھی۔ سدا کی کمینی "فسادن اور بلا کی کم ظرف غانیہ کے ہلکے پیٹ میں میرے یعنی ساحیہ مراد کے متعلق "خبر" بھلا کیسے ٹھہر سکتی تھی مما کو فون کھڑکا کر میری شاندار کامیابی کی اطلاع پہنچا دی تھی۔

"خالہ! ساحی میٹرک میں ہیٹ ٹرک مار چکی ہے۔ اس مرتبہ بھی سابقہ ریکارڈ قائم رکھا ہے محترمہ نے۔ خیر سے صرف تین مضمون کلیئر کر سکی ہیں۔ باقی سب میں گول انڈا، لگتا ہے پرچوں میں نہاری' جلیبی' اور گلاب جامن کی ترکیب لکھ کر آئی تھی۔"

فون تو بند ہو چکا تھا اور مما جوتے سے میری دھنائی کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھی ہانپ رہی تھیں۔ غم و غصے سے ان کا سرخ و سفید چہرہ تمتما رہا تھا۔ سبز آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر میری پیاری مما کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔

"بے شرم! چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ انیس سال کی ہو چکی ہو۔ ابھی تک میٹرک میں اٹکی ہو۔ تمہارے ساتھ کی گریجویشن اور ماسٹرز کر کے دو دو بچے بھی کھلا رہی ہیں۔"

"آپ کی سستی کی وجہ سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ ورنہ اس وقت آپ بھی نانو بن چکی ہوتیں۔" میں نے افسوس کے عالم میں مما کو گزرتے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ مما جلبلا کر دوسرا جوتا اتارنے لگیں۔

"سوری مما!" میں فوراً" صوفے کی اوٹ میں کشن اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مما میری بے حیائی کے اس عظیم مظاہرے کو ملاحظہ کرنے کے بعد نجانے کس سوچ میں گم ہو چکی تھیں۔

میری نظریں مما کے خالی پیروں پر تھیں۔ سو میں اطمینان سے صوفے پر ڈھے گئی۔ عام حالات میں وہ جوتے کے ساتھ پھینٹی لگانا مینرز کے خلاف سمجھتی تھیں۔ عام حالات میں تو محض مجھے گھوریوں سے ہی نواز دیا جاتا تھا۔ اور مما کی گھوریوں کا اثر ہی اس قدر ہوتا تھا کہ میں فوراً" ہی حواس باختہ ہو جاتی۔ اگرچہ مما کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میری جوتے کے ساتھ دھنائی کریں مگر خیر سے "معاملہ" ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بھی کہاں تک ضبط کرتیں۔

میٹرک میں مجھے تیسرا سال لگ چکا تھا۔ میری کلاس فیلوز اور کزنز وغیرہ مجھ سے کہیں آگے نکل چکی تھیں' مگر میں اپنے کند ذہن کو بھلا کہاں سے پالش کراتی اور پھر سائنس دانوں کی "بکواس" میرے دماغ میں سماتی ہی نہیں تھی۔ نجانے کتنے ہی ٹیوٹر میری نالائقی سے گھبرا کر دوسرے ہی دن بھاگ گئے تھے۔ مجھ جیسی کند ذہن' نالائق' کوڑھ مغز کے ساتھ بھلا دماغ کھپانے کی ضرورت ہی کیا تھی' جسے طبیعات کے تعارف کی الف' ب بھی نہیں آتی تھی۔

باقی مضامین میں بھی میری دلچسپی ایویں سی تھی۔ ریاضی کو دیکھ کر تو مجھ پر زلزلہ طاری ہو جاتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں یہی کوئی چار پانچ ماہ پہلے فزکس کی تیاری کرواتے ہوئے' میری جان سے پیاری غانیہ نے اچانک میری ذہانت کو جانچنے اور جو کچھ پڑھایا تھا' اس کا ٹیسٹ لینے کی غرض سے پوچھا۔

"ساحی! دس منٹ کے اندر اندر جواب دیتی جانا' آج تمہیں پڑھا کر میں نے اسود کی طرف جانا ہے۔ وہ میرے لیے کافکا اور چیخوف کی کتابیں لے کر آیا ہے۔ اور میں وہ کتابیں پڑھنے کے لیے سخت بے چین ہو رہی ہوں۔"

غانی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ان فضول کتابوں کے نام لے کر گویا پوری چوری اور خطائی کا ذائقہ اس کے منہ میں گھل گیا تھا۔ میرے منہ کے زاویے اسود کا نام سن کر ہی بننے' بگڑنے لگے تھے۔ منہ میں گویا کڑوے بادام آ گئے۔ حالانکہ یہ چاکلیٹی ہیرو جیسا کزن فرینڈز کے درمیان گردن اکڑانے اور دوستوں کے درمیان ویلیو بنانے کا سبب تھا۔

"چھوڑو بھی غانی! جس رائٹر کا نام ہی اتنا خوف زدہ کر دینے والا ہو۔ اس کی تصنیف کتنی بکواس ہو گی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا چیخوف ..... یعنی نرا خوف ہی خوف۔ اور یہ فرانز کافکا۔ ایسے لگتا ہے۔ جیسے پرانز اور کانٹے یعنی فورک کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ہائے غانی! مجھے تو بھوک بھی لگ گئی ہے۔" میں نے پیٹ پکڑ کر دہائی دی تو غانی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میرے سر پر دے ماری۔

"بھوسا بھرا ہوا ہے یہاں۔" کتاب کے وزن سے میرے دماغ کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ اوپر سے غانیہ کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

"تمہیں ٹھیک ہی باورچن' دھوبن اور درزن کا خطاب دیا گیا ہے۔ تمہارا دماغ پڑھنے کی طرف نہیں مائل ہونے والا۔ پکانے اور کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ کھا کھا کر ایک دن غبارے کی طرح پھٹ جاؤ گی۔ موٹی!" غانی میری اچھی صحت پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتی تھی اور کھانا پکانے کے طعنے دینا تو مما اور ان کی پیاری بھانجی غانی کا دیرینہ مشغلہ تھا۔ میں نے تو اکثر ہی ماؤں کو آہیں بھرتے دیکھا ہے کہ ان کی بیٹیاں کچن کے نام سے ہی دور بھاگتی ہیں۔ سینے پرونے کا بھی کوئی شوق نہیں ہوتا۔ گھر کے کام کاج سے الرجک ہوتی ہیں جبکہ مجھ میں سگھڑ خواتین والے سارے جراثیم پائے جاتے تھے۔ مگر میرے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر مما تنتنا اٹھتی تھیں۔

"کبھی اسی شوق اور جذبے سے کتاب بھی پکڑ لیا کرو۔" یہ طعنہ تو مما کی نوک زباں پر ہر وقت مچلتا رہتا تھا۔ نجانے مما بھی کیسی ماں تھیں۔ یعنی میں جو ایکسٹرا میڈ کی خدمات سر انجام دیتی تھی۔ ان کی مما کے نزدیک اس کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔

"ساحیہ مراد! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ علم موسیقی اور آواز پر سائنسی دریافتیں کرنے والے سائنس دان کا نام بتاؤ جو کہ تیسری صدی ہجری میں بصرہ میں پیدا ہوا تھا۔" مجھے سوچوں میں الجھا دیکھ کر غانی نے کافی ناراضی کے عالم میں اپنا سوال دہرایا۔

"تیسری صدی ہجری میں کون پیدا ہوا تھا؟" میں نے یادداشت کے سارے خانے کھنگالنے شروع کر دیے تھے۔

"کون سی ایسی کھانے والی چیز کے نام سے ملتا جلتا نام تھا۔ علم موسیقی کو دریافت کرنے والے سائنس دان کا....." میں زیر لب بڑبڑاتے ہوئے سخت ٹینشن میں مبتلا ہو چکی تھی۔

"ساحی! غانی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اور میرے منہ سے اچانک نغمہ برآمد ہوا۔ "شکر قندی' یعنی الکندی۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم ..... ایک سوال کے جواب میں پندرہ منٹ برباد کر دیے ہیں۔ پیپر میں نجانے تم کیا کرو گی۔" غانی درست جواب سن کر بھی منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

"سوری غانی!" میں نے بھی غلطی تسلیم کر کے معافی مانگنے میں دیر نہیں کی تھی۔

"آخری جواب بتاؤ' پھر جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔ ویسے بھی "کھیر" لگنے والا ہے۔" غانی میری دلی کیفیات سے واقف تھی۔ تب ہی تو میرے فیورٹ ڈرامے کا ذکر کیا تھا۔

"پوچھو" میں نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔

"حالت سکون سے چلنے والی کار کی ابتدائی ولاسٹی کتنی ہوتی ہے؟؟"

"یہ ولاسٹی صفر ہوتی ہے۔" میں نے بھی نظر بچا کر کتاب میں سے اچک کر دیکھا اور جھٹ سے جواب بھی دے دیا تھا۔ غالی کون سا میری طرف متوجہ تھی۔ اپنا ہینڈ بیگ کھولے ببل کا پیکٹ نکال رہی تھی۔ سو میرا بھی کام چل گیا اور آج ان ہی چھوٹی مٹی "چوریوں" کا خمیازہ فیل ہونے کی صورت میں بھگت رہی تھی۔

مما نے کافی سوچ بچار کرنے کے بعد سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا اور پھر بولیں۔

"ساحیہ! کتابیں سمیٹ کر نیچے آجاؤ۔ میں تمہاری پیکنگ کرنے لگی ہوں۔"

"مگر کیوں مما!" میں حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھی۔

"تم نبیلہ کے پاس جارہی ہو۔" انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"پھوپھو کے پاس مگر کیوں؟؟" اپنی ہٹلر ٹاپ پھوپھو کے پاس جانے کے متعلق سوچ کر ہی میں لرز اٹھی تھی۔

"اس لیے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

"مما پلیز!" میں منمناتی رہ گئی تھی۔

* * *

"ڈیڈی! مما مجھے اسلام آباد بھجوانے لگی ہیں۔" ڈائننگ روم میں گھستے ہی میں نے دہائی دینا شروع کردی تھی۔ تائی امی یعنی بڑی مما اور ڈیڈی (تایا ابو) آدھا گھنٹہ پہلے ہی گھر آئے تھے۔ دونوں عماد بھائی کے بیٹے کو دیکھنے کراچی گئے ہوئے تھے۔ عماد بھائی ڈیڈی کے اکلوتے بیٹے تھے اور میں اپنے پاپا اور مما کی اکلوتی بیٹی۔ بس یہی ہمارا مختصر سا خاندان تھا۔

عماد بھائی مجھ سے پندرہ سال بڑے تھے۔ ان کی شادی کو نو سال ہونے والے تھے اور ان کے ہاں تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے دو ماہ بعد بڑی مما اور ان کی واپسی آج ہی ہوئی تھی۔ اور میرے فیل ہوجانے والے کارنامے کے متعلق بھی انہیں پتا چل چکا تھا۔

"سائرہ! ہماری بیٹی کو اتنی دور مت بھجواؤ۔ بھلا اس چہکتی مینا کے بغیر ہم رہ پائیں گے۔" ڈیڈی فوراً جذباتی ہوگئے تھے۔

"بھائی جان! اس نالائق کو نبیلہ ہی سدھار سکتی ہے۔ شاید میٹرک میں یہ پاس ہو ہی جائے۔" مما بھی جذباتی ہوگئی تھیں اور مجھے بھی کردیا تھا۔

"مجھے آرٹس پڑھنے دیتیں تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔"

"زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔ دماغ کو بھی کبھی زحمت دے لیا کرو۔" مما کو میرا بیچ میں بولنا قطعاً نہیں بھایا تھا۔

"سائرہ! ساحی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بچے کا شوق اور دلچسپی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" ہمیشہ کی طرح پاپا اور ڈیڈی میری حمایت میں بولے تھے۔

"آپ کی ان ہی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔" مما کا موڈ آف ہوچکا تھا۔ میں نے بمبئی بریانی اور تکہ بوٹی سے خوب انصاف کیا اور دعا پڑھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہر صورت مجھے اسلام آباد جانا تھا اور آج کی رات میں جی بھر کر سونا چاہتی تھی۔ بدقسمتی سے میں مما اور پاپا کی اکلوتی اولاد تھی۔ اگر ان کے اور بھی تین چار بچے ہوتے تو شاید مما کی توجہ بٹ جاتی۔ مگر ہمارے خاندان میں بچوں کا فقدان تھا بلکہ قحط کہنا مناسب ہوگا۔

اللہ بخشے دادی مرحومہ جب زندہ تھیں تو مما اور بڑی مما کی ہر وقت شامت آئی رہتی تھی۔ انہیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ ان کی اولاد کی بہت کم اولاد ہے۔ بڑی مما ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ اسی لیے ان کی کچھ بچت ہوجاتی تھی۔ البتہ میری مما پر تو دادی کا اکثر و بیشتر عذاب نازل ہوتا رہتا تھا۔

"سائرہ نے اس "شیرنی" کو پیدا کرکے گویا کے ٹو کا پہاڑ سر کرلیا ہے۔" دادی بھی میری اچھی صحت سے خاصا جلتی تھیں۔ یہی حال نبیلہ پھوپھو کا تھا۔

"دماغ کو زحمت جو نہیں دیتی۔ اسی لیے گوشت کا پہاڑ بنتی جارہی ہے۔"

انہوں نے میرے بھرے بھرے سڈول سراپے کو گوشت کے پہاڑ سے تشبیہ دے کر میرے نازک جذبات کو بری طرح سے مجروح کردیا تھا۔ اپنی تو صرف دو ہی منحنی سی تاڑ کی طرح لمبی، سوکھی بانس جیسی دو بیٹیاں تھیں اور ڈگریاں میرے حصے کی بھی اکٹھی کر رکھی تھیں۔ اس طرح کے رویوں کی میں بچپن سے ہی عادی تھی۔ میری صحت اور تعلیم، یہ دو ایسے مسئلے تھے جو میرے خاندان والوں کے لیے مسئلہ فلسطین بن چکے تھے۔ نہ تو میں مما، دادی اور پھوپھو کی خواہش کے مطابق اپنی صحت ڈائٹنگ کے شوق میں تباہ کرسکتی تھی اور نہ ہی میٹرک میں مجھ سے پاس ہوا جارہا تھا۔ یہ دونوں کام یوں لگتا تھا جیسے میرے اختیار سے باہر ہیں۔

کھانا پینا چھوڑ کر میں کیسے ٹی بی کی مریضہ بن سکتی تھی؟

"سوکھی سڑی ہڈیوں کی ڈھانچہ سی ساحیہ مراد بھلا کیسی لگتی؟" یہ سوچ ہی مجھ پر کپکپی طاری کردیتی تھی۔ سو میں ڈٹ کر تینوں وقت کا کھانا کھاتی تھی۔ مما کی گھوریوں کی پرواہ کیے بغیر۔ اور رہا پڑھائی کا مسئلہ... تو شاید کسی نہ کسی طرح میرا میٹرک میں اے پلس آجاتا اگر مما مجھے آرٹس پڑھنے دیتیں۔ شاید اس وقت میں اردو ادب یا فائن آرٹ میں اپنا نام بنا چکی ہوتی۔ مگر ہائے میری قسمت، مجھے تو ابھی تک برقی کرنٹ اور مقناطیسیت کے درمیان تعلق کو معلوم کرنے والے کا نہیں پتا تھا کہ وہ فلیمنگ ہے، نیوٹن ہے، فیراڈے ہے یا پھر اورسٹڈ ہے۔

اپنی تازہ ترین بے عزتی پر میں جی بھر کے تلملا رہی تھی۔ اس تلملاہٹ نے تو زندگی بھر میرے ساتھ ہی رہنا تھا اور اب جو نبیلہ پھوپھو کے پاس بھیج کر مجھ بے چاری پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے، مگر بھلا ہو میرے پیارے ڈیڈی کا۔ انہوں نے صبح صبح ناشتے کی میز پر ایک جذباتی تقریر کرکے مما کے ارادوں کو ڈانواں ڈول کردیا تھا۔ تب ہی تو مما نے شمو کو میری پیکنگ کھولنے کا آرڈر دے کر مجھے حد سے زیادہ مسرور اور شاد کردیا تھا۔

ڈیڈی کی بے پایاں محبت پر پہلے بھی مجھے شک نہیں تھا مگر اب تو اس محبت پر گویا مہر لگ چکی تھی اور ادھر ڈیڈی میرے کان میں کہہ رہے تھے۔

"ان دونوں خواتین کے ہاتھوں سے بنے بدمزا کھانے کھا کر ہم نے بھلا مرنا تھا کیا؟ مجھے اپنی بیٹی کے ہاتھ سے بنی کافی پیے بغیر نیند بھلا آسکتی تھی؟"

"مگر ڈیڈی! یہ فزکس اور کیمسٹری۔" میں رو دینے کو تھی۔

"ارے، چولہے میں جھونکو فزکس کو۔ کوئی ضرورت نہیں، ننھی سی جان کو غم لگانے کی۔ اگلے سال آرام سے پیپر دے لینا۔"

پاپا نے لاپروائی سے میرے شانے تھپتھپائے۔ ایسے ہی تو میں اپنے پاپا اور ڈیڈی کے گیت نہیں گاتی تھی۔ انہوں نے کبھی مجھے مایوس ہونے نہیں دیا تھا۔ ان کی ایسی ہی محبت کی وجہ سے میں ابھی تک میٹرک میں اٹکی ہوئی تھی۔ دراصل رزلٹ آنے کے بعد مما مار کٹائی کا پیریڈ لیتی تھیں۔ اور پھر میں تین چار گھنٹے سوگ کی کیفیت میں گزار دیتی تھی پھر میری سوجی آنکھیں دیکھ کر ڈیڈی اور پاپا جی جان سے میری ہمت بندھاتے تھے۔ ان سے میری ایشوریہ رائے جیسی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو جو نہیں دیکھے جاتے تھے۔

"ساحی! ٹینشن نہیں لینا بیٹے! گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔" "تم ایک دفعہ پھر کوشش کرو، محنت کرو۔" یہ ڈیڈی کے الفاظ ہوا کرتے تھے اور مما سیخ پا ہوجاتیں۔

"بھائی جان! آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں، یہاں ٹینشن لی نہیں دی جاتی ہے۔"

"اگر یہ ٹینشن لیتی تو اس کا طول اور عرض اتنا پھیلا ہوا نہ ہوتا۔" اسود بھائی بھی میری "صحت" کے دشمنوں میں سے تھے۔

"ہونہہ، خود بڑے اسمارٹ ہیں۔" میں نے ناک چڑھائی۔

"بک بک سن لو بس۔" مما غصے سے بولیں۔ "جاؤ، اسود کے لیے چائے بنالاؤ۔"

"کام کے وقت ساجیہ یاد آجاتی ہے۔" میں کہنے سے باز نہیں آئی۔ "فری سے کہیں، چائے بنالائے۔" میں نے شان بے نیازی سے کہا۔

"مجھے جوشاندہ نہیں پینا۔" اسود بھائی نے ناگواری سے کہا۔ "ساحی کے علاوہ کوئی اچھی چائے بنا ہی نہیں سکتا۔" اب وہ میری تعریف کر رہے تھے۔ جسے میں سراسر خوشامد سمجھ رہی تھی۔

"مسکہ مت لگائیں۔"

"یہ مسکہ کیا ہوتا ہے؟" وہ حیران ہوئے۔ "اک بات تو سچ ہے۔ میری بہن سے اچھی کوئی چائے بنا ہی نہیں سکتا۔"

"بہن۔" صدمے کی شدت سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ نجانے ہر خوبصورت اور قابل لڑکے کو میں بہن ہی کیوں لگتی تھی۔

اگر شادی ہو جاتی تو کم از کم پڑھنا تو نہ پڑتا۔ اور میں واحد ایسی لڑکی تھی جو اپنے لیے بھرے پرے کھانے پینے کے شوقین سسرال کی دعائیں مانگتی تھی۔ جنہیں کھانے ٹھنسا کر میں اپنا گرویدہ بنا لیتی اور کم از کم وہ مجھ سے میری ڈگریوں کے بارے میں نہ پوچھتے۔

مما کے نزدیک میں ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ نالائق، جاہل اور کند ذہن تھی۔ مگر دل ہی دل میں وہ میرے سگھڑاپے کی قائل ضرور تھیں۔ میں ہر فن میں طاق تھی اور میرے سگھڑاپے کا سارا کریڈٹ بڑی مما کو جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے کوکنگ سے لے کر سلائی کڑھائی تک، ہر فن میں طاق کر دیا تھا۔ مگر مما کے نزدیک میری ان خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ "دبلے لوگوں کے سیاپے" کہہ کر میری ان خوبیوں کو مٹی میں رول دیتی تھیں۔

"ساحی! ایک تو تم نجانے کس مراقبے میں چلی جاتی ہو۔" مما نے خفگی سے کہا "اب اٹھ بھی چکو۔"

"جا رہی ہوں۔" میں دھپ دھپ کرتی کچن میں چلی گئی۔

* * *

میں بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ فش کری بنا رہی تھی۔ مچھلی کو بیسن لگا کر پہلے سے رکھ دیا تھا۔ پیاز بھی گولڈن کر لی تھی۔ فش بھی فرائی ہو چکی تھی۔ بس آدھے گھنٹے کا کام تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین سلاد کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ یہ مینو ڈیڈی کی پسند کے مطابق صبح ہی میں نے ترتیب دیا تھا۔ کوفتہ بریانی دم پر تھی۔ اسی پل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں وقتاً" فوقتاً" سلیب پر رکھے نوٹس پر بھی نگاہ ڈال رہی تھی۔

"اف، اب فون سننے لاؤنج میں جاؤں۔" میں نے بھنا کر سوچا۔ فون بے چارا بج بج کر خاموش ہو گیا تھا۔ تب ہی مما اور بڑی مما سٹنگ روم سے برآمد ہوئیں۔ نجانے کون سی میٹنگ کر کے فارغ ہوئی تھیں۔

"کس کا فون تھا ساحی!"

"ابن اہشیم کا ہوگا۔" میں نے رٹا لگاتے ہوئے سلاد کے لیے خربوزہ کاٹنا شروع کر دیا۔

"ہیں۔ وہ کون ہے؟" بڑی مما بے حد حیران ہوئیں۔ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی تھی۔ بڑی مما ابن اہشیم کے متعلق تفصیل پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے بڑی مما کی افسردہ سی آواز سنائی دی۔

"کچھ دن بعد آئیں گے۔ کسی گھریلو پرابلم کی وجہ سے ان کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔"

"اس کے نصیب ہی ٹھنڈے ہیں۔" مما کی متفکر اور شدید پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر ان دونوں خواتین کے متفکر چہروں کی طرف دیکھا۔

کس کے نصیب ٹھنڈے ہیں۔ یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ مما کا اشارہ یقیناً" میری ذات گرامی کی طرف تھا۔ شاید کچھ مہمانوں کو آنا تھا اور اب ان کا پروگرام بدل گیا تھا۔ یقیناً" انہیں بھی میرے موٹاپے کی بھنک پڑ چکی ہوگی۔ ایسا ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

میری ذات کے ساتھ بے شمار مسائل کا انبار بھی جڑا ہوا تھا۔ ایک تو میری نالائقی' دوسرا میرا پھیلا ہوا وجود۔ تیسری یہ گز بھر لمبی زبان' جو نئے مہمانوں کو دیکھ کر منہ کے اندر رکتی ہی نہیں تھی۔ کمبخت تیز گام کی طرح چلتی جاتی تھی۔

پچھلے دنوں کچھ خواتین آئی تھیں۔ میرے گورے چٹے خوب بھرے بھرے سراپے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ بعد میں کہلا بھیجا' انہیں آٹے کی بوری نہیں چاہیے۔ بس مجھے بھی غصہ آگیا۔ بڑی مما کی پرسنل ڈائری میں سے ان خواتین کا فون نمبر چرا کر وہ لتے لیے کہ یاد ہی کرتی رہیں گی تمام عمر اس شاندار بے عزتی کو۔ ساجیہ مراد کو آٹے کی بوری کہنے کا خمیازہ بھگتنا تو تھا ہی۔ میں نے بھی ان کے گنجے بیٹے کی شان میں ایسے ایسے القابات کہے تھے کہ بے چاری تمام عمر جلتی بھنتی رہیں گی۔

یہ دوسری منحوس ترین ٹیلی فون کال تھی۔ جو میری زندگی میں بھونچال لانے کا باعث بنی۔

مما کی پریشانی نے مجھے بھی سچ مچ پریشان کر دیا تھا' مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ مما کو ان دنوں مجھے پڑھائی کی افادیت پر لمبے لمبے لیکچر دینے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ دوسرا حیرت کا جھٹکا مجھے تب لگا۔ جب آرٹس کی کتابیں میری رائٹنگ ٹیبل پر سج گئیں۔ مما نے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔ ان دونوں کے سر سے مجھے ڈھیر سارا پڑھانے کا بھوت اتر چکا تھا۔ اب وہ مجھے سلم اینڈ اسمارٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلمنگ سینٹر کی میڈم سے بات بھی کر لی تھی۔

ادھر میرے کچن میں گھسنے پر شدید پابندی لگ چکی تھی۔ میں اپنے پسندیدہ سبجیکٹ دیکھ کر اس قدر خوش نہیں ہوئی تھی' جس قدر کچن میں گھسنے پر پابندی نے مجھے ادھ موا کیا تھا۔ مما مجھے صبح صبح پالک کا بدمزا پانی پلا کر دلیے کی ایک چھوٹی سی پیالی پکڑا دیتی تھیں۔ تین دن اس ناانصافی اور ظلم کے بعد میں نے اپنے زرخیز دماغ سے کچھ نئی ترکیبیں نکال لی تھیں۔ کبھی ڈیڈی اور کبھی پاپا سے دو تین سو روپے لینا میرا معمول بن گیا تھا۔ کیونکہ مما اور بڑی مما نے مجھے دبلا کرنے کے لیے جو عہد کر رکھا تھا۔ اس عہد کو مدنظر رکھ کر میری پاکٹ منی بھی بند ہو چکی تھی۔

اب مما مجھے پڑھائی پر نہیں' بلکہ ڈائٹنگ پر بڑے بڑے اور لمبے لیکچر دیتی تھیں۔

ان دنوں مما کی سب سے بڑی ٹینشن میرا بڑھتا ہوا وزن تھا۔

جس دن میرا میٹرک کا شاندار رزلٹ آیا' یہ اسی دن کی بات ہے۔ یہ دن میرے لیے خوشگوار نہیں تھا۔ حالانکہ مما اور بڑی مما میرے پھولے پھولے گلابی چہرے پر نہ جانے کتنے ہی بوسے دے چکی تھیں۔ مما میرے اچھے رزلٹ پر پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ اور ڈیڈی فخریہ کہہ رہے تھے۔

"میں نہ کہتا تھا سائرہ! ساحی کو آرٹس پڑھنے دو' بچے کی دلچسپی اور شوق کو اولیت دینا چاہیے۔" مما آج ڈیڈی سے متفق ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی قسم کی بحث نہیں کی تھی۔

رات کو خالہ نے مما کو فون کر کے بتایا۔

"آپا! بڑی آپا نے اسود کے لیے غانیہ کو مانگا ہے۔"

اس خبر نے مما کے چہرے کے سارے رنگ اڑا دیے تھے۔ شاید وہ بھی اسود بھائی کو بطور داماد پسند کر چکی تھیں۔ تاہم بھانجی کی خوشی پر انہوں نے کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پہلے چھوٹی خالہ کو اور پھر بڑی خالہ کو مبارک باد دی۔

ادھر میرے ارمانوں پر بھی اوس پڑ چکی تھی۔ غانی اور اسود بھائی سے اچھے اچھے گفٹس وصول کر کے

میں نے بھی اوپری دل سے انہیں مبارک باد دی۔ اگر اسود بھائی کے ساتھ بات بن جاتی تو میں نے ایف اے کے بجائے، شادی کرنا تھی۔ مگر ہائے میرے نصیب۔ جو بقول مما کے بالکل برف یا آئس کریم کی طرح ٹھنڈے تھے۔

خاندان کے سارے ہی لڑکے ایک ایک کر کے کھونٹے سے بندھ چکے تھے۔ حنا اور صبا جیسی نالائق لڑکیاں بھی دو دو بچوں کی امائیں بن چکی تھیں۔ میرا دل جل جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ادھر اسود بھائی اور رعنائی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

مما بھی ہنسی خوشی کبھی جہیز تو کبھی بری کی شاپنگ کروانے چلی جاتی تھیں۔ کچن ان دنوں میرے صحت مند کندھوں پر تھا۔ سو میں جی بھر کر چٹ پٹے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈیڈی اور پاپا بھی خوب مزے کر رہے تھے۔ ان دنوں دونوں کو پرہیز بھول چکا تھا۔ میں بھی فرمائشی لسٹ کو دیکھتے ہوئے مینو ترتیب دیتی تھی۔

بڑی مما تو عرصہ ہوا کچن کو خیرباد کہہ چکی تھیں۔ ہائی بلڈ پریشر کے مرض نے انہیں خاصا عاجز کر دیا تھا۔ اور

مما کو بھی میں اب کم کم ہی کچن کی طرف جانے دیتی تھی۔ مگر جب سے مما کو میرے پھیلتے وجود کو دیکھ کر شاک لگا تھا اور میرا اب تک رشتہ نہ ہونے کی یہ بہت بڑی "وجہ" معلوم ہوئی تھی، تب سے کچن میں میرے داخلے پر پابندی لگا دی گئی تھی مگر خیر اب تو آزادی ہی آزادی تھی اور میں اس آزادی سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔

شادی کے ہنگامے جوں ہی سرد پڑے، مما نے میرا دوبارہ وزن کروایا اور پھر کچھ مت پوچھیے میں اپنا پندرہ کلو وزن بڑھا چکی تھی۔ مما نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میں نے انٹر میں ایڈمیشن کیا لیا، مصروف سے مصروف تر ہوتی چلی گئی تھی۔ پڑھائی اور کھانے کے علاوہ مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا.... بڑی مما کمرے میں داخل ہوئیں۔

"سائرہ! بانو کی روحی کا رشتہ بھی طے ہو گیا۔" یہ خبر خاصی روح فرسا تھی۔

"اچھا۔" مما صدمے کے مارے بول ہی نہ سکیں۔

"اچھی خاصی موٹی اور سانولی سی تھی مگر پوزیشن ہولڈر تھی، عمر کچھ زیادہ ہو گئی تھی، اسی لیے بے چاری بانو بہت پریشان تھی۔" مما نے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔

"چلو، بانو کی پریشانی تو دور ہوئی۔ اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔" بڑی مما نے صدق دل سے دعا کی۔ نظریں ہنوز مجھ پر تھیں۔ گویا خصوصاً "میرے لیے بھی دعا کی گئی تھی۔

"روحی باجی کی شادی میں کون جائے گا۔" مجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہو گئی تھی، سو بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"تم تو ہرگز نہیں جاؤ گی۔" مما کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"کیوں؟ اب تو میں میٹرک بھی کر چکی ہوں۔" میں نے روتی صورت بنا کر کہا۔

"بڑا تیر مار لیا ہے تین سال میں میٹرک کر کے۔" مما تو ساسوں کی طرح طنز مارنے میں ماہر تھیں۔

"کر تو لیا ہے نا۔ اگر اس دفعہ بھی فیل ہو جاتی تو اچھا تھا۔" میں تنک کر بولی۔

"بے وقوف، احمق، ذرا عقل نہیں۔ اگلے گھر جا کر نجانے کون کون سے "گل" کھلائے گی۔"

"مجھے گل کو منہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے خبر ہے میں "گل" سے کس قدر چڑتی ہوں۔" گل ہماری پڑوسن تھی، پاپا کے دوست کی بیٹی۔ ان دنوں چھٹیاں گزارنے کینیڈا گئی ہوئی تھی۔

* * *

میں اس وقت ٹیرس پر بیٹھ کر کیلوں کے ساتھ معمولی سا انصاف کر رہی تھی۔ صرف چھ کیلے ہی کھائے تھے۔ جب میری پڑوسن کے ٹیرس کی ریلنگ پر

جھکے ایک سیاہ چمکتی آنکھوں والے خوبرو لڑکے نے مجھے ساتواں کیلا اٹھاتے دیکھ کر گویا گنتی مکمل کر دی تھی۔

"اب مزید ایک بھی کیلا مت کھانا۔ ورنہ تمہارا نہ سہی، میرا اپنا معدہ تمہیں کیلے کھاتے ہوئے دیکھ کر پھٹ جائے گا۔ مائی گاڈ! پیٹ ہے کہ کنواں، ابھی دو سرخ سرخ سیب بھی پلیٹ میں ڈھک کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کسی اور کے معدے میں ڈالو گی؟" وہ مسلسل بولتا ہوا بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے ٹیرس پر کود گیا۔ یہ کیلے سیب تو مجھے ہضم ہو سکتے تھے مگر ان محترم کی بے تکلفی ہرگز نہیں۔

"کون ہو تم؟" میں نے اپنے ازلی پُرجلال موڈ میں دہاڑنے کی کوشش کی تھی مگر گلے میں کافی تکلیف دہ خراشیں پڑ گئیں۔

"میں دلوں کا کیف ہوں۔" مقابل نے خاصا جھوم کر بتایا۔

"میں کہہ رہی ہوں، اپنا نام بتاؤ؟" مجھے ایک دفعہ پھر تلخ لہجہ بنانا پڑا۔

"بتایا تو ہے۔ کیف ہوں، سرور ہوں، نشہ ہوں، خمار ہوں۔ مستی ہوں۔" وہ پھر سے دلار بھرے انداز میں بولا۔

"یہ سارے نام تمہارے ہیں؟ احمق! مجھے صرف ایک نام بتاؤ۔" میں نے جھاڑ کر کہا۔ دراصل میرا ارادہ یہ تھا کہ ریلنگ پھلانگ کر زرا رخسانہ آنٹی (گل کی ممی) سے شکایت لگا کر آتی ہوں کہ گھر میں کس بد تہذیب مہمان کو رکھا ہوا ہے۔ جو بغیر اجازت کے دوسروں کے گھروں میں گھس کر بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ "رخسانہ آنٹی تمہاری رشتے میں کیا لگتی ہیں۔" میں نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔

"ڈیڈی کی بہن۔"

"یعنی تمہاری پھوپھو؟"

"یہی سمجھ لیں۔" اب وہ ریلنگ کے اوپر جھک کر ہمارے لان کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ پھول پودے کس نے لگائے؟"

"ساحیہ نے۔" میں نے سوچا کیوں نہ تعریف ہی بٹوری جائے۔

"یہ کون خاتون ہیں؟" وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

"میں اور کون۔"

"اوہ، تو آپ کا نام ساحیہ ہے۔" اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ "آپ کا نام تو کوئی بھاری بھرکم قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ دردانہ، سطوت آرا یا ہزیرہ بیگم۔"

"کیا مطلب؟" میں چیخ اٹھی۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" کوئی میری صحت پر چوٹ کرے تو میں زخمی شیرنی بن جاتی تھی۔ کچھ میں فطرتاً" جھگڑالو تھی۔

دراصل اس کے پیچھے بھی بے شمار وجوہات ہیں۔ میرے گھر والوں کی بے شمار زیادتیاں اور ظلم، جو عمر کے مختلف ادوار میں مجھ پر ٹوٹتے رہے تھے۔ شروع سے ہی مجھے ہر بات پر ڈی گریڈ کرنا۔

میں جو عماد بھائی کے اتنے سالوں بعد اس ظالم گھرانے میں پیدا ہوئی تو ان لوگوں کو میری قدر کرنا چاہیے تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ شکرانے پڑھتے، نیازیں بانٹتے، مگر ہوا کچھ یوں..... مما مجھ جیسی جناتی بچی کو پیدا کر کے بیمار پڑ گئی تھیں۔ سارے گھر والے معصوم سی گول گوتھنی بچی کو بھول بھال کر مما کے غم میں ادھ موئے ہونے لگے۔ پاپا نے تو اس وقت جذبات میں آ کر یہ تک کہہ دیا تھا۔ "اس سے بہتر تھا، میں بے اولاد ہی رہتا۔" یہ اس نازک گھڑی کی جذباتی سی کیفیت تھی۔ بعد میں پاپا نے مجھے اپنی آنکھوں کا ستارہ اور ہتھیلی کا چھالا بنانا چاہا تو میری ہٹلر مما درمیان میں کود پڑیں۔

"مراد! کیا ساحی کو بگاڑ دیں گے۔ ایک ہی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔" مما نے دو سال کی عمر میں تربیت کرنے کے چکر میں مجھے جو خونخوار نظروں سے گھورنا شروع کیا تو اب تک یہی سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی مما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے، اکلوتی تھی۔ سارے ستم مجھ مسکین

پر ہی ڈھائے گئے۔ عماد بھائی ایک تو مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اوپر سے بلا کے فرماں بردار۔ مجھے دیکھ دیکھ کر تو مما کو ہول پڑتے تھے۔

”ہائے لڑکی ذات اور ایسی بد زبان... بولتی ہے تو گویا چھت پھاڑنے کے ارادے سے۔ کبھی عماد کو اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا ہے۔“

مما کا خیال تھا قصور میرا بھی نہیں، میں اپنی پھوپھی کا مزاج چرا لائی ہوں۔ سو میری گرم مزاجی سے گھر والوں نے سمجھوتا کر لیا تھا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں...

”محترمہ! آپ کس مراقبے میں چلی گئی ہیں؟“ وہ بالکل میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور میں جو ماضی کی بھول بھلیوں میں گم بچپن سے اب تک اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک دم چونک کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟“ جوں ہی میری نظر اس کے ہاتھوں تک گئی۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔ وہ کمینہ لیموں کے رس میں کٹے ہوئے سیب چٹ کر گیا تھا۔

”کس کی اجازت سے تم نے میرے سیب کھائے ہیں؟“

”کھانے پینے کے معاملے میں بھلا اجازت کیسی؟“ اس نے میز سے ایک ٹشو بھی اٹھا لیا۔

”جاؤ یہاں سے.... ورنہ میں چوکیدار کو بلاؤں گی۔“ میں نے اسے دھمکانا چاہا۔

”چوکیدار نے بھلا یہاں آ کر کیا کرنا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”تمہیں اٹھا کر دوسرے ٹیرس پر پھینک دے گا۔“

”اس میں اتنی جان ہے؟“ وہ ہمارے چوکیدار کی صحت پر چوٹ کر رہا تھا۔ ”یہ کام تو آپ پر سوٹ کرتا ہے اور آپ ماشاء اللہ سے کر بھی سکتی ہیں۔“

”کون سا کام؟“

”اب کیا تشریح کروں۔ خیر! اللہ آپ کو نظر بد سے بچائے۔“ وہ بیک وقت میرے صحت مند سراپے پر بھی چوٹ کر رہا تھا۔ یہاں میرا غصہ کرنا تو بنتا تھا اور غصہ چونکہ میری ناک پر دھرا رہتا تھا، سو میں فوراً ہی پھٹ پڑی۔

”جاتے ہو یہاں سے کہ میں مما کو بلاؤں؟“

”اتنا تردد کر کے نیچے جانا ہے تو میرے لیے چائے بھی لیتی آنا۔ میں یہیں ویٹ کروں گا۔“ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ میں نے چھری اور پلیٹ اٹھا کر کہا۔

”اگر نہ جاؤں تو.....؟“

”تم کس کی اجازت سے ہمارے ٹیرس پر آئے ہو؟“ میں نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

”اپنے دل کی اجازت سے۔“ وہ مزے سے بولا اور پیر جھلاتا کھڑا ہو گیا۔

”مس ساجیہ مراد! ہم پھر ملیں گے۔ ابھی چلتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔“ وہ دوسرے ہی پل ریلنگ سے کود کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ جبکہ میں بھناتے ہوئے نیچے اتر آئی۔

⁂

میرا ایف اے میں پاس ہو جانا میرے گھر والوں کے لیے ہفت اقلیم کی دولت مل جانے کے برابر تھا۔ ڈیڈی، پاپا اور مما تو اس خوشی میں کسی بڑی ضیافت کا اہتمام کرنا چاہتے تھے، مگر نبیلہ پھوپھو کی بیماری کی خبر نے سارا پروگرام درہم برہم کر دیا تھا۔

میرے اور ڈیڈی کے علاوہ سب ہی اسلام آباد چلے گئے تھے۔ ڈیڈی کو آفس سے چھٹی نہیں ملی تھی اور میں ڈیڈی کی وجہ سے گھر میں رہنے کے لیے تیار تھی۔ ویسے بھی میں پھوپھو کے سوالات کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر لینا تھا۔

”سائنس کیوں نہیں پڑھی؟ ایڈمیشن کیوں نہیں لیا؟ کون کون سے سبجیکٹ پڑھو گی؟“

اب بھلا پھوپھو کو کون بتائے۔ میں نے مزید نہ پڑھنے کا اعلان کر دیا تھا اور میری پیاری مما نے اس اعلان کو سن کر فی الحال جوتا اٹھانے سے پرہیز ہی کیا تھا۔ دراصل میرے انٹر میں پاس ہو جانے کی خوشی میں انہوں نے اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہا تھا۔ اور فی الحال میری بے عزتی کرنے کا ارادہ ترک کر کے اسلام آباد سدھاری تھیں۔

چونکہ پڑھائی کا بوجھ تو ہٹ چکا تھا۔ سو میری آج کل تمام تر توجہ کا مرکز ٹی وی اور کچن تھا۔

اس دن بھی میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ڈیڈی کے لیے چانپ بنا رہی تھی۔ اس کی ترکیب میں نے ایک ٹی وی چینل کی آنٹی سے سیکھی تھی۔

میں مختلف مسالوں کے پیسٹ کو چٹنی کی ہوئی چانپ کے اوپر لگا کر فرائی کر رہی تھی، جب شمو نے مجھے کچن میں آ کر اطلاع دی۔

”ساجی بی بی! مہمان آئے ہیں۔“

”لو جی! اس وقت کون ویلا (فارغ) آ گیا ہے منہ اٹھا کر۔“

میں لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا اور اور زیرہ کریم میں مکس کر رہی تھی۔ چانپ کو سلاخوں میں لگانا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ دھوئے اور سر پر ٹنگی شمو کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کون ہے؟“

”خود دیکھ لیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”دیکھنے کی چیز ہے قسم سے۔“ شمو اپنی اوقات پر اتر آئی۔

”بکو نہیں۔“ میں نے اسے ڈپٹ کر کہا۔ ”مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے؟“

”جی، بالکل۔“ اس نے زور سے سر ہلایا۔

”تو پھر چائے لے آنا۔“ میں لاؤنج میں لگے مرر میں اپنا حلیہ دیکھ کر بولی۔

”چائے کے ساتھ کیا لاؤں جی؟“

”نگٹس، رول، کباب اور ہاں کیک بھی رکھ لینا، ڈیڈی کے کوئی دوست ہی ہوں گے۔“ میں نے اندازاً سوچتے ہوئے ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا، مگر صوفے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر میرے منہ میں گویا کڑوے بادام آ گئے۔

”تم...؟“ میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

”جی، میں.... آپ کیوں شاکڈ رہ گئی ہیں؟ یہاں بیٹھ جائیے، کہیں گر مت جائیے گا صدمے کی شدت سے۔“ وہ اخلاقاً اٹھتے ہوئے بولا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ میں ناراضی سے بولی۔ آج بہت دن بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید بیچ کے دنوں میں وہ کہیں چلا گیا تھا۔

”مبارک باد دینے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”ہائے، اسے بھی خبر ہو چکی۔“ میرا دل ڈوب کر ابھرا۔ ”پھر تو نمبر بھی جان چکا ہو گا۔“

”اتنا حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ دراصل مجھے رخسانہ آنٹی نے بتایا تھا۔ سوچا، مبارک دے آؤں۔ ایمان سے بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کے آپ نے انٹر پاس کر لیا ہے۔“ وہ سچ مچ بڑی خوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر مجھے صاف طنز ہی لگا۔

”ٹھیک ہے، خیر مبارک۔“ میں نے اوپری دل سے کہہ ہی دیا۔ ”ویسے تم اتنے دن سے کہاں تھے؟ نظر نہیں آئے۔“ میں نے ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے پوچھ لیا تھا۔

”آپ نے مجھے مس کیا؟“ وہ تو ایسے کھل اٹھا تھا گویا گلاب کا پھول ہو۔

”لو، جی! اگر لو گل..... یہاں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ میں نے منہ بنا کر سوچا، مگر اس کا دل توڑنا بھی مناسب نہیں تھا، سو لفظوں کا ہیر پھیر کر کے بولی۔

”ٹیرس پر نہیں دیکھا، سو اسی لیے پوچھ لیا۔“

”دراصل میں کچھ دن تک ”سوگ“ کی کیفیت

میں رہا ہوں۔“

”سوگ؟“ میں چونکی۔ ”بھلا کیسا سوگ؟ کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہہ دیا؟“ میری تجسس پسند فطرت انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی اور فوری طور پر میرے ذہن نے ایک کہانی کا تانا بانا بھی بُن لیا تھا۔ گل کے پیار میں پاگل لیکن ـــــ گل کا ہری جھنڈی دکھانا اور پھر کیف کا سوگ میں اتنے دن غمزدہ رہنا.... ادھر میرے اندر مارے تجسس کے گدگدی ہونے لگی تھی اور میں بس فٹافٹ ساری کہانی کو جاننے کے لیے بے چین ہو گئی تھی اور اس لمحے مجھے بھول گیا تھا کہ میری پہلی ملاقات کافی ناگوار رہی تھی۔

”بس جی‘ کچھ نہ پوچھیں.... لوگوں کے دو رخے چہرے ہیں۔“ وہ رنجیدگی سے بولا۔

”کس کے؟“ میں حیران ہوئی۔

”ہماری پھوپھو محترمہ۔“ وہ جل بھن کر بولا۔

”مگر ان کے وہ چہرے کہاں ہیں؟ مجھے تو صرف ایک چہرہ ہی دکھائی دیتا ہے۔“ میں نے ہونق پن کی انتہا کر دی تھی۔

”میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں۔“ وہ جھنجلایا۔

”یہ جو میری پھوپھو ہیں نا.... ایک نمبر کی بدعہد ہیں۔“ وہ خوب جلا بیٹھا تھا۔

”انہوں نے کیا کیا؟“

”پھوپھو نے کہا تھا‘ ان چھٹیوں میں وہ ضرور ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں گی مگر اب وہ مکر گئی ہیں۔“ کیف نے بسور کر بتایا تھا اور ادھر میرا منہ اتر گیا۔ جو کچھ میں سننا چاہتی تھی اور جس محبت کی کہانی کا مجھے انتظار تھا‘ سب خواب ہوا‘ کھودا پہاڑ اور نکلا کیا؟

”تم گل کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی بس آنے ہی والی ہے۔“ میں نے اس کو تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا مگر وہ یوں اچھلا گویا اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

”توبہ کریں جی! پھوپھو کو تو اس لیے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ چند دن کے لیے ہی سہی‘ میری کچن سے جان چھوٹ جائے گی۔ میں بھی چار دن سکھ کا سانس لے سکوں گا۔ مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ میں گل لے جاؤں تاکہ میری مزید سختی آجائے۔ میں دو کے لیے بھی کچن سے باہر نہ نکل سکوں۔“ کہہ تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ گل کی ہڈ حرامی اور کام چوری مجھ بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔ کاہلی اور سستی خصوصاً کچن کے کاموں میں‘ محترمہ گل پر ہی ختم ہوتی تھی۔

”کچن کے کاموں سے تو گل کی جان جاتی ہے۔“ میں نے شمو کو ٹرالی گھسیٹ کر اندر آتے دیکھ کر اس کے لیے اتنا اہتمام کرنے کی بھلا کیا ضرورت پڑوس سے تو آیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شمو کا بھلا کیا قصور ہے۔ آرڈر تو میں نے خود ہی دیا تھا اور ادھر کیف نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔ وہ کباب کھاتے ہوئے بول رہا تھا۔

”اسی لیے تو میرا اور فیملی پلٹون کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ گل ہماری بھابھی نہیں بن سکتی۔“ میں اس کے لیے چائے بناتے بناتے اچھل کر رہ گئی۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی۔ میرا چونکنا فطری تھا۔

”ہائے‘ گل بھی ٹھکانے لگنے کے قریب پہنچ گئی۔“ صدمے سے میرا پاؤ بھر خون خشک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بی اے کی موٹی موٹی کتابیں گھومنے لگی تھیں۔ اگر اس سال بھی کوئی امید کی کرن نظر نہ آتی تو مجھے قوی یقین تھا‘ مما نے اسلام آباد سے واپس آکر ایڈمیشن فارم میرے منہ پر ضرور دے مارنا تھا اور مجبوراً“ روتے دھوتے مجھے اس فارم کو بھرنا تو ضرور ہی تھا۔ ورنہ مما سے دھنائی کون کرواتا۔

”پھوپھو کی خواہش ہے۔ میرے بھائی سے گل کی بات بن جائے مگر میرے اور میری پلٹون جیسے ظالم سماج کے ہوتے ہوئے بھلا یہ بات بن سکتی ہے۔“

”مگر گل میں بھلا کیا کمی ہے؟“ میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

”نہیں‘ کمی تو کوئی نہیں.... ہمارے لیے تو بہت اچھی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمیں گھر سنبھالنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے‘ نہ کہ کوئی ایسی آجائے جو مارے نظام کو بگاڑ کر رکھ دے۔ اب دیکھیں نا‘ گل ال کے چھ مہینے بیرون ملک کے دوروں پر رہتی ہے۔ ایسے میں ہمارے گھر کی بھلا کیا حالت ہوگی اور ویسے بھی گل اپنے کینیڈا والے چاچو کے بیٹے میں انٹرسٹڈ ہے۔ پھوپھو خوامخواہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ خیر یہ ان کا اور گل کا ذاتی معاملہ ہے۔ امید ہے‘ گل پھوپھو کو قائل کر لے گی۔“ کیف نے چوتھا کباب اٹھاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ میں اس کی بات سمجھ کر سر ہلانے لگی۔

”میں پھوپھو کو لینے کے لیے آیا تھا۔ ایک بھائی کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی مگر وہاں بات بنتے بنتے رہ گئی۔“ کیف کا منہ اتر گیا تھا۔

”مگر کیسے؟“ میں نے بے ساختگی سے پوچھ لیا۔

”محترمہ کو کچھ پکانا نہیں آتا۔“

”ہائے‘ صرف اتنی سی بات؟“

”یہ اتنی سی بات نہیں۔“ کیف نے چکن رول اٹھایا اور پھر دوبارہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ”جو خاتون کچن کے نام سے گھبراتی ہوں۔ انہیں شوکیس میں سجانے کے لیے تو گھر نہیں لے کر جانا۔“

”ہاں‘ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ میں نے فوراً“ اتفاق کر لیا تھا۔ کیف کو ویسے بھی بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح سے مقابل کو قائل کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صرف چند دنوں میں میری کیف کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس کا بھی زیادہ تر وقت ہمارے گھر میں گزرنے لگا تھا۔ کیف نے بڑی مما اور میری مما سے بھی خاصی جان پہچان بنا لی تھی۔ ایک تو وہ بلا کا باتونی تھا۔ ایسے ایسے لطیفے اور چٹکلے چھوڑتا کہ ہنس ہنس کر اگلا بندہ بے حال ہو جاتا۔ البتہ کیف کی ہمارے گھر میں آمدورفت رخسانہ آنٹی کو پسند نہیں آئی تھی۔ اکثر جب کیف یہاں ہوتا تو آنٹی اسے کسی نہ کسی بہانے بلانے آجاتی تھیں۔

کیف چند ہفتوں کے قیام کی غرض سے یہاں آیا تھا۔ اس کے آفس کا کوئی کام تھا۔

* * *

اس دن میں مارکیٹ سے کچھ ضروری سامان لینے کے لیے گئی تو کیف سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دو دن بعد نظر آیا تھا۔ ان دنوں کام میں بہت مصروف تھا۔ اسی لیے پارک میں بھی نہیں آرہا تھا۔ ورنہ تو روزانہ ہی میں اسے قریبی پارک میں ٹہلتے اور موبائل فون پر مصروف دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی اسے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔

”کہاں تھے اتنے دن سے؟“ میں نے بڑے بڑے تھیلے اس کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ مصروف تھا۔ تم سناؤ؟ آج کل کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح شائستگی بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”بس‘ وہی پڑھائی کا رونا۔“ میں نے دکھی دل سے بتایا۔ مما نے آتے ہی میری ننھی سی جان پر پھر سے کتابوں کا بوجھ لاد دیا تھا۔ بقول مما کے جب تک شادی نہیں ہوتی‘ فارغ رہنے سے بہتر ہے‘ مصروف رہو اور اب تو میں سچے دل سے شادی کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس دفعہ بھی میں ہرگز پاس نہیں ہو سکوں گی اور فیل ہونے سے بہتر تھا‘ میں کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دوں۔ مگر مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ خاندان کا کوئی بھی مرغا پھنس نہیں پایا تھا اور خاندان سے باہر تانکنے جھانکنے کی مما نے مجھے اجازت نہیں دے رکھی تھی اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ بھی تھا۔

”آنٹی کا ارادہ تم سے جاب کروانے کا ہے؟“ کیف کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیا ضرورت ہے‘ خوامخواہ تمہیں تکلیف دینے کی۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”آنٹی کو چاہیے تمہاری شادی کر دیں۔“

"لو جی، کر لو گل..... یہاں کوئی پروپوزل آتا تو تب بات بھی تھی۔ بندہ رو دھو کر گھر والوں کو شادی کے لیے منوا ہی لیتا۔" میں نے کڑھ کر سوچا۔

"تم بھوک ہڑتال کر دو۔" کیف نے اسے نئی راہ دکھانا چاہی تھی۔

"مما ان اوچھے ہتھکنڈوں سے متاثر نہیں ہو سکتیں۔" میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا، ایک اور طریقہ بھی ہے، تم بیمار پڑ جاؤ۔"

"مگر کیسے؟"

"بھئی، ہر روز جھوٹ موٹ کا دورہ بنا لینا۔"

"پھر مما لوگ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگیں گی، سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"تم ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔"

"میں نہیں جاؤں گی مگر ڈاکٹر خود چل کر میرے پاس آجائے گا۔" میں بیزاری سے بولی۔ "کچھ اور سوچو۔"

"کہہ دو، میری یادداشت چلی گئی ہے۔ ابھی میں گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔ معمولی سی ٹکر کے بعد تم بے ہوش ہو جانا۔" اس نے ایک اور نادر ترین حل پیش کیا، جسے سن کر میرا منہ بن گیا تھا۔

"تاکہ میرا دماغی علاج ہونا شروع ہو جائے اور پھر مما اور پاپا کو پتا چل جائے کہ میں انہیں پریشان کرنے کے لیے ڈرامے کر رہی ہوں۔"

"ایک اور حل بھی ہے میرے پاس۔" وہ پھر سے سوچ میں گم ہوا۔

"جلدی بتاؤ۔" میں بے صبری سے بولی۔

"تم خودکشی کر لو۔"

"ہائے خودکشی۔" میں گویا بدک کر دور ہوئی۔ "یعنی مر جاؤں؟ محض پڑھائی سے بچنے کے لیے۔" میری آنکھوں کے ڈھیلے گویا باہر نکلنے لگے۔

"نہیں تو۔" وہ گویا جھنجلا گیا۔ "مرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ صرف خودکشی کی کوشش کرنا۔ ٹیرس سے چھلانگ مار دینا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"تاکہ میری ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ میں لنگڑی ہو کر بستر سے لگ جاؤں۔" ایسے خوفناک مشورے نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔

"بدھو! دھیان سے چھلانگ مارنا تاکہ ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ بس اس کا دھیان رکھنا کہ اس منظر کو کوئی دیکھ لے۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" میں نے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ "تم مجھے دنیا سے بھجوانے کے طریقے کیوں بتا رہے ہو۔"

"ایک آخری آئیڈیا بھی ہے میرے زرخیز دماغ میں۔" کیف نے چٹکی بجا کر کہا۔

"مجھے تو معاف کرو۔" میں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ میں سڑک پار کرنے لگی تھی۔

"ارے سن تو لو۔" وہ میرے پیچھے بھاگا چلا آیا۔

"کیا ہے؟" میں ناراضی سے بغیر رکے بولی۔

"تو تم شادی کر لو۔" اس نے پھر سے میرا دل جلایا۔

"کس سے۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے دانت پیس کر بھناتے ہوئے کہا تھا۔

"ایبک سے۔" وہ میرے سامنے کھڑا بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ یوں کہ میرا اطمینان پل بھر میں ہوا ہو گیا۔

"مگر....." میں نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر کیف نے گویا ہاتھ اٹھا کر میری بات قطع کر دی۔

"کوئی اگر مگر نہیں۔ کیا میں اور میری ماما تمہارا ہاتھ مانگنے آجائیں؟" اب وہ بڑے صاف اور دو ٹوک انداز میں پوچھ رہا تھا اور میری حیرت کی گویا انتہا ہو چکی تھی۔

"مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" میں ہکا بکا رہ گئی۔ "بھلا یوں کھڑے کھڑے رشتے طے پاتے ہیں؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" وہ پرجوش سا بولنے لگا۔

"تم ہمارا آئیڈیل ہو ساحی! ہمیں جس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ لڑکی صرف تم ہو سکتی ہو۔ تم میں جو خوبیاں موجود ہیں۔ ہمیں ایسی ہی خوبیوں والی لڑکی کی تلاش تھی۔ میری تلاش یہاں آ کر ختم ہو چکی ہے اور میں تمہیں اپنی بھابھی بنانا چاہتا ہوں۔"

ہائے، مجھے کھڑے کھڑے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ اپنی اتنی تعریفوں نے تو میرے حواس معطل کر دیے تھے۔ اگر کچھ سنبھل کر کیف کے تاثرات جانچ لیتی تو ضرور ٹھٹک جاتی۔ مگر کیا ہے کہ مجھے کسی کو جانچنا، پرکھنا یا سمجھنا تو کبھی نہیں آیا۔ میں بے وقوفی کی حد تک سادہ ہوں۔ ان دنوں مجھے اپنی بے وقوفیوں کی خبر نہیں ہو سکی تھی، مگر وقت بہت بڑا استاد ہے۔ جو باتیں ماں، باپ اور کتابیں تک سمجھا نہیں سکتیں، ان باتوں کو وقت اچھی طرح سے ذہن نشین کروا دیتا ہے۔

اور وقت کی شاگردی میں رہنا کوئی آسان کام نہیں۔

* * *

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب رخسانہ آنٹی نے اچانک کینیڈا شفٹ ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ شوہر اور بیٹی چونکہ پردیس میں تھے۔ سو وہ تنہائیوں سے گھبرا کر کینیڈا چلی گئی تھیں۔ ان کی انیکسی میں ابھی تک کیف رہائش پذیر تھا۔

آنٹی کے چلے جانے کا بڑی مما اور میری مما نے خاصا صدمہ لیا تھا۔ عرصہ دراز سے وہ ہمارے پڑوس میں رہ رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یوں لگتا تھا گویا برابر والا گھر سناٹوں میں ڈوب گیا ہے۔ آنٹی چلی گئیں تو کیف بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح چند دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا اور میں جو اتنے دنوں سے اس کی عادی ہو چکی تھی، ایک دم بوکھلا کر رہ گئی اور جس دن وہ واپس آیا تھا۔ میں گویا پھٹ پڑی۔

"بغیر بتائے کہاں دفع ہو گئے تھے؟"

"سانس تو لینے دو، بتاتا ہوں۔" وہ گھاس پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گیا تھا۔

"جلدی سے بکو۔" میں غصے سے بولی۔ اسود بھائی اور غانی کے بعد کیف ہی تھا، جس سے میں اس قدر بے تکلفی سے پیش آتی تھی اور دوسرے مما اور پاپا، کیف کی شرافت، نجابت کو دیکھ کر مطمئن تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے کیف سے ملنے اور گپ شپ سے نہیں روکا تھا اور ویسے بھی ہم کون سا ہر وقت ملنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ زیادہ تر پارک میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ پارک میں بچوں کے ساتھ والی بال کھیلتا تھا اور میں مما کے ہزار مرتبہ مجبور کرنے پر چار پانچ راؤنڈ لینے کے لیے نکل آتی تھی۔ جب تک میں راؤنڈ لیتی تھی۔ اتنی دیر تک وہ والی بال کھیلتا رہتا تھا۔ جوں ہی میں تھک ہار کر بینچ پر بیٹھ جاتی۔ وہ بال پھینک کر بھاگ آتا تھا۔

"یوسما ہے نا، میری وہ۔ اس کا برتھ ڈے تھا۔" وہ پسینہ صاف کرتا ہوا بولا۔ یوسما اس کی "وہ" تھی یعنی دوست، منگیتر، یا پھر بیوی۔ اس نے کبھی "وہ" کی وضاحت نہیں کی تھی۔ میں نے بھی کبھی وضاحت طلب نہیں کی تھی۔ دراصل مجھے کریدنے کی کبھی بھی عادت نہیں رہی تھی اور نہ ہی میرا کیف کے ساتھ ایسا کوئی ریلیشن تھا جو میں یوسما کے بارے میں کانشس رہتی۔ وہ مجھے خاصا ہمدرد، مخلص اور سادہ مزاج لگا تھا اور ان دنوں تو میری مما کے کہنے پر وہ مجھے اکنامکس اور انگلش بڑی دل جمعی کے ساتھ پڑھا رہا تھا اور میں وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی تھی کہ کیف سے اچھا کوئی آج تک مجھے پڑھا پایا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھا پایا۔

مما کیف سے بہت خوش تھیں کیونکہ میرے منتھلی ٹیسٹ دیکھ کر مما کا دل خوش ہو گیا تھا اور وہ اس کامیابی کا سارا کریڈٹ کیف کو دے رہی تھیں۔ میری محنت کو وہ کسی کھاتے میں نہیں سمجھتی تھیں۔

"تو بتا کر جاتے۔" میں نے ناراضی جتائی۔

"کیوں بھئی، آپ نے مجھے مس کیا تھا؟" وہ صاف مجھے چڑا رہا تھا۔

"ہونہہ، کوئی نہیں۔"

"تم تو خوش ہو گی، پڑھائی سے جان چھوٹی رہی اتنے دن۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" میں جزبز ہوئی۔

"تم آوارہ گردی کر آئے؟"

"لڑکی! احترام سے بلایا کرو۔ میں تمہارا استاد ہوں۔" وہ خوامخواہ استاد بنا۔

”تمہاری یوسما ٹھیک ہے؟“ میں نے جان کر اسے چھیڑا۔

”ایک دم ٹھیک ہے، فرسٹ کلاس۔“ وہ دور سے آئس کریم والے کو آتا دیکھ کر اٹھ گیا تھا۔

”اور تم؟“

”میں تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ دو آئس کریم لے آیا تھا۔

”بڑے فریش لگ رہے ہو۔“ میں نے اپنا فیورٹ فلیور نہ دیکھ کر منہ بنالیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”آئس کریم۔“

”مگر مجھے مینگو فلیور پسند نہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”تو نہ کھاؤ..... مجھے دے دو۔“ وہ اطمینان سے بولا تھا۔

”تم سے ایک بات کرنا تھی ساحی.....!“ کافی دیر سوچنے کے بعد وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ میں کچھ چونک گئی۔

”کیا؟“

”وہ دراصل میری ماما آنا چاہتی ہیں۔“ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

”تو آجائیں..... اس میں سوچ بچار کرنے والی کیا بات ہے۔“ میں اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی تھی۔ دراصل مجھے بات تو کیا، لہجے سمجھنا اور چہرے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔

”میرا مطلب ہے، ایک خاص مقصد کے لیے آئیں گی۔“ وہ سر جھکائے گھاس کے تنکے نوچ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی خشک گھاس کے تنکوں کی ایک ڈھیری لگ چکی تھی۔

”کیسا مقصد؟“ اب میں کچھ کچھ سمجھ تو چکی تھی۔ تاہم مزید وضاحت بھی ضروری تھی۔

”ایک کے لیے آئیں گی۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی ہیں۔“

اس نے تعریف کا ایک جال میری طرف پھینک دیا تھا اور میں اس جال میں الجھنے کے قریب قریب پہنچ چکی تھی۔ دراصل اپنی تعریف کسے ناپسند ہوتی ہے اور میری جن خوبیوں کی میرے گھر والوں کے نزدیک کوئی وقعت یا اہمیت نہیں تھی۔ وہ انہی خوبیوں کو میری نظر میں اور بڑھا کر پیش کرتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک فن ہے۔ شائستگی اور سلیقے کے ساتھ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن..... یہ ہنر بھی کسی کسی کو آتا ہے۔

”تم بہت اچھی کوکنگ کرتی ہو۔ تم میں سلیقہ ہے۔ گھر سنبھال سکتی ہو۔ ماما کہتی ہیں ایک لڑکی کو ہر فن میں طاق ہونا چاہیے اور وہ عورت ہی کیا جو گھرداری کے قرینے سے واقف نہ ہو۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور پراثر لہجے میں کہہ رہا تھا اور اس کی باتوں سے ”اس کے لہجے کی تاثیر سے کوئی بھی عقل و فہم والا بندہ قائل ہو سکتا تھا جبکہ میں تو پھر ایک احمق اور بدھو سی لڑکی تھی۔

دراصل میرے لیے بے وقوف اور کم عقل جیسے الفاظ ہی مناسب تھے۔ اس وقت میں سفاکانہ حد تک خود کو احمق ترین مخلوق بھی کہہ سکتی ہوں، ہاں اس وقت مجھے یہ الفاظ بہت زہریلے اور اپنا مذاق اڑانے والے محسوس ہوئے تھے، جب مما نے مجھے جتایا کہ

”تم احمق اور پاگل ہو ساحی! تمہیں یہ سب تمہارے لیے بہتر نہیں لگ رہا۔“

”آپ تو چاہتی ہی نہیں، میں قدردان لوگوں میں جاؤں جو میرے سلیقے سے متاثر رہیں۔ جو میری ڈگریوں کی بجائے میرے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف کریں۔ پلیز مما! میں ساری زندگی احساس کمتری کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ مجھ سے یہ طعنہ کبھی نہیں برداشت ہو سکے گا کہ میں کند ذہن تھی یا پھر میرا اکیڈمک ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔“ میں احساس کمتری کا شکار تھی اور اسی خوف کے زیر اثر میں نے کیف کے بھائی کے حق میں ووٹ دے کر اپنے لیے ایک بھرے پرے کنبے کا انتخاب کر لیا تھا۔

میرا تھرڈ ایئر کا رزلٹ آیا اور میں خوش قسمتی سے پاس ہو گئی۔ ابھی میری اس خوشی کو سلیبریٹ کر رہے تھے کہ ایک نیا واقعہ رونما ہو گیا۔

* * *

پوری زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے خوشی خوشی کالج جانے کی تیاری کی تھی اور اس سے پہلے کالج کے لیے ضروری چیزوں کی شاپنگ بھی کی تھی..... مما اور بڑی مما اس کایا پلٹ پر حیران تھیں۔ اور ڈیڈی، پاپا بے انتہا خوش۔

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے اندر تبدیلیوں کی اصل وجہ کیف کی ذات تھی۔ وہ میرے لیے ایک مخلص دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے مجھے احساس کمتری کے بھنور سے نکال دیا تھا۔ اس نے میری ذات کی اہمیت کو اپنے جاندار لفظوں کا پیراہن دے کر مجھے پہلے سے بھی زیادہ بااعتماد کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی کہ دراصل کیف کا مقصد مجھے بااعتماد کرنا نہیں بلکہ میرا اعتماد جیتنے کی کوشش کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہاں تو، بات ہو رہی تھی اس دن کی، جب میں کالج جانے سے پہلے جھٹ پٹ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ مما اور بڑی مما فی الحال اپنے کمروں میں تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا نماز کے بعد سو جاتے تھے۔ جب تک وہ فریش ہو کر میز تک آتے تھے۔ میں ان کی پسند کا ناشتہ تیار کر چکی ہوتی تھی۔ یہی میری روٹین تھی۔ اس وقت بھی میں نے شمو کے ساتھ مل کر برتن میز پر سجا دیے تھے، جب کیف کی کال نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

میں موبائل اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ساتھ ساتھ یونیفارم بھی پریس کر لوں گی کیونکہ میں جانتی تھی، کیف لمبی بات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

”استاد محترم! خیریت تو ہے۔ صبح صبح فون کھڑکا دیا ہے؟“ میں نے موبائل کان سے لگا کر استری کا پلگ لگاتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی۔“

”جھوٹ نہ بولو۔“ مجھے قطعاً یقین نہیں آیا۔

”سویرے سویرے میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔“

”اتنے بھی تم سچے نہیں ہو، دوست!“ میں نے طنزیہ کہا۔

”یہ تو تم نے سچ کہا۔ سو فیصد ٹھیک کہا۔“ اس نے فوراً“ اتفاق کر لیا تھا۔

”ہم ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ میں خواہ مخواہ اترائی۔ نجانے کیوں وہ ہنس دیا۔

”تم بہت سادہ ہو۔“

”شکریہ، نوازش۔“ میں اسے چڑانے کی غرض سے بولی تھی۔ شاید وہ میری سادگی پر چوٹ کر رہا تھا۔

”بہت نادان بھی ہو۔“

”ٹھیک فرمایا آپ نے۔“ میں مزے سے بولی۔

”اور تم بہت چالاک ہو۔“

”ہاں، واقعی۔“ وہ پھر سے مسکرا دیا تھا اور اس کی ہنسی کی آواز سن کر میں نے بس ایسے ہی عام سے لہجے میں کہہ دیا تھا۔

”اور کبھی کبھی یہی چالاکی آپ کے منہ پر بھی آپڑتی ہے۔ خود کو عقل کل نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”بڑی عقل کی باتیں کرنے لگی ہو۔“ دوسری طرف حیران ہونے کی اداکاری کی گئی تھی۔

”آخر کس استاد کی شاگردی میں ہوں۔“ میں نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

”فون کیوں کیا تھا؟“ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دوہرایا۔ کپڑے استری ہو چکے تھے۔ اب میں جوتے نکال رہی تھی۔

”آج ماما تمہارے گھر آئیں گی۔“ بالآخر اس نے فون کرنے کی وجہ بتا ہی دی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں تھم سی گئی تھی اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو گئیں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا اور میری خاموشی سے وہ اپنے مطلب کے معنی اخذ کرنے لگا۔

”تمہیں برا لگا؟“ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مجھے ہرگز برا نہیں لگا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔

”مجھے برا کیوں لگے گا۔ آفٹر آل میرے استاد محترم

کی ماما آئیں گی۔ مجھے تو ابھی سے مینو کی فکر ہو گئی ہے۔" کچھ دیر بعد میں نے کافی ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

"اچھی بات ہے..... اپنی کوکنگ کے جوہر دکھا کر ماما کو امپریس کر لینا۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔

"مجھے بھلا کیا ضرورت ہے۔" میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا اور جھٹکے سے کال منقطع کر دی تھی۔ دراصل میں کچھ گھبرا گئی تھی اور ایسی گھبراہٹ کا شکار بھی میں پہلی مرتبہ ہوئی تھی اور یہ گھبراہٹ کیف کی ماما کو دیکھ کر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ پہلی نظر میں ہی بندہ کچھ گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو جاتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کی شخصیت کے لیے کون کا سا لفظ مناسب تھا۔ باوقار، مہذب، بارعب یا پراسرار انہوں نے ماتھے تک دوپٹہ لے رکھا تھا۔ یوں کہ آنکھیں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جھکا ہوا سر اور جھکی ہوئی آنکھیں۔ خاموش لب، سادہ سا چہرہ، آنکھوں میں سادگی تھی، کوئی سوال نہیں تھا۔

صاف بات تو یہ تھی کہ بڑی مما اور میری مما کو کیف کی ماما پسند نہیں آئی تھیں اور جب گھر والے پسند نہیں آئے تھے تو پھر ایبک کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڈی اور پاپا خاموش تھے۔ فی الحال انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے ایبک سے ملنے یا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جبکہ مما اور بڑی مما نے صاف کہہ دیا تھا۔

"کافی بھری پُری فیملی ہے..... ایبک کے پانچ بھائی، ماں اور خیر سے معذور دادی بھی موجود ہیں۔ مجھے تو ساحی کے لیے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اوپر سے ایبک کی ماں نے ہمارے ساتھ کلام تک نہیں کیا۔"

"بڑا خاندان ہونے میں کیا برائی ہے۔" اس وقت تو ڈیڈی اور پاپا کی موجودگی کے باعث میں کچھ نہیں بولی تھی۔ تاہم ان کے اٹھنے کے فوراً بعد مجھ سے رہا نہیں گیا تھا سو بول اٹھی۔

"تمہیں کچھ پتا نہیں ساحی! یہ بڑوں کی بات ہے۔ ہمارے درمیان ہی رہنے دو۔ ہم جو مناسب سمجھیں گے۔ وہ ہی فیصلہ کریں گے۔" خلاف معمول مما نے مجھے بغیر ڈپٹے آرام سے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"ایک ہی تو پوائنٹ مجھے اپنے حق میں مناسب لگا تھا اور آپ اسی پر اعتراض کر رہی ہیں۔" میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ کسی بڑے خاندان کا حصہ بننا میرا خواب تھا۔ ایسا گھر، جس کے مکین میری تعلیم کی بجائے میرے سلیقے اور سگھڑاپے کے گن گائیں اور میں اپنے خلوص اور خدمت گزاری کے جذبے کی بدولت ان کے دلوں کو جیت لوں اور میں جانتی تھی، اس وقت مما اور بڑی مما نے مجھ پر فخر کرنا تھا۔ فی الحال تو وہ میرے اکلوتے پن کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھیں۔

"تم شروع سے تنہا اور پُرسکون ماحول میں رہنے کی عادی ہو بیٹا! تمہارے لیے ایک پورے کنبے کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گا۔" بڑی مما نے مجھے سمجھانا چاہا تھا مگر میں نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

"مما! یہ پوائنٹ تو بہت ویک ہے۔ میں ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔" بات تو کافی بے شرمی والی تھی۔ اپنے پرپوزل پر یوں کھلی ڈلی گفتگو کرنا مگر میں مشرقی لڑکی بننے کی اداکاری کر کے خاموش رہنے کے چکر میں اتنا اچھا پرپوزل ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اب تو کوئی ڈھنگ کا پرپوزل آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے جو خواتین ہمارے گھر آچکی تھیں۔ وہ سب سے پہلے میرے میٹرک میں گریڈ اور نمبر پوچھنے لگتی تھیں اور جنہیں خبر ہو جاتی تھی کہ میں نے میٹرک تین سال میں کلیئر کیا ہے۔ تو وہ مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھیں۔

"پلیز مما! محض اس وجہ سے آپ کیف کے گھر والوں کو انکار مت کیجیے گا۔" میں نے التجائیہ کہا تھا اور اب تو مجھے پورا یقین تھا کہ مما جوتی اتار ہی لیں گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس مما نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بھرائی آواز میں بولیں۔

"بیٹا! ہم تمہارے لیے ہر چیز پرفیکٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو۔ ہر ماں، باپ اپنی اولاد کے لیے حساس ہوتے ہیں۔" مما بہت دیر تک مجھے سمجھاتی بجھاتی رہی تھیں۔ زمانے کی اونچ، نیچ..... اتار چڑھاؤ زندگی کے نشیب و فراز..... اور میں خاموشی سے سر جھکائے سنتی رہی تھی۔ مگر میرا دل پھر بھی ایبک کے حق میں ووٹ دے رہا تھا۔

"ایک دفعہ دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" بہت دیر سوچنے کے بعد بڑی مما نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"مجھے سفینہ (کیف کی ماما) کا رویہ بہت عجیب لگا تھا بھابھی!" مما اور بڑی مما اب بہت دیر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں، سو میں چپکے سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

آنے والے بہت سارے دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے تھے۔ مما لوگ ایک دفعہ جہلم جا کر ایبک کو بھی دیکھ آئی تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا کے علاوہ اسود بھائی اور عماد بھائی بھی ایبک سے مل کر آئے تھے اور وہ انہیں ہر لحاظ سے اچھا لگا تھا۔

"اپنی ماں کی طرح ہے..... مہذب، خاموش..... باوقار اور۔" یہ مما کا ایبک کے لیے تبصرہ تھا۔ مما کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں اور میں ان کی خاموشی سے بے چین ہو گئی۔

"اور کیا بھلا؟ پُراسرار.....؟" میری زبان بھلا رک سکتی تھی۔ مما نے مجھے ہمیشہ کی طرح گھوری سے نوازا تھا۔

"نہیں..... بہت سنجیدہ مزاج۔" مما مجھے نہیں بلکہ غانی کو بتا رہی تھیں، جو خرابی طبیعت کی وجہ سے جہلم نہیں جا سکی تھی اور اب جھٹکے لینے کے لیے صبح صبح اسود بھائی کے ساتھ نازل ہو گئی تھی۔ اسود بھائی اسے ڈراپ کر کے اپنے آفس چلے گئے تھے۔

"ایبک کا بزنس اچھا چل رہا ہے ماشاء اللہ سے، اس نے چند سال میں ہی بہت ترقی کی ہے۔" بڑی مما ایبک سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھیں۔

"شکل و صورت کیسی ہے۔ گورا ہے؟ کالا ہے؟ سانولا ہے؟ کیسا ہے؟" غانی نے مچل کر پوچھا تھا۔ اب کے مما نے غانی کو گھورا۔

"بہت خوش شکل ہے۔ ساحی کے ساتھ جچے گا۔" جواب بڑی مما کی طرف سے آیا تھا اور اس جواب نے مجھے بھی مطمئن کر دیا تھا۔

ایبک سے چھوٹے چار اور بھائی تھے۔ سب سے بڑا ایبک تھا اور اس کے بعد کیف، عون، فائز اور اشعر تھے۔ اور یہ بات سن کر ہم حیران رہ گئے تھے کہ عون اور فائز دونوں شادی شدہ تھے۔ مما نے اس بات پر بھی خاصا اعتراض کیا تھا کہ بڑوں کو چھوڑ کر چھوٹے دونوں کی شادی کیوں کی ہے۔ ویسے میری مما کو اعتراضات تو اور بھی بے شمار تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ مما کو اپنی قدرے فربہی مائل، نالائق سی بیٹی کے لیے ایبک جیسا اسمارٹ، خوبرو اور لائق فائق لڑکا پسند آگیا تھا۔ سو بھرا پرا کنبہ بھی مما نے نظر انداز کر دیا تھا اور سفینہ آنٹی کا رویہ بھی۔

بڑوں کے درمیان تمام معاملات طے پا گئے تھے۔ اب مجھے بی اے کی بجائے بیاہ ہی کرنا تھا مگر نجانے کیوں سب کچھ حسب منشا ہونے کے باوجود اندر کہیں عجیب سی بے قراری چٹکیاں بھرنے لگی تھی اور میں کافی دن تک تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ شاید مما اور پاپا سے دوری کا احساس دل میں چبھن دے رہا ہے۔ دل کو اداسی کی دبیز چادر میں لپیٹ رہا ہے مگر یہ احساس پاپا کے گھر سے لے کر ایبک کے گھر تک میرے ساتھ رہا تھا مگر اس سے بھی پہلے کچھ اضطراب تو میرے اندر خود بخود بھرنے لگا تھا۔

ایک دن کیف چلا آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ جا کر اپنی شادی کی شاپنگ کر لوں۔ اس میں کوئی اعتراض والی بات بھی نہیں تھی۔ سو مما نے مجھے اجازت دے دی تھی۔

تقریباً" تین دن تک شاپنگ کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اگرچہ شاپنگ بھی میں نے نہ ہونے کے برابر کی تھی۔

ایک تو مروت میں کافی ہلکے پھلکے اور کم قیمت کے کپڑے لیے تھے۔ دوسرے مجھے ویسے بھی بھاری لباس سے الجھن ہوتی تھی اور جب لہنگے کی باری آئی تو کیف نے مجھ سے پوچھا۔

"لہنگا کیسا ہونا چاہیے؟"

"لہنگا نہیں۔"

"تو پھر؟"

"میں کچھ اور لوں گی۔" میں نے بھاری بھرکم لہنگے دیکھ کر ایک ہلکا سا نفیس کام والا شلوار قمیص پسند کرلیا تھا۔

"شاکنگ پنک لے لو، ایبک کو یہ کلر پسند ہے۔" کیف نے مجھے سرخ رنگ کا انتخاب کرتے دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ حالانکہ سرخ رنگ کو میں اپنا لکی کلر سمجھتی تھی۔ یہ رنگ میرا پسندیدہ تھا مگر اس کے باوجود میں نے ایبک کی پسند کو اولیت دی تھی۔

شاپنگ کے دوران یوسما ہمارے ساتھ رہی تھی۔ یوسما، کیف کی کزن اور منگیتر تھی اور جس طرح کیف اس پر دل کھول کر خرچ کررہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیف یوسما سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ کیف کی یوسما کے لیے محبت اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہورہی تھی اور میں وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ اتنی خریداری میں نے نہیں کی تھی، جس قدر یوسما نے کی تھی۔ مہنگے ترین کپڑے اور سونے کے زیورات، اس کے علاوہ بھی نجانے کیا کچھ۔

میرا سامان کیف نے میرے حوالے کردیا تھا اور یوسما پوری گاڑی اپنی چیزوں سے بھر کر جہلم چلی گئی۔ حالانکہ جب میں برائیڈل ڈریس خرید رہی تھی تب کیف برابر مجھے جتا رہا تھا۔

"ہاتھ ہولا رکھنا فرینڈ! تمہارے انہوں نے میری جیب میں کچھ خاص رقم بھر کر نہیں بھیجا۔"

"اپنے بھائی سے کہنا، وہ شادی کررہا ہے یا پھر برتھ ڈے سیلیبریٹ کررہا ہے۔" میں نے بھنا کر کہا تھا۔

اگرچہ مجھے خود ان باتوں کا خاصا خیال تھا مگر کیف کا بار بار جتانا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔

پھر ایک دن کیف نے اچانک فون کرکے مجھے حیران کردیا۔ "ایبک سے بات کروگی؟" وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"میں... مگر کیوں؟" میں گھبرا اٹھی۔ شادی میں چند دن تو رہ گئے تھے اور آج سے پہلے ادھر سے کوئی ایسا معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور پھر مما سے پوچھے بغیر میں بھلا کیسے بات کرسکتی تھی۔

"بس ایسے ہی، تم نہیں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔" کیف نے مزید کچھ سننے سے پہلے فون رکھ بھی دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ کیف کو بھی میں سمجھ نہیں پائی تھی۔ عجیب سا بندہ تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔

ان ہی الجھی سلجھی سوچوں سمیت شادی کا دن بھی آگیا تھا۔ اس دن عام لڑکیوں کی طرح مجھ پر بھی گھبراہٹ سوار تھی اور آنسو بھی وقتاً فوقتاً بغیر کسی وجہ کے گرتے جارہے تھے۔ مما اور بڑی مما میرے سامنے خود کو بشاش رکھنے کی کوشش کررہی تھیں مگر یہ کوشش کبھی کبھی ناکام ہو جاتی تھی۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھر کے لان میں شامیانے لگے تھے۔ رات کو مہندی کی تقریب کا انتظام ہوٹل میں تھا۔ البتہ بڑی مما کی خواہش تھی کہ رخصتی کسی ہوٹل سے نہیں، بلکہ گھر سے ہونا چاہیے۔

نکاح سے کچھ دیر پہلے میں نے عجیب سی دبی دبی سرگوشیاں سنی تھیں اور کچھ دیر بعد کھل کر بات سامنے آگئی۔ کیف نے مما سے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

"آنٹی جی! آپ نکاح نامے میں، حق مہر کے طور پر ایبک سے کچھ بھی لکھوالیں۔ ساحی کے تحفظ کے طور پر۔"

"پر بیٹا! اس کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ شرعی طور پر ہوگا۔ ہمیں منظور ہے۔" مما نے سلیقے سے کہا تھا۔

اگرچہ بات تو درست تھی مگر میرے والدین اس چیز کو کافی غیر مناسب سمجھتے تھے۔

"نہیں آنٹی! ضرورت ہے۔ یہ ساحی کا حق ہے۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا۔ "میں ایبک سے بات کرتا ہوں۔ وہ اپنا گھر، چار فرنچائز میں سے دو فرنچائز اور کارخانہ ساحی کے نام لکھ دے۔ یہ ساحی کا حق مہر ہوگا۔"

"مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔" مما گھبرا کر بولیں۔

"اتنا بھی زیادہ نہیں..." اس نے کہا تھا، "یہ ساحیہ کا حق ہے۔"

اس کا انداز دوٹوک قسم کا تھا۔ مما چپ سی ہوگئی تھیں۔ اگرچہ مجھے بھی یہ حق مہر بہت زیادہ لگ رہا تھا مگر میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ضرور بول اٹھتی۔

"ایبک کیا سمجھے گا۔ ہم کس قدر لالچی ہیں۔" مجھے یہی سوچ مارے ڈال رہی تھی۔ میں مما کو منع کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اور ڈیڈی کے ساتھ مولوی صاحب کو دیکھ کر خاموش ہوگئی تھی۔ اگرچہ سننے میں آیا تھا کہ ایبک نے کیف کے اس مطالبے پر کافی ناگواریت کا اظہار کیا تھا۔ وہ مان نہیں رہا تھا مگر نجانے کیسے کیف نے اسے منا کر ہی دم لیا۔ کیف کے خلوص اور ہمدردانہ فطرت کی میں کچھ اور قائل ہوگئی تھی۔

سفینہ بیگم یعنی کیف کی ماما اس وقت بھی کچھ نہیں بولی تھیں، جب حق مہر کے متعلق دبی دبی سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ تب بھی وہ خاموش اور سر جھکائے بیٹھی رہی تھیں۔ نہ ان سے کسی نے پوچھا تھا، نہ مشورہ لیا اور نہ ہی بڑھ چڑھ کر انہوں نے بولنے کی کوشش کی تھی۔ ایک چپ تھی ان کی، جو گھر آنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

بس انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خاموش لبوں سے ایک دعا دی تھی اور میرے لیے ان کی یہ دعا پوری زندگی کا حاصل تھی۔

"سدا سکھی اور آباد رہو۔"

* * *

ایبک کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات نے میرے سارے خدشات دور کردیے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ وہ ضرور حق مہر میں لکھوائی جانے والی لمبی چوڑی جائیداد کے طعنے دے گا، جتائے گا یا کبھی کبھار طنز کی مار مارے گا۔ تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے لیے ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ثابت ہوا تھا اور اس کی محبت پر پہلے روز ہی میرا دل ایمان لے آیا تھا۔ سب سے پرمسرت بات یہ تھی کہ اس نے میرے تعلیمی ریکارڈز کا ریکارڈ ہرگز نہیں لگایا تھا بلکہ اس معاملے میں بھی اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ عموماً وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی اس کی گپ شپ نہ ہونے کے برابر تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے بے حد محبت کرتا تھا اور مجھ سے بھی اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

"ساحیہ! مجھے امید ہے، تم میرے گھر میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگی۔ پلیز! میری ماں اور بھائیوں کی عزت کرنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ اس گھر میں سب سے مظلوم ہستی میری دادی ہیں۔ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈال رہا، بس دن میں کبھی کبھار ان کی خبرگیری کرلیا کرنا اور دوسرے نمبر پر میری ماں ہیں۔ ان کی ذات بھی قابل توجہ ہے۔ تھوڑا سا وقت انہیں بھی دے دیا کرنا اور بس، میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں۔ میں ہمیشہ تم سے مخلص رہوں گا اور تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ بس ایک وعدہ کرو، کبھی بھی اپنے دل کو کسی اور کے خیال سے آلودہ نہیں کروگی۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں مگر بے وفائی ہرگز نہیں۔ تمہیں کیف نے میرے لیے پسند کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم ہم سب کے حق میں بہتر ثابت ہوگی۔ ہم بھائیوں میں بہت پیار ہے۔ ہمارے اس پیار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے سرشار کردیا تھا۔

میرے لیے ایبک کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ جس طرح ایبک نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی تھی، اسی طرح وہ بھی میرے دل کے ہر گوشے میں سما گیا تھا۔

وہ ایسا ہی تو تھا۔ ہمیشہ چاہے جانے کے لائق، بہت اچھا، بہت نیک، ہر دلعزیز۔ ایسے ہی لوگ ہمیشہ دلوں پر حکومت کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ رخسانہ آنٹی اسی لیے تو ایبک کو اپنا داماد بنانا چاہتی تھیں۔ جب ادھر سے دل برداشتہ ہو گئیں تو پھر بیٹی اور شوہر کے پاس چلی گئیں۔

ایبک اور کیف کے علاوہ اعلا تعلیم کسی اور نے حاصل نہیں کی تھی۔ عون اور فائز دونوں نے انٹر کے بعد شادی کر لی تھی اور دونوں ہی ایبک کے کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ دونوں کو مناسب جاب ایبک نے ہی مہیا کی تھی۔ تاکہ وہ اپنی فیملی کا بوجھ خود اٹھا سکیں۔

اسعر ہاسٹل میں مقیم تھا۔ کم کم ہی گھر آتا تھا۔ البتہ عون اور فائز کی بیویاں نیما اور سمی گھر میں ہی ہوتی تھیں اور گل سے بھی بڑھ کر سست اور کاہل تھیں۔ پورا گھر نجمہ بی کے کندھوں پر تھا۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ جو مرضی پکا دیتی تھیں اور جیسا مرضی پکاتیں، یہ سب صبر اور شکر کر کے کھا لیتے تھے کہ گھر کی خواتین نے کبھی ضرورت کے وقت بھی کچن میں نہیں جھانکا تھا۔

کیف ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ان کے گھر میں سلیقے، قرینے کی بہت کمی تھی۔ تاہم یہ بات سراسر غلط تھی کہ کچن کیف سنبھالتا ہے۔ شاید اس وقت مذاقاً اس نے کہہ دیا ہو گا تاہم میں تو صرف نجمہ بی کو ہی ہر ایک پر رعب جماتے اور کاموں کا رونا روتے دیکھ رہی تھی۔

ایبک بہت مصروف رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ رات سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ نجمہ بی نے بتایا کہ ایبک کھانا باہر سے کھا لیتا ہے اور مجھے سالن کے نام پر ملغوبے دیکھ کر ان کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ ایسے ملغوبے سے باہر کا کھانا ہی بہتر تھا۔ مگر گھر کے مرد بے چارے بھلا کیا کرتے۔

ماما کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ وہ پورا دن عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ گویا انہوں نے دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ایک عرصے سے ان کی یہی روٹین تھی۔ تینوں وقت کا کھانا انہیں کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

اسی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ سی، آثار قدیمہ جیسی دادی بھی پلنگ پر چت لیٹے بس چھت کو گھورتی رہتی تھیں اور جب اس کام سے تھک ہار جاتیں تو پھر گہری نیند میں گم ہو جاتیں۔ نجمہ بی جیسے تیسے بدمزا سی یخنی انہیں پلا جاتی تھیں۔

نیما اور سمی نے کبھی ساس اور دادی ساس کے کمرے میں جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اے سی لگائے اپنے اپنے کمروں میں بند، ٹی وی دیکھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک بچہ تھا اور ان کی اپنی بے شمار مصروفیات تھیں، سو وہ گھر پر بھلا کیوں توجہ دیتیں۔ سونے، کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ ان کا تیسرا محبوب ترین مشغلہ پارلر کے چکر لگانا تھا۔ صحت اور حسن کو نکھارنے کے علاوہ کوئی اور کام ان کے پاس نہیں تھا۔

اس گھر کی خواتین کی روٹین دیکھ کر تو مجھے غش آنے لگے تھے۔

”نیما اور سمی گھر کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتیں۔“ میں پورا ہفتہ ماما کے گھر رہنے کے بعد واپس آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اسی گندگی، غلاظت نے استقبال کیا تھا۔ رانی اگرچہ صفائی کر کے گئی تھی مگر پھر بھی جگہ جگہ فروٹ کے چھلکے اور ٹافیوں کے ریپرز پڑے تھے۔ حتیٰ کہ صوفوں کے اوپر بسکٹس کا چورا بھی شان سے بکھرا ہوا تھا۔ اگر لاؤنج میں بیٹھ کر پیٹ پوجا کی گئی تھی تو پھر جھوٹے برتن اور چھلکے سمیٹنے میں کتنا ٹائم لگ جاتا تھا۔ رات کو ایبک اپنے مخصوص ٹائم یعنی ساڑھے گیارہ بجے گھر آیا تو میں نے کافی ناگواری سے اپنے بھرے دل کو خالی کرنا چاہا تھا۔

”وہ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتیں، سو اس لیے۔“ وہ فریش ہو کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ ایبک کو اور مجھے بھی ٹی وی سے دلچسپی نہیں تھی۔ سو ہمارے کمرے کا ٹی وی خاموش رہتا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں برا مان گئی۔ ”جس گھر میں قیام ہو، چاہے وہ کرائے کا ہی کیوں نہ ہو، اسے اپنا سمجھ کر اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا چاہیے۔“

”یہ تو تمہاری سوچ ہے۔“ اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

”مگر انہیں بھی ایسا سوچنا چاہیے۔ رانی ایک دفعہ صفائی کر جاتی ہے۔ پورا دن ہمیں خود ہی گھر کو صاف رکھنا ہوتا ہے۔ اگر گندگی یا پھیلاوا انہیں سمیٹیں گے تو اگلے دن تک بھلا کیا حالت ہوتی ہو گی۔ بچے اس گندگی میں کھیلنے لگتے ہیں۔ فرش سے گندی چیزیں اٹھا کر کھاتے ہیں۔ اسی لیے آئے دن ڈاکٹروں کے پاس بھاگی رہتی ہیں۔“ میں نے کلس کر کہا تھا۔ اپنا سجا سجایا میکے والا گھر دیکھ کر آئی تھی سو اسی لیے طبیعت خاصی اوب رہی تھی کیونکہ میرے پیچھے اس کمرے کی صفائی تک نہیں کروائی گئی تھی۔ فرنیچر پر گرد کی ایک تہہ چمک رہی تھی۔

”اب بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ عون اور فائز کو چاہیے، ان چیزوں کی طرف دھیان دیں۔ بیویوں سے نہیں کچھ اور نہ سہی، کم از کم کچن کی طرف توجہ خود دے لیا کریں۔ مہینے بھر کا راشن دس دن میں اڑ جاتا ہے۔ ظاہر ہے، جب گھر کی خواتین توجہ نہیں دیں گی تو ہر چیز کو ضائع کر دیا جائے گا مگر یہاں شروع سے ہی ایسے حالات ہیں۔ دادی اور ماما سیدھی سادی خواتین تھیں۔ پکانا، کھلانا آتا نہیں تھا۔ شروع سے ہی نجمہ بی سنبھالتی ہیں۔ نیما اور سمی نے یہی کچھ دیکھا ہے۔ سو انہیں جان مارنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ خیر چھوڑو، ان باتوں کو یہ بتاؤ، گھر والے کیسے ہیں؟ سفر میں پرابلم تو نہیں ہوئی؟“

ایبک نے بات بدل دی تھی۔ جس بات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا تھا۔ اس پر بھلا بحث میں وقت کیوں ضائع کیا جاتا۔ اب وہ میرا حال احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ میرے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بہت دھیان سے سنتا تھا۔ اگرچہ چھوڑ کر تو مجھے ایبک ہی آیا تھا تاہم واپس میں ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ ایک ہفتہ تک رہنا تو نہیں تھا مگر چونکہ عماد بھائی فیملی سمیت کراچی سے آ گئے تھے سو ان کے بچوں کے لیے میں وہاں رک گئی تھی۔ حالانکہ میرا ابھی مزید رہنے کا ارادہ تھا مگر ایبک نے مجھے ایک دن بھی اوپر نہیں رہنے دیا تھا۔

”مسئلہ تو کوئی نہیں تھا مگر میں نے آپ کو بہت مس کیا۔“ میں ہونٹوں میں مسکان دبائے مزے سے بولی۔ اگرچہ میں نے سچائی کو ظاہر کیا تھا مگر ایبک میرے اس سچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”سراسر جھوٹ۔ اگر مس کرنا ہی تھا تو میرے ساتھ ہی واپس آ جاتیں۔“

”پورے دو ماہ بعد گئی ہوں جناب، صرف ایک ہفتے کے لیے۔“

”اور میرے لیے یہ ہفتہ پورے دو ماہ کے برابر تھا۔ دن گزرتا تھا نہ رات۔“ وہ میری طرف دیکھ کر دلکشی سے مسکرا دیا۔

”سراسر جھوٹ، اگر ایسی بات تھی تو آ جاتے نا۔“ میں لاڈ سے بولی۔

”بس جی، کیا کریں..... مجبوری تھی۔“ ایبک نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیسی مجبوری؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”میری جان! کاروبار سلطنت کی مجبوریاں کیا کم ہیں۔ ذرا ادھر ادھر ہو جاؤں تو لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے بولا تھا۔

”کیوں بھلا، فائز اور عون وغیرہ ہوتے تو ہیں۔“

”مگر وہ اتنی توجہ نہیں دیتے۔ لاکھوں کا نقصان ان کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میری غیر موجودگی میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو وہ لوگ سنبھال نہیں سکتے۔ ابھی ناسمجھ ہیں۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گے۔“

وہ حد درجہ سنجیدہ تھا اور خاموش ہی رہتا تھا۔ کم بولتا تھا مگر بہت اچھا بولتا۔ زیادہ تر میں ہی اسے بولنے پر اکساتی تھی۔ خود سے کبھی بھی گفتگو کا آغاز نہیں کرتا تھا۔ ہاں، محبت لٹانے کے معاملے میں وہ کنجوس ہرگز نہیں تھا اور اظہار کے معاملے میں تو بالکل نہیں۔ اپنے مخصوص لہجے میں دھیما دھیما بولتا وہ سیدھا دل

میں اتر جاتا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ میرے بازو پر ہاتھ رکھے بڑی نرم گرم جذبے لٹاتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے علاوہ کچھ اور سوچ سکتی ہوں۔" میں اس کی محبت لٹاتی نظر سے نظر چرا گئی تھی۔

"ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔" اس کا گمبھیر لہجہ یوں ہی دل دھڑکا دیتا تھا۔

"بھلا کیسے؟" میں نے بوجھل پلکوں کو بمشکل اٹھا کر پوچھا۔

"تمہاری سوچوں میں، خیالوں میں، باتوں میں صرف میں ہوں، میرے علاوہ کوئی اور نہیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔

"میرا دل پکا ایمان دار ہے۔ بے ایمانی نہیں کرتا۔"

"اور میں اسے بے ایمانی کرنے بھی نہیں دوں گا۔" وہ میرے کان کے قریب گنگنایا تھا۔ ایبک کی قربت کا خمار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا میرے دل میں اتر آیا تھا اور میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کی آواز اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔

⁂

دن کچھ اور آگے سرکے تو گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے کچن ہی نہیں بلکہ پورے گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا اور میرے اس عمل سے کسی اور کو تو نہیں البتہ نجمہ بی کو خاصا دھچکا پہنچا تھا۔ انہوں نے دبے دبے لفظوں میں مجھے سمجھانا بھی چاہا تھا۔ ان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ میں امور خانہ داری سے دور ہی رہوں مگر میں نے ان کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

میرے کچن سنبھالتے ہی ہر چیز میں ترتیب اور نفاست نظر آنے لگی تھی اور خوش رنگ کھانے دیکھ کر تو کیف کے علاوہ عون اور فائز بھی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

اس گھر کے افراد کا ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ سب لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ رات کو مرد حضرات گھر میں ہوتے تھے مگر پھر بھی کھانا اپنے اپنے کمروں میں ہی کھایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود تقریباً سب ہی ہر روز نت نئی ڈشز کو دیکھ کر نہ صرف چونکے تھے بلکہ "فرداً" فرداً" سب ہی نے میرے ہاتھ کے ذائقے کو سراہا بھی تھا۔ ان میں نیما اور سمی بھی شامل تھیں۔

"ساحی بھابھی! آپ تو بڑا اچھا کھانا بنا لیتی ہیں۔ کیا باقاعدہ کورس کیا ہے۔" سمی تو کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہی تھی۔

"نہیں، میں نے اپنی بڑی مما سے سیکھا ہے۔" میں بھلا جھوٹ کیوں بولتی۔

"آپ میں بہت سلیقہ ہے بھابھی!" اب کے نیما نے کہا۔ ایک بات تو اچھی تھی کہ یہ دونوں میری تعریف سے نہ جلتی تھیں اور نہ ہی سراہنے میں بخل سے کام لیتی تھیں۔ اور پھر میں کون سا کسی سے تعریفی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کام کرتی تھی۔ یہ میرا گھر تھا اور ایبک کے حوالے سے اس گھر کا ہر کام میرے لیے اہم تھا اور ہر فرد اہم ترین۔

کچن کی حالت بہتر کرنے کے بعد میں نے دادی کا کمرا دیکھا تھا۔ وہ اس گھر کی بزرگ ہستی تھیں، مگر ان کی اہمیت اور حالت کسی ٹوٹے پھوٹے ناکارہ سامان سے بڑھ کر نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں نے ان کے لیے آئرن راڈ کا سنگل بیڈ منگوایا، جس کا گدا انتہائی نرم اور آرام دہ تھا۔ اس پرانے قدیم پلنگ کو اٹھا کر اسٹور روم میں رکھوا دیا تھا۔ دادی کے کمرے کے صدیوں پرانے پردے میل کچیل اور دھول مٹی کے باعث اپنی اصل رنگت کھو چکے تھے۔ انہیں اتروا کر کوڑے دان میں پھینکوایا اور نئے پردے دیے تھے۔ چھتیں، دروازے اور کھڑکیاں جھاڑیں۔ فرش کو سرف ڈال کر رگڑ رگڑ کے رانی سے دھلوایا۔ کمرے میں اتنے سالوں سے رچی بو کا دھیرے دھیرے ہی سہی خاتمہ ضرور ہو گیا تھا۔

دادی کے سارے کپڑے استری کروا کر الماری میں ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک سفید رنگ کا سوٹ انہیں نہلا، دھلا کر پہنا دیا۔

اور جب دوبارہ انہیں کمرے میں لایا گیا تو ان کی بوڑھی آنکھیں روشن روشن منظر دیکھ کر نمی کے باعث چمکنے لگیں۔ وہ بول نہیں سکتی تھیں مگر اشاروں سے انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ بہت خوشی محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلوایا اور میرے ہاتھوں اور سر کو چوما تھا۔ اس محبت کے اظہار پر میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ میں نے دادی کے سفید جھاگ جیسے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"دادی! اس میز پر کیلے رکھے ہیں۔ آڑو بھی موجود ہیں۔ یہ پھل نرم ہے۔ آپ آسانی سے کھا لیں گی۔ بوتل پانی بھی پاس ہی رکھا ہے۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو یہ گھنٹی بجائیے گا۔ رانی فوراً آ جائے گی۔ میں ابھی آپ کے لیے مزیدار سا سوپ بنا کر لاتی ہوں۔"

"ہاں، ہاں ہاں۔" دادی گویا میری بات سمجھ چکی تھیں، سو اسی لیے اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ میں نے ایبک سے کہہ کر ایک نرس کا بندوبست بھی کروا لیا تھا۔ یہ نرس بہت اچھی تھی۔ بیوہ عورت تھی۔ دادی کی جی جان سے دیکھ بھال کرنے لگی۔ انہیں نہلاتی، دھلاتی..... روزانہ نیا سوٹ پہناتی احتیاط سے کھانا کھلاتی تھی۔ وقت پر دوا دیتی۔

دادی کو خوش باش اور بہتر حالت میں دیکھ کر مجھے لگتا تھا گویا میرے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ اسی طرح ماما کا کمرا ابھی ابتری کا شکار تھا مگر پھر میرے ہاتھوں نے اس کمرے کو بھی سنوار کر ہی چھوڑا تھا۔ ماما نے بھی مجھے اپنی من مانی کرنے دی تھی۔ دادی کی طرح انہوں نے بھی خاموشی سے مجھے سراہا ضرور تھا اور میرے سر پر پہلے دن کی طرح ہاتھ رکھ کر خاموش سی دعا دی اور پھر تسبیح کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

گھر کا اندرونی نظام میرے ہاتھ میں کیا آیا، نہ صرف گھر میں سلیقہ نظر آنے لگا بلکہ کچن کے اخراجات بھی نہ ہونے کے برابر ہو گئے تھے۔ راشن ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اور جو پیسے بھی مختلف بلز اور راشن کے لیے ایبک دیتا تھا۔ ان میں سے بھی کافی بچ جاتے تھے۔ حالانکہ پہلے پہل مہینے میں دو دو دفعہ راشن آتا تھا۔

جوں ہی میں نے یہ بات نجمہ بی سے کی تو وہ ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔

"بٹو! میں بھلا کیا کروں..... کیف باؤ، راشن اور بل وغیرہ کے پیسے مجھ سے لے جاتے تھے۔ مگر نہ بل ادا ہوتا تھا اور نہ ہی راشن آتا۔ مجبوراً" میں پھر ایبک سے پیسے مانگنے کھڑی ہو جاتی تھی۔" نجمہ بی سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ انہیں بھلا اس بڑھاپے میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

"اگر کیف کو پیسے چاہییں ہوں تو ایبک سے مانگے۔ گھر کے اخراجات میں سے پیسے کیوں لیتا ہے۔" میں الجھ کر رہ گئی۔

"ان ہی کے پیسے ہیں جی، جہاں سے مرضی لیں۔ ہم تو اس معاملے میں بول نہیں سکتے۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"بٹو! میں ذرا آرام کر لوں..... اللہ تمہیں سکھ دے، جب سے آئی ہو۔ میری بوڑھی ہڈیوں کی بچت ہو گئی ہے۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تمام زندگی ان کا اسی گھر میں قیام رہا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں، سو ایبک، کے ابا قیوم انہیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ یہ ان کی خاندانی ملازمہ تھیں۔

میں اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ رات کے کھانے کی تیاری کرنا تھی مگر مما کی فون کال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ فون بند کر کے ابھی کچن میں قدم رکھا ہی تھا، جب کیف آندھی طوفان کی طرح چلا آیا۔

"نجمہ بی کہاں ہیں؟" مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا تھا۔

"وہ آرام کر رہی ہیں۔" میں چکن کا پیکٹ کھول کر گوشت کا حساب لگا رہی تھی کہ ایک پیکٹ سے رات کے لیے سالن بن سکے گا۔

"اور تم کیا کرنے لگی ہو؟"

"کھانے کی تیاری۔" میں نے ایک اور پیکٹ فریزر میں سے نکالتے ہوئے بتایا۔

"یہ کام نجمہ بی کے سپرد ہی رہنے دینا تھا۔"

"کیوں؟ میں نہیں کر سکتی کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر، خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ، تم نے اور ایبک نے ہنی مون کے لیے نہیں جانا۔" وہ کچھ کہتے کہتے بات پلٹ گیا تھا۔

"نہیں بھلا ہنی مون کے لیے جانا ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے۔ تم لوگوں کو کہیں گھومنے پھرنے ضرور جانا چاہیے۔" وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ یعنی اس کا ابھی مزید گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔

"تمہیں ایبک سے بات کرنا چاہیے تھی۔" وہ مجھے اکسا رہا تھا۔

"دیکھوں گی..... ایبک فارغ ہوں گے، تب ہی تو کہیں جائیں گے نا۔" میں نے ٹوکری میں سے پیاز نکال کر چھیلنا شروع کر دی تھی۔

"اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو گی تو پھر یوں ہی بیٹھی رہ جاؤ گی۔ وہ نہیں فارغ ہونے والا۔ یہ کاروبار، یہ روپیہ پیسہ اسے جان سے زیادہ پیارا ہے۔ ادھر ادھر ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب یہ تمہاری محبت پر منحصر ہے کہ تم اپنی بات اس سے منوا سکتی ہو یا نہیں۔" وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اگر تو تمہاری محبت کا پلڑا بھاری ہوا، پھر تو سمجھو تم کامیاب ہو گئیں۔"

"مجھے ایبک کی محبت پر شک نہیں ہے۔ اگر وہ فارغ ہوئے تو ضرور میری بات مان لیں گے مگر۔ مجھے ان کی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ سو اس لیے میں اپنی وجہ سے ایبک کو پریشان نہیں کر سکتی۔" میرا انداز دو ٹوک قسم کا خاصا اور روکھا تھا۔ تب ہی تو کیف کا لہجہ بھی بدل گیا اور گفتگو کا انداز بھی۔

"اتنی مشرقیت کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ ویسے ہی تمہارے دام میں پھنس چکا ہے۔"

"کیف!" میں اس کے الفاظ سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ "تم کس قسم کی لینگویج یوز کر رہے ہو؟"

"میں نے کچھ غلط کہا؟" وہ فوراً" معصوم بن گیا تھا۔ "میرے بھائی کو محبت کے دام میں الجھا تو لیا ہے۔ ویسے میں چاہتا بھی یہی تھا۔"

"کیف! ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ میں اس وقت تمہاری بڑی بھابھی ہوں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بدل چکا ہے۔" میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

"ہماری دوستی کا رشتہ تو ابھی تک قائم دائم ہے۔ دوست ہونے کے ناتے تم میرا ساتھ دو گی نا۔" وہ اتنے کھردرے لہجے میں بولا تھا کہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔

"کون سی دوستی؟"

"وہ ہی جو میرے تمہارے درمیان تھی۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟" میں اس کے بدلتے انداز دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ مذاق کے رنگ میں بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ گہرا طنزیہ، کاٹ دار قسم کا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔

"اب کیا ہے نا، دانش مندانہ سوال..... میں بھلا کیا چاہتا ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا تھا اور پھر بولنے لگا۔ اور میرا رنگ لحظہ بہ لحظہ فق ہوتا جا رہا تھا۔

* * *

نیما اور سمی بھی ان دنوں اپنے حجرے سے باہر نکل آئی تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں نے گھریلو امور میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اگر میں کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی تو سمی یا نیما فوراً" ساتھ دینے کے لیے آجاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں سالن پکا رہی ہوتی تو نیما برتن دھونے کھڑی ہو جاتی۔ آٹا گوندھ دیتی۔ حتیٰ کہ روٹی بھی پکا دیتی۔ نجمہ بی کی گویا چھٹی ہو گئی تھی۔ اب وہ صرف سودا سلف لا کر دیتی تھیں۔

دوسری طرف سمی کپڑے استری کرتی۔ مردوں کے الگ رکھتی۔ خواتین کے الگ رکھے جاتے۔ ان دونوں کی شخصیت میں در آنے والی تبدیلیوں نے فائز اور عون کو بھی چونکا دیا تھا اور وہ ان دونوں کے سدھر جانے کا تمام تر کریڈٹ مجھے دیتے تھے۔

ادھر کیف کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سب گھر والے اس طرح سے میرے گرویدہ ہو جائیں گے۔ ماما اور دادی کچھ کہتی تو نہیں تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجود شکر گزاری کے رنگ میری نظروں سے اوجھل نہیں تھے۔

نیما اور سمی فیشن سے لے کر اسکن کی کیئر تک ہر مشورہ مجھ سے لینے کے لیے بھاگی بھاگی چلی آتی تھیں۔ ان کے خیال میں میرے پاس معلومات کا بہت بڑا خزینہ موجود ہے اور میں بڑے شہر سے آئی تھی سو مجھے ہر فیشن کے بارے میں علم تھا۔ یہ تو نیما اور سمی کی سادگی تھی حالانکہ مجھے بدلتے فیشن کا کچھ پتا نہیں تھا مگر میں غانی سے مفید مشورے لے کر انہیں معلومات فراہم کرتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں میرے اور بھی قریب آگئی تھیں۔

ان کا زیادہ وقت اب میرے ساتھ گزرتا تھا۔ مل جل کر جھٹ پٹ کام بھی ہو جاتے تھے۔ گھر بھی صاف ستھرا ہو جاتا تھا اور پھر کافی دیر گپ شپ بھی چلتی رہتی۔ وہ دونوں صرف سونے کے لیے اپنے کمرے میں جاتی تھیں۔ زیادہ تر لاؤنج میں ہی بیٹھی رہتیں۔

اس دن بھی سمی اپنی بچی کا مجھ سے پوچھ پوچھ کر فراک سی رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دم میں نے میگزین ہاتھ سے رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے سمی سے پوچھا۔

"بہت دن ہوئے کیف گھر نہیں آیا۔"

"وہ گھر کہاں آتا ہے۔ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا ہے۔" وہ احتیاط سے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"مگر کیوں؟" میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایبک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

"پتا نہیں۔" صاف لگ رہا تھا وہ ٹالنے کی کوشش میں ہے۔

"کیوں پتا نہیں؟ یہ کہو، مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔" میں نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا اور میری ناراضی کے خیال سے وہ فوراً" بول اٹھی۔

"نہیں بھابھی! ایسی بات نہیں۔" وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ "دراصل پہلے ایبک بھائی اور کیف کی کبھی بنی نہیں تھی۔ کیف ہر وقت ایبک بھائی سے جھگڑتا رہتا تھا اور یہ جھگڑا شدت اختیار کر جاتا تھا۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک دفعہ کیف نے غصے میں ایبک بھائی کا سر پھاڑ دیا تھا۔ ایک دفعہ گولی بھی چلا دی تھی۔ مگر یہ کافی سال پرانی بات ہے۔ اب تو اس نے ایبک بھائی سے صلح کر لی ہے۔ پہلے سے کافی بدل گیا ہے، ورنہ تو ہر وقت خون سوار رہتا تھا اس کے سر پر..... پھر جب اس نے بتایا کہ وہ ایبک بھائی کے لیے لڑکی پسند کر چکا ہے۔ تو ہم سب حیران رہ گئے اور زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی تھی جب ایبک بھائی نے اس کی پسند کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

ان دنوں ہم لوگ ایبک بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے تھے۔ عون کا خیال تھا۔ ایبک بھائی کے ساتھ گل مناسب رہے گی مگر کیف کو گل پسند نہیں تھی اور یہ ہماری اور ایبک بھائی کی خوش نصیبی تھی کہ آپ ہمیں مل گئیں۔ دراصل پہلے پہل ہمارے ذہن میں تھا کہ آپ بہت مغرور اور نک چڑھی ہوں گی۔ اسی لیے میں اور نیما آپ سے ذرا دور دور رہی تھیں مگر آپ تو ہماری سوچوں کے بالکل برعکس نکلی ہیں۔"

وہ سادگی بھرے لہجے میں بتاتی چلی گئی تھی۔

"کیف کا جھگڑا ایبک کے ساتھ کس بات پر تھا؟" میں نے سوچوں کے بھنور سے نکل کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے۔"

"نیما کو پتا ہو گا؟" میں نے سمی سے پوچھا۔

"نہیں، میرے خیال میں نجمہ بی جانتی ہیں۔"

"اب تو ان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں؟" میں اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔ ایبک بھائی تو مزاجاً" بھی اور دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ کیف جذباتی اور غصہ ور ہے۔ تاہم ایبک بھائی نے کبھی بات نہیں بڑھنے دی۔"

وہ فراک سی چکی تھی۔ اب سامان سمیٹ رہی تھی اور میں گہری سوچوں میں ڈوب ابھر رہی تھی۔ دراصل میرا ذہن بری طرح سے الجھ چکا تھا۔

"آخر کیف نے مجھے کس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے؟ مجھے ایبک کے لیے پسند کرنا۔ حق مہر میں اتنی بھاری جائیداد لکھوانا۔" میرا ذہن ایک نقطے پر آکر ٹھہر چکا تھا۔ "بہرحال جو بھی ہے۔ کیف قیوم اپنے گھر والوں سے لے کر ایبک تک' سب کو دھوکا دے سکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ میں یعنی ساجیہ مراد اس کے جال میں کبھی نہیں پھنس سکتی اور میرا یہ خود سے عہد تھا کہ اس ساری پلاننگ کی وجہ آخر جان کر ہی رہوں گی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

* * *

یہ اس دن کی بات ہے' جب ایبک کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا اور ٹھیک اسی شب کیف چلا آیا۔ اس کے انداز آج کافی بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ کوئی فیصلہ کرکے آیا ہے۔ میں اس وقت کچن میں تھی اور وہ میرے پیچھے کچن میں ہی چلا آیا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔" اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ میری چھٹی حس نے فوراً" مجھے چونکا دیا۔

"کون سی بات؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس کے دھونس بھرے انداز نے مجھے بے حد غصہ دلایا تھا مگر میں پھر بھی ضبط کر گئی۔

"کہاں؟"

"بیٹھک میں..... مجھے تم سے تنہائی میں بات کرنا ہے۔"

"جو کہنا ہے۔ یہیں کہہ دو۔" میں پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر بڑے پُراسرار انداز میں بولا۔

"میرے ساتھ ایک ڈیل کرلو۔"

"کیسی ڈیل؟" اب کے میں سچ مچ ٹھٹک گئی تھی۔ بات معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ میرا دل خوف کے مارے سکڑنے لگا۔

"یہ گھر تمہارے نام ہو چکا ہے اور ایبک کی دو فرنچائز بھی..... تم ان کے کاغذات قانونی طور پر میرے نام کردو۔" اس نے گویا بڑے اطمینان سے آگ پر پیٹرول کے چھینٹے پھینکے تھے۔

"کیا مطلب؟" میں چیخ اٹھی۔

"چلاؤ مت' میری بات آرام سے سنو۔ میں نے یہ تمام کوششیں اسی وجہ سے کی تھیں۔ مجھے ایبک کا اور تمہارا اعتماد جیتنا تھا اور پھر اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ یوسما کے ذریعے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا مگر پھر اپنی زندگی کی پہلی اور بڑی خوشی کو کھودینے کے خوف نے مجھے تم تک پہنچا دیا۔ میں یوسما کو ایبک کے نکاح میں دے کر کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ حالانکہ یوسما کے ذریعے ایبک کی ساری پراپرٹی مجھے مل سکتی تھی۔ اب تو صرف اس گھر کی اور دو فرنچائز کی بات ہے۔ بہرحال تم مجھے تمام کاغذات دے دو۔ علاوہ ازیں نتائج کی ذمہ داری تم ہی پر ہو گی۔ میں تمہارے اردگرد ایک جال بن دوں گا۔ تم اس جال سے نکل نہیں پاؤ گی۔"

وہ گویا زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور میرے قدموں کے نیچے سے زمین دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی۔

"تم دھوکے باز ہو کیف! تم نے مجھے ہی نہیں' اپنے بھائی کو بھی دھوکا دیا ہے۔ جس کے ساتھ تمہارا خون کا تعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے' تمہاری گندی ذہنیت پر' لالچ پر' کمینگی دکھانے پر۔" میں گویا غصے کے عالم میں پھٹ پڑی۔

"کچھ بھی کہہ لو۔ کاغذات تو تمہیں دینے ہی پڑیں گے۔" اس نے گویا آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

"اور اگر نہ دوں تو؟"

"تو پھر اپنی تباہی کے لیے تیار ہو جانا۔ میں ایبک کو صاف لفظوں میں بتادوں گا کہ تم میری محبت میں گرفتار تھیں اور میرے مجبور کرنے پر تم ایبک سے نکاح کرنے پر تیار ہوئی تھیں تاکہ ایبک کی دولت ہم دونوں ہتھیالیں۔ تمہارے پاس موجود کاغذات تمہاری لالچ کے گواہ ہیں ___ ایبک کو مزید یقین دلانے کے لیے میں تمہاری اور اپنی دوستی کا قصہ بھی سنادوں گا۔ ایک دو گواہ بھی پیش ہو جائیں گے۔ پھر تم کیا کرسکو گی؟"

وہ گویا استہزائیہ مسکرا رہا تھا۔ میری بے وقوفی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے مجھے ہی نہیں' ایبک کے ساتھ بھی دھوکا کیا تھا اور نجانے اس نے مزید کیا کچھ کرنا تھا۔ میرا دل خوف کے مارے پھڑپھڑا رہا تھا مگر میں نے خود کو کمزور ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"میں تمہیں کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا کر رہوں گی۔ تم نے رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھا۔ کیا اتنے سال کالج اور یونیورسٹی میں یہی سیکھتے رہے ہو؟"

"زیادہ بڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ورنہ اپنی بربادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔" کیف نے گویا آخری وارننگ دی تھی۔

"تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو۔ اگر جائیداد کا کوئی جھگڑا ہے تو ایبک سے کہو۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے۔" میں گویا تھک کر بولی تھی۔

"اگر وہ آرام سے مان جاتا تو پھر مجھے اتنی بڑی پلاننگ کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہمارے حق پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور ہمیں اپنے کاروبار میں تنخواہ دار ملازم رکھنا چاہتا ہے۔ مائی فٹ! اس کی چاکری کرتی ہے میری جوتی۔ اسے ہر صورت مجھے برابر کا حصہ دار بنانا ہو گا ورنہ میں ہر حد سے گزر جاؤں گا۔" وہ دہاڑ کر بولا۔

"آئم سوری کیف! میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔ مجھے اپنے شوہر کا اعتبار اور مان عزیز ہے۔ میں اس کے اعتماد کا خون نہیں کرسکتی۔" میرے دو ٹوک فیصلہ کن انداز نے اسے بھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔

"میں تمہیں ایبک کی زندگی سے نکال پھینکوں گا۔" وہ غصے کے مارے کف اڑا رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ وہ مجھے ایبک کی زندگی سے باہر نکال چکا تھا۔ یہ اسی مان' اعتبار اور اعتماد کو بچانے کا نتیجہ تھا' جو میں اپنی ماں کے گھر واپس آچکی تھی۔ ایبک نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا تھا مگر اس کے چند الفاظ نے میرے جسم سے گویا جان تک نکال لی تھی۔

"مجھے دکھ ہوا ہے ساجیہ! میرا دل اس وقت صدمے کے زیر اثر ہے۔ میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش نہیں آنا چاہتا۔ تم ابھی چلی جاؤ' ڈرائیور باہر منتظر ہے۔ اگر میں اس صدمے اور دکھ کی کیفیت سے سمجھوتا کرکے سنبھل گیا تو تمہیں لینے آجاؤں گا۔ ورنہ ہمارے راستے جدا ہیں۔ تم وہ کاغذات بھی ساتھ لے جانا۔ میں تحفہ دے کر واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

دھیما لہجہ' جھکی آنکھیں اور ضبط کی سرخیوں سے سجا چہرہ..... اس نے نہ وضاحت طلب کی تھی اور نہ ہی مجھے خود سے دور کرنے کی وجہ بتائی..... مگر میں جان تو چکی تھی کہ کیف کی خود غرضی اور کمینگی رنگ لے آئی ہے۔

میں نے اسی شب سامان باندھا تھا اور خالی دل لیے ایبک کے گھر سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے دادی' ماما اور نینا' سمی کو منتظر اور روتا چھوڑ کر..... مگر پورے ڈیڑھ ہفتے بعد بھلا کیا ہوا؟

* * *

"آپ....." میں نے پردے برابر کرکے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گویا پتھر ہو گئی تھی۔ ایبک عین میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ کب دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تھا' مجھے

قطعاً" خبر نہیں ہو سکی۔ اپنی تلخ اور زہریلی سوچوں میں گم کھڑکی کے سامنے کھڑے کھڑے میری ٹانگیں گویا شل ہو کر رہ گئی تھیں۔

"ہاں میں...... کیا تمہیں امید نہیں تھی کہ میں واپس آؤں گا۔" وہ ہی مخصوص نرم اور دھیما لہجہ۔ میرے دل کی دھڑکنیں اول روز کی طرح بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

"جس طرح مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بھلا کوئی امید باقی رہ گئی تھی کیا؟" نجانے کہاں سے ڈھیروں آنسو میری آنکھوں میں خود بخود اتر آئے تھے۔

"وہ وقت اور لمحے ہی کچھ ایسے تھے۔ ابھی تک اپنے ان الفاظ پر پچھتا رہا ہوں مگر میں بھی بھلا کیا کرتا' کیف نے کہانی ہی کچھ اس طرح سے سنائی تھی کہ اس کے حرف حرف پر اعتبار آ گیا۔ تم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ یہی میری سب سے بڑی نادانی تھی جس پر ابھی تک پشیمان ہوں۔ جو کچھ وہ بتا رہا تھا' میری طرح کوئی بھی آدمی ان باتوں کے جال میں پھنس سکتا تھا۔" وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" میں ابھی لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جب ایبک نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

"پلیز ساحی! پہلے میری بات سن لو۔ پھر جو کچھ کہو گی' میں سنتا رہوں گا۔ جو سزا سناؤ گی۔ مجھے منظور ہو گی۔" وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ گویا کہہ دینے یا نہ کہنے کے درمیان الجھ رہا تھا۔ پھر جب بولا تو آواز میں ہمیشہ والا ٹھہراؤ تھا۔

"بات کہاں سے شروع کروں...... بہت پہلے سے' جب میں چوہدری قیوم کے آنگن میں کھیلنے والا پہلا بچہ تھا۔

پورے آٹھ سال تک میں پہلا اور آخری بچہ ہی رہا تھا۔ اس دوران میرا کوئی اور بھائی اس دنیا میں نہیں آیا۔ میرے دادا کے لیے یہ بات خاص تشویش ناک تھی مگر انہوں نے مجھ پر ہی گویا صبر کر لیا تھا۔ ان کی مجھ سے محبت کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی واحد خوشی سمجھتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں گونگے والدین کی اولاد تھا۔ میری ماں اور باپ دونوں قوت گویائی سے محروم تھے۔ میرے ابا' دادا کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی زمینوں اور کارخانے کے اکلوتے وارث۔

ان کے ہاں' میں پہلا صحت مند بچہ پیدا ہوا تھا۔ میرے دادا کے لیے میری پیدائش ہفت اقلیم کی دولت کے برابر تھی۔ انہوں نے جی بھر کے میرے ناز اٹھائے تھے۔ مجھے بے تحاشا محبت سے نوازا تھا۔ میں ان کی محبت کے حصار میں خود کو ہمیشہ محفوظ سمجھتا تھا مگر یہ حصار تب ٹوٹ کر بکھر گیا جب میرے دادا اس دنیا سے چلے گئے مگر جانے سے پہلے وہ اپنی ساری جائیداد میرے نام کر گئے تھے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد یکے بعد دیگرے میرے چار اور بھائی پیدا ہوئے۔ اور پھر ہمارے ابا معمولی سے بخار میں چل بسے۔ تب میں کافی سنبھل چکا تھا اور کچھ وقت کی سختیوں نے مجھے اچھی طرح سے سارے سبق پڑھا دیے تھے۔

میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ تب کیف بہت ناسمجھ اور نادان تھا اور میری نظر میں تو بالکل بچہ تھا۔ مجھے اپنی ماں اور بھائیوں سے بہت محبت ہے۔ اسی محبت نے مجھ سے بے تحاشا جدوجہد کروائی۔ میں نے اپنے قوت بازو پر' اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنا گھر بنایا تھا۔ چار فرنچائز خریدیں۔ ایک دم سے سارا کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ بے تحاشا محنت اور قربانیوں کے بعد میں اپنا ایک نام بنا پایا تھا۔

تب کیف پڑھنے کے لیے ہاسٹل میں مقیم تھا اور ماما کی کسی کزن کے گھر بھی اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ انہی کی بیٹی یوسما سے وہ شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس بات سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ ہماری رشتے کی اس خالہ نے یعنی یوسما کی ماں نے میرے خلاف کیف کے دل میں زہر بھرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کیف اپنے حصے کی جائیداد لے کر ان کے پاس آ جائے اور جب میں نے ایمان داری کے ساتھ قانونی طور پر اپنے چاروں بھائیوں کو دادا کی جائیداد کا حصہ دار بنایا تو ہم سب کے حصے میں تھوڑی تھوڑی سی پراپرٹی آئی۔ یہی بات ہماری خالہ کو بھڑکا گئی تھی۔ ان کی نظر میرے کاروبار پر تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے بزنس میں سے بھی کیف کو حصہ دوں۔ ظاہر ہے' میں نے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں کیف مجھ سے بدگمان ہو گیا۔ میرے ساتھ جھگڑتا رہا۔ بات خون خرابے تک آ گئی تھی۔ میں کیف کو حصہ دار بنا بھی لیتا اگر بیچ میں خالہ اور ان کی بیٹی نہ ہوتی۔

یہ مسئلہ ضد اور انا کا بن گیا تھا۔ میری اور کیف کی ناراضی چل رہی تھی۔ ایک دن وہ خود میرے پاس چلا آیا۔ اپنی گزشتہ غلطیوں کی معافی مانگتا رہا تھا میں نے بھی کھلے دل سے اسے معاف بھی کر دیا۔ ہمارے پہلے کی طرح تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ یہ سب ایک سازش اور منصوبے کی کڑی ہے۔

پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ پھوپھو کے پڑوس میں قیام پذیر فیملی سے خاصی انڈر اسٹینڈنگ رکھتا ہے اور ان کی بیٹی کو وہ میرے لیے پسند کر چکا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ہمارے اس طرح کے معاملات نمٹاتی۔ فائز اور عون کی شادیوں کے تمام معاملات اسی نے ہی دیکھے تھے۔

اگرچہ فائز اور عون نے لو میرج کی تھی۔ دوران تعلیم ہی دونوں پر شادی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا' احسن طریقے سے ان کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ ماما کی ساری ذمہ داریاں کیف نے ہی نبھائیں۔

ادھر کیف نے مجھے جو کچھ تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے لگا' تم میرے آئیڈیل کا ایک حصہ ہو۔ میرے دل نے تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا تھا اور میں بغیر دیکھے ہی تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ ہماری ماں ایسے معاملات نہیں دیکھ سکتی۔ جو کچھ کرنا تھا' کیف نے ہی کرنا تھا اور وہ اپنی پلاننگ کے تحت سب کچھ کرتا رہا اور میں اپنی سادہ دلی میں اس سے ہمیشہ دھوکا کھاتا رہا۔

شادی کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے لیے جب رقم کم پڑ گئی تو وہ دوبارہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا۔ اگر مجھے سمجھنا ہوتا تو میں تب ہی سمجھ جاتا مگر میں نے شک اور بدگمانی کو کبھی دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ پھر حق مہر کے طور پر اتنی بھاری جائیداد پر کیف کی ضد اور اصرار...... میں حیران ضرور ہوا تھا مگر چونکا پھر بھی نہیں۔ میں نادانستگی میں وہ ہی سب کچھ کرتا رہا' جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا تھا۔

میرے لیے سب سے بڑا انعام تم تھیں ساحیہ! ایسا انعام جو مجھے کیف کے توسط سے ملا۔ میں تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا تھا۔ مجھے تم سے اور تمہارے خالص جذبوں سے بھرے دل سے محبت ہو گئی تھی۔ تب کیف نے سوچا کہ بازی الٹتی جا رہی ہے اور وہ اس بازی کو اپنے حق میں کرنے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کر گیا یعنی تمہارے ساتھ دو بدو گفتگو کر کے۔ ایسی گفتگو جو کسی نے من و عن سن لی تھی اور پھر مجھے بھی سنا دی۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ اپنے زرخیز دماغ کو لوگوں کے گھر اور دل اجاڑنے کے لیے کیسے استعمال کر لیتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ میرے دل میں شک کی آگ جلا کر خود وہ اپنے دل کو آباد کرنے گیا تھا مگر ہماری لالچی اور خود غرض خالہ نے کل رات یوسما کو ایک کروڑ پتی سیٹھ سے بیاہ دیا اور کیف قیوم کے دل پر گویا شام غریباں اتر آئی۔ اس صدمے میں وہ بائیک سے ٹکرا کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ ادھر آنے میں اسی لیے دیر ہو گئی تھی کہ مجھے اس کے پیچھے ہسپتال جانا پڑا۔

دیکھو' ساحی! مجرم تو وہ ہم دونوں کا ہے مگر میں نے اسے تمہاری طرف سے بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا کروں' میری قوت گویائی سے محروم ماں' بول نہیں

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

سکتی۔ مجھے حکم نہیں دے سکتی۔ مگر اس کی آنکھوں کی التجا کو لوٹا دینا میرے بس میں نہیں ہے اور میری ماں کی خواہش ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تم بھی میرے ساتھ ہو۔ کیا تم میری ماں کی خواہش پوری کرو گی؟"

وہ آنکھوں میں آس کے دیے سجائے منتظر کھڑا تھا۔ میری ایک ہاں نے اس کے چہرے کو تابناکی بخش دینا تھی۔ مگر میں بھی پورے ایک ہفتے کی ناراضی کا حساب لیے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ ایک مجرم نہیں تھا۔ مجرم تو وہ تھا' جو لالچ میں اور یوسما کے حصول کی خاطر خون کے رشتوں کو کھو دینے والا تھا۔ اب اس مجرم کو بھلا اور کیا سزا دی جانی تھی۔ بے چارا دل تڑوانے کے ساتھ ساتھ ٹانگ بھی تڑوا چکا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ پشیمان تھا' شرمندہ تھا۔ سو میں نے سوچا تھا کہ ایک پشیمان کو بھلا اور پشیمان نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔

مگر ایک کو ستانے کا میں پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔ سو اسی لیے خود پر ناراضی کا خول چڑھائے بولی۔

"میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی ایبک! آپ واپس چلے جائیں۔ میں اپنی انسلٹ نہیں بھول سکتی۔ آپ نے بغیر وضاحت لیے مجھے گھر سے کیوں نکالا؟"

"مجھے معاف کر دو ساحی! میں واقعی شرمندہ ہوں۔" ایبک میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا اٹھا۔ وہ ہر صورت مجھے منانا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ایبک کو منانا آتا ہی کہاں تھا اور ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ مجھے کیسے منائے کہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھلا اور سمی اور نیتا کمرے میں داخل ہو کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

"ہم آپ کو زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے بھابھی! اللہ کی قسم آپ کے بغیر پورا گھر ویران ہو گیا ہے۔"

سمی اور نیتا بھرائی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کی بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے ایبک کو دیکھا تو وہ معصوم صورت بنا کر بولا۔

"اللہ کی قسم! میرا دل اور کمرا بھی ویران ہے۔"

میری نظر ایبک کے چہرے سے ہٹ کر ایک اور چہرے سے الجھ گئی تھی۔ یہ چہرہ ماما کا چہرہ تھا مگر میں جانتی تھی کہ یہ خاموش آنکھیں اور اداس چہرہ کیا التجا کر رہا ہے۔ مجھے اس لمحے ٹوٹ کر اس عورت کی خاموشی پر پیار آگیا تھا۔

کچھ لوگ اس خاموشی کو پُراسراریت سمجھتے تھے مگر میں جانتی تھی' یہ پراسراریت نہیں۔ اس خاموشی میں ایبک کی ماں کا بھرم پوشیدہ ہے۔ آج بھی میرے گھر والے اس حقیقت سے ناواقف تھے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ سفینہ بیگم کیوں خاموش رہتی ہیں اور نہ ہی میں نے کسی کو بتانے کی کوشش کی تھی کہ ماما خاموش کیوں ہیں۔ وہ قوت گویائی سے محروم ہیں۔

میری سوچتی ہوئی نظر نے اس لمحے ایک مرتبہ پھر ماما کے پاکیزہ چہرے کا طواف کیا تو ان کے چہرے کی التجا میرے دل پر گویا جا لگی۔

"ساحی! چلو نا' میرا گھر اور میرے بچے کا دل سچ مچ تمہارے بغیر ویران ہے۔"

میرے دل کو ایک دم کچھ ہونے لگا تھا اور میں بھاگ کر ماما سے لپٹ گئی۔ بدگمانی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ دلوں پر جمی گرد صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے گھر والوں اور ایبک کے گھر والوں کے چہرے پر چھلکتی خوشی کو دل سے محسوس کیا تھا اور گویا کھل کر مسکرا دی۔

کالے' اودے' سرمئی' سیاہ بادلوں کے پیچھے کا منظر ـــــ خود بخود صاف ہو گیا تھا۔ اب ستاروں سے بھرا آسمان میرے سامنے تھا' اور میں نے کہکشاؤں کی بارات کو اپنے گھر میں اترتے دیکھا اور مسکرانے لگی۔

امکاں صورت ما

زیست سفر میں، لاکھ کدورت
لیکن تم ہی
روزِ ازل سے امکاں صورت
کٹھن مراحل کب رہتے ہیں
رستے سارے کٹ جاتے ہیں
سفر کی مشکل ہنس کر جھیلو
آبلہ پائی ایک حقیقت
سر کا سودا ہے سلامت
آئے نہ جنبش پائے جنوں میں
زنداں میں ظریفؔ احسن
رقص ہمارا جاری ہے
زنجیر کا نغمہ جاری ہے

ظریف احسن

* * *

خالی ہاتھ کا دکھ ایسے کیوں تڑپاتا
صحرا تھا وہ شخص تو پیاس ہی دے جاتا

ہجر کی دھوپ میں چوبِ خشک ہوئے ہم
راکھ نہ کرتا تو وہ پھر صدیوں سلگاتا

سود و زیاں کا روز حساب کیا جائے
اپنوں میں کب کھلتا ہے ایسا کھاتا

جبر میں ساری بات انا پر آتی ہے
چاہت میں تو جو جی چاہے منواتا

میرے ساتھ الجھ کر بات بڑھا بیٹھا
جو الجھن تھی دھیرے دھیرے سلجھاتا

محفل میں جس بات پر برہم ہو بیٹھا
دھیرج سے تنہائی میں وہ سمجھاتا

سب سے اچھی بات تمہاری ہے مولا
سب سے اچھا رنگ تمہارا ہے داتا

حمیدہ شاہین

ان کے نام جو امن اور آزادی کی جدوجہد میں کام آئے

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں چھن چھن چھن چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجان
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟"
"اے پوچھنے والے پردیسی!
یہ طفل و جواں
اس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم مرجاں
جگ مگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن"

فیض احمد فیض

ایک دکنی غزل

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارا گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا

تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فرصت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا

اب کے تو خزاں ایسی ٹھہری وہ سارے زمانے بھول گئے
جب موسمِ گل ہر پھیرے میں آ آ کے دوبارا گزرے تھا

تھی یاروں کی بہتات تو ہم اغیار سے بھی بیزار نہ تھے
جب مل بیٹھے تو دشمن کا بھی ساتھ گوارا گزرے تھا

اب تو ہاتھ سجھائی نہ دیوے لیکن اب سے پہلے تو
آنکھ اٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا گزرے تھا

فیض احمد فیض

شگفتہ جاہ

رنگارنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، پھر جب اسے پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔"

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

ترجمہ:۔ آپ کے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے جب وہ بستیوں میں رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے۔"

فوائد و مسائل:۔

مجرم کو اگر اللہ کی طرف سے فوری سزا نہ ملے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چھوٹ گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ایک خاص وقت تک مہلت دیتا ہے پھر اچانک پکڑ لیتا ہے۔ مجرموں کو مہلت دینے میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا اظہار ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ہدایت قبول کر لیں اور اس طرح وہ عذاب سے بچ کر انعام کے مستحق بن جائیں۔

سخاوت اور دریادلی

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ایک دفعہ نماز میں مشغول تھے کہ گلی میں ایک سائل کی آواز کانوں میں پڑی۔ جلدی جلدی نماز ختم کر کے باہر نکلے۔ صدا دینے والے سائل کی خستہ حالی دیکھی تو اپنے خادم قنبر کو آواز دی۔ وہ حاضر ہوا تو پوچھا۔

"ہمارے اخراجات میں سے کیا بچ گیا ہے؟"

قنبر نے جواب دیا۔"آپ نے دو سو درہم اہل بیت میں تقسیم کرنے کو دیے تھے۔ وہ ابھی تقسیم نہیں کیے گئے ہیں۔"

فرمایا۔"ساری رقم لے آؤ۔ اہل بیت سے زیادہ مستحق آگیا ہے۔"

قنبر نے دو سو درہم لا کر دیے تو سب کے سب اس سائل کو دے دیے اور ساتھ ہی معذرت کی کہ "اس وقت میرا ہاتھ خالی ہے۔ اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکتا۔"

آپؓ صدقات و خیرات کے علاوہ اہل علم کی سرپرستی بھی کرتے تھے اور ان کو انعام کے طور پر بڑی بڑی رقموں سے نوازتے رہتے تھے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مجالس وقار اور متانت کا مرقع ہوتی تھیں۔ لوگ ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ اور ان کے سامنے ایسے سکون اور خاموشی سے بیٹھتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں ۔۔۔ وقار، متانت اور بلندیٔ مرتبت کے باوجود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تمکنت اور خود پسندی سے کوسوں دور تھے۔ بے حد حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے۔ نہایت کم حیثیت کے لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ فقراء کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے حضرت امام حسین رضؓ کو دیکھ کر اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔

آپ رضی اللہ عنہ سواری سے اتر پڑے اور فرمایا۔

"بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

پھر ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ فارغ ہوئے تو ان سب کو دعوت پر بلایا۔ جب وہ لوگ حاضر ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے گھر والوں کو حکم دیا جو کچھ ذخیرہ ہے، وہ سب بھجوا دو۔"

لاڑکانہ

استاد قمر جلالوی نے لاڑکانہ نام کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کہا۔

"پرانے زمانے میں ایک راجا تھا۔ جو محل میں بہت سی رانیوں کی موجودگی کے باوجود اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ ولی عہد کی خواہش میں فقیروں، جوگیوں، سادھوؤں، سنتوں کی خدمت میں حاضری دی۔ ٹونا ٹوٹکا، جادو، منتر جس نے جو بتایا وہ کیا مگر کوئی مراد نہ ملی۔ آخر ایک دن راجہ کو معلوم ہوا کہ اب جہاں موجودہ شہر لاڑکانہ ہے، اس ویرانے میں ایک سادھو دھونی رمائے بیٹھا ہے جو اس کے پاس جاتا ہے، من کی مراد پاتا ہے۔ راجہ بھی پاپیادہ اس طرف روانہ ہوا۔

راجہ کی صورت دیکھتے ہی سنیاسی چلایا۔

"لڑکا ۔۔ نہ ۔۔ لڑکا ۔۔ نہ۔"

یعنی میرے پاس آنے سے تیری تقدیر کا لکھا نہیں بدل سکتا۔ تیری قسمت میں لڑکا نہیں ہے۔ راجہ تو مایوس و نامراد ہو کر واپس چلا گیا مگر اس دن سے وہ علاقہ "لڑکانہ" ہو گیا۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

دھوکا دہی

دھوکا دہی کے وقت ہمارا تصور اتنا محدود کیوں ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے فقط ایک شخص کو دھوکا دیا ہے جبکہ درحقیقت ہم ایک فرد، ایک دل، ایک ذہن، ایک ارادے، ایک خاندان، ایک نظام اور معاشرتی نظام کو دھوکا دیتے ہیں کیونکہ ایک انسان سے کم از کم اتنے روابط تو ہوتے ہیں۔

مسرت جبیں۔ سعودی عرب

ڈر کے مارے

دو گپ باز دیہاتی نوجوان مصروف گفتگو تھے۔

ایک بولا۔"میرے ابا پرندوں کو ڈرانے والے پتلے بنانے میں بہت ماہر ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے ایسا پتلا بنا کر کھیتوں میں کھڑا کیا کہ پورا ایک سال ایک پرندہ بھی ہمارے کھیتوں کے قریب سے نہیں گزرا۔"

دوسرا بولا۔"یہ کوئی خاص بات نہیں ہے میرے ابا نے ایسا پتلا بنا کر کھیتوں میں لگایا کہ جو پرندے پچھلے سال ہمارے کھیتوں سے دانہ دنکا چگ گئے تھے، وہ سارا ڈر کے مارے واپس کر گئے۔"

صائمہ عمران۔ لاہور

شیطان

شیطان نے فرعون کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرعون نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

شیطان اندر آگیا اور کہنے لگا۔

"لعنت ہے تمہاری خدائی پر۔ دعوا تو تم خدائی کا کرتے ہو اور یہ تک نہیں جانتے کہ دروازے پر کون ہے؟"

نوشین اقبال۔ گاؤں بدر مرجان

حضرت علیؓ نے فرمایا

- صبر ایسی سواری ہے جو کبھی اپنے سوار کو گرنے نہیں دیتی۔
- ہمیشہ سچے لوگوں سے دوستی رکھو کیونکہ وہ اچھے دنوں میں سرمایا اور برے دنوں میں محافظ ہوتے ہیں۔
- نیت کتنی بھی اچھی ہو، دنیا آپ کو آپ کے دکھاوے سے جانتی ہے اور دکھاوا کتنا بھی اچھا ہو خدا آپ کو آپ کی نیت سے جانتا ہے۔

عابدہ صابر۔ دینالہ خورد

بے قصور

ایک شرابی شراب پینے سے تنگ آگیا اور خالی

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors.
for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

بوتلیں توڑنے لگا۔

ایک توڑی: "تیری وجہ سے میری نوکری چلی گئی"

دوسری توڑی: "تیری وجہ سے میرا گھر تباہ ہو گیا۔"

تیسری توڑی: "تیری وجہ سے میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔"

چوتھی اٹھائی تو وہ بھری ہوئی تھی۔ اسے رکھ کر بولا۔

"تو سائیڈ پہ ہو جا۔ تیرا کوئی قصور نہیں۔"

بلقیس افتخار۔ سیالکوٹ

غصہ پی جانا

عبداللہ بن صیادفی ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اندر سے آپ کی کنیز آئی اور تیزی سے نکل گئی۔ پاؤں کی ٹھوکر سے راستہ میں رکھی روشنائی کی شیشی الٹ گئی۔ امام صاحب نے ذرا غصے میں فرمایا۔

"کیسے چلتی ہے؟"

کنیز بولی: "جب راستہ نہ ہو تو کیسے چلیں؟"

امام صاحب یہ جواب سن کر انتہائی تحمل اور بردباری سے فرماتے ہیں۔

"جا میں نے تجھے آزاد کیا۔"

صیادفی کہتے ہیں کہ میں نے کہا۔ "اس نے آپ کو غصہ دلانے والی بات کہی تھی، آپ نے اسے آزاد کر دیا۔" فرمایا۔

"حدیث شریف میں آیا ہے: "اے ابن آدم! جب تجھے غصہ آئے تو اسے پی جا۔ جب مجھے تجھ پر غصہ آئے گا تو میں پی جاؤں گا۔"

سعدیہ محمد حسین

رشک

دو دوستوں پر رشک کرنا چاہیے۔ ایک وہ جو دولت مند ہو اور اللہ کے راستے پر مال خرچ کرتا ہو اور دوسرا وہ جو عالم ہو اور علم کے ذریعے فیصلے کرتا ہو۔

دیا نورین۔ ڈہرکی

زندگی

سقراط سے سوال کیا گیا۔

"موت سے بھی سخت تر کوئی چیز ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "زندگی" کیونکہ ہر قسم کے رنج اور مصیبتیں زندگی ہی میں سہنی پڑتی ہیں جبکہ موت اس سے رہائی دلاتی ہے۔"

عنبرین اقبال۔ گاؤں بدر مرجان

ربِ کائنات

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک کھانا تناول نہ فرماتے جب تک کوئی مہمان دسترخوان پر موجود نہ ہوتا تھا۔

ایک دن کوئی بھی مہمان نہ آیا تو وہ مہمان کی تلاش میں بستی سے باہر گئے۔ وہاں ایک بوڑھا راہ گیر جا رہا تھا۔ حضرت ابراہیم اسے لے آئے اور کھانے میں شریک کیا لیکن کھانا شروع کرتے وقت اس نے اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا۔ حضرت ابراہیم نے دل میں ارادہ کیا کہ ایسے ناشکرے کو آئندہ کبھی اپنے دسترخوان پہ نہیں بلواؤں گا۔ اسی لمحے غیب سے آواز آئی۔

"اے ابراہیم! اس بوڑھے نے ایک دفعہ شکر ادا نہ کیا تو تم نے آئندہ کے لیے اسے نہ کھلانے کا عزم کر لیا۔ ذرا میری فیاضی کا اندازہ لگاؤ کہ بچپن سے لے کر اب تک اس نے ایک مرتبہ بھی میرا نام نہ لیا لیکن آج تک میں نے اس کا رزق بند نہیں کیا۔"

تحریم۔ گوجرہ

امت الصبور

یادوں کی ڈائری

آمنہ اُجالا کی ڈائری سے

کہتے ہیں پانچواں موسم دل کا موسم ہے اور اگر دل کا موسم اچھا ہے تو ہر چیز اچھی لگے گی اور ہر منظر میں خوبصورتی جھلکے گی۔ اور جب دل اُداس ہو تو ہر رنگ پھیکا، اُداس اور ادھورا لگے گا۔ میری ڈائری میں تحریر اس غزل میں کچھ اداسیوں کا ذکر ہے اور جس کا نام بھی اُداسی ہی ہے۔ آپ سب قارئین کی نذر۔

اُداسی،

چُپ چُپ رہنا کچھ نہ کہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے
ہنس کے سارے صدمے سہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

بیٹھے بیٹھے کھو سا جانا یونہی دُور خیالوں میں
چلتے چلتے ہنستے رہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

دل کی باتیں سُن کر ہنسنا یہ تو سب کی عادت ہے
ان باتوں پر ہنستے رہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

مار کے کنکر لہریں گننا، بیٹھ کے جھیل کنارے پر
کچھ لوگوں کا ہے یہ کہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

سیدہ صائمہ سرفراز کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر قتیل شفائی کی یہ نظم مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ کو بھی ضرور پسند آئے گی اور آپ کی ڈائری کی بھی زینت بنے گی۔

جس کی جھنکار میں دل کا آرام تھا وہ تیرا نام تھا
میرے ہونٹوں پہ رقصاں جو نام تھا وہ تیرا نام تھا

دوست جتنے تھے نا آشنا ہو گئے پارسا ہو گئے
ساتھ میرے رسوا جو سرِ عام تھا وہ تیرا نام تھا

صبح سے شام تک جو میرے پاس تھی وہ تیری آس تھی
شام کے بعد جو کچھ لبِ بام تھا وہ تیرا نام تھا

مجھ پہ قدرت رہی ہمیشہ مہرباں دے دیا سارا جہاں
پر جو سب سے بڑا انعام تھا وہ تیرا نام تھا

سمیرا حیات کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سعد اللہ شاہ کی یہ غزل آپ سب قارئین کی نذر۔

کوئی بات نہ سہاری جائے
زندگی کیسے گزاری جائے

اب تماشا نہیں دیکھا جاتا
توڑ پھینکو کہ مداری جائے

عشق بازی بھی عجب بازی ہے
جیتی جاتی ہے، نہ ہاری جائے

جھیل، بادل یا کوئی موجِ خرام
تیری تصویر اتاری جائے

میری قسمت تو نہیں زلف تیری
جب سنوارو، یہ سنواری جائے

چیز ہوتی ہے اُسی کی جاناں
نام سے جس کے پکاری جائے

سسکتی آتی ہے مجھے سانس تو یوں
جیسے اک پیڑ پہ آری جائے

ماریہ سید واجد علی کی ڈائری سے

غم کی شدت ہو یا خوشی کی انتہا آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ آنسوؤں کی خاموش زبان ہر کیفیت کو عیاں کر دیتی ہے جسے ایک حساس دل بخوبی سمجھ لیتا ہے۔ عظمیٰ جون نے اس غزل میں آنسوؤں کی اہمیت بڑی ہی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔

شبِ تاریک میں روشن ستارے میرے آنسو ہیں
تبھی تو جانِ جاں تجھ کو بھی پیارے میرے آنسو ہیں

مرے سینے کے پتھر سے کوئی چشمہ نہیں پھوٹا
مری نم ناک آنکھوں کے کنارے میرے آنسو ہیں

رُکیں تو آنکھ جل جائے، بہیں تو آگ لگ جائے
انہیں پانی نہیں سمجھو، شرارے میرے آنسو ہیں

تمہاری آنکھ بھی نم ہے، میری بھی چشم نم دیدہ
تو قدرِ مشترک بس اک تمہارے اور میرے آنسو ہیں

سحر دم چُومتے ہیں جو گلوں کو پھول پتوں کو
وہ شبنم کے نہیں قطرے، وہ سارے میرے آنسو ہیں

پلٹ کر اس نے دیکھا تو وہ واپس لوٹ آیا ہے
زبانِ خامشی کے استعارے میرے آنسو ہیں

سن اے عظمیٰ محبت بھی تو کاروبار ہے جس میں
منافع تیری خوشیاں ہیں، خسارے میرے آنسو ہیں

صبا سلیم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم دورِ حاضر کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ باذوق قارئین کی نذر

قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال
کب ٹوٹے گا سر سے ہمارے لوہے کا یہ جال
لوہے کا یہ جال کہ جس میں
ساٹھ برس سے قید ہیں اپنے سارے خواب و خیال
بنجر ماہ و سال
بنجر ماہ و سال کہ جن کے
چہرے ہرے کچور ہیں لیکن آنکھیں لالو لال
آنکھیں لالو لال کہ جن میں
ہولے ہولے تیر رہے ہیں پھیکے زرد ملال
قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال
کب تک اس مٹی کے بیٹے ہوں گے یوں بے حال
کب تک ہم کو بننا ہوگا۔ نیلامی کا مال!

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر تابش کمال کی یہ خوبصورت نظم آپ سب بہنوں کے لیے۔

تاکید،

اُسے کہنا
اگر آئے، تو ساتھ اپنے
کوئی جگنو، کوئی تارا بھی لے آئے
کہ میرا دل
میرے گھر کی طرح
تاریک رہتا ہے

❖

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

سدرہ چودھری — عبدالحکیم
تنہائی کی شب کٹ جائے گی اتنے بھی ہم مجبور نہیں
دُہرا کر اس کی باتوں کو کبھی ہنس لیں گے کبھی رو لیں گے

سائرہ سحر ریاض احمد — چلیانوالہ
پیار کی راہ میں ڈر لگتا ہے
بڑا مشکل یہ سفر لگتا ہے
یہ اُداسی کا فسوں ہے شاید
پھیکا پھیکا سا قمر لگتا ہے

انیقہ انا — چکوال
ہر سمت میں کٹی پڑی پھولوں کی گردنیں
اب کے صبا ہی باغ میں شمشیر بن گئی
جس سمت وہ اُٹھی ہے اُدھر مر گئی حیات
اس کی نظر ہی گردشِ تقدیر بن گئی

وقیہ رُباب چیمہ — لورے والا
پھر یوں ہوا کہ ساتھ تیرا چھوڑنا پڑا
ثابت ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ نہیں

ائستہ اکبر — ڈگری کالج کدرو
اس دل کے چند اثاثوں میں اک موسم ہے برساتوں کا
اک صحرا ہجر کی راتوں کا، اک جنگل وصل کے خوابوں کا
ہم لوگ جنون کے عالم میں منزل کی طلب بھی بھول گئے
اب دل کو بھلا سا لگتا ہے صحرا میں عکس سرابوں کا

الدہ عنایت — ٹنڈو باگو
میں اب مروں کہ جیوں مجھ کو یہ خوشی ہے بہت
اُسے سکون تو ملا مجھ کو بد دُعا دے کر

س عطاریہ — بادہ قطعہ
کبھی اس طور سے ہنسنا کہ دُنیا کو رُلا دینا
کبھی اس رنگ میں رونا کہ خود پر مسکرا دینا

اُجالا — ڈہرکی
انا کی آگ میں چاہت کے پھول جھونکے گا
وہ اعتبار کی آنکھوں میں دُھول جھونکے گا
جو اختلاف کی آتش کبھی بھڑک اُٹھی
تو مجھ کو ڈر ہے وہ پہلے اصول جھونکے گا

رقیہ اسماعیل — یزمان
تمہاری آنکھ سے دل تک کا سفر کرنا ہے مجھ کو
یہ کتنی خوبصورت منزلوں کا راستہ ہو گا
اگر تم روٹھ جاؤ تو ہماری جان نکل جائے
مگر یہ خود ہی سوچو تم میں اتنا حوصلہ ہو گا

انیسہ رحیم — ٹنڈو محمد خان
موسم تھا بے قرار، تمہیں سوچتے رہے
کل رات بار بار تمہیں سوچتے رہے
بارش ہوئی اور گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ سوگوار تمہیں سوچتے رہے

شازیہ رانا — دیپال پور
کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گزرتی رہی ہم پر، نہیں دیکھا تو نے
اے مجھے صبر کے آداب سکھانے والے
جب وہ بچھڑا تھا وہ منظر نہیں دیکھا تو نے

نمرہ، اقرأ — کراچی
لغزشیں شاملِ فطرت ہیں ازل سے میر
تم فرشتوں کی نظر سے مجھے دیکھا نہ کرو

انعم عنبر — فیصل آباد
گھر پھونکنے میں صرف ہوائیں نہیں شریک
شامل کچھ اس میں گھر کے دیے کا ہنر بھی ہے

کرن فاروق — لاہور
اس نے کیا کچھ کہا تھا، یاد نہیں
اوڑھنی کی گرہ نہیں کھولی!
اس کے لہجے کی سرد بارش میں
دل نے اس کی تمنا ہی دھو لی

سائرہ منیر — رحیم یار خان
تو جس میں آسودۂ وفا تھا
وہی سنہرا محل رہی ہوں
کنارہ بھی احترام سے کر
تری دُعاؤں کا پھل رہی ہوں

اسماء عروج — مظفر گڑھ
پھولوں میں کھلتا ہے کون
خوشبو میں ہنستا ہے کون
صدا لگانے کا فن سیکھ
اب چہرے پڑھتا ہے کون

زہرا اکرام — اسلام آباد
بے حد و بے حساب سے نکلیں
زندگی کے عذاب سے نکلیں
جو بھی ہونا ہے امتحاں ہو جائے
روز کے احتساب سے نکلیں

انیلا وہاج — کشمیر روڈ
بہلتی جائے گی سرکش محبت، دیکھتے جاؤ
تمہیں دُنیا سکھا دے گی سیاست، دیکھتے جاؤ
بڑے اونچے سُروں میں بات کرتے ہو محبت کی
محبت ہے خساروں کی تجارت، دیکھتے جاؤ

رقیہ انجم — ایبٹ آباد
رُلا کر خود ہی آنسو پونچھتا ہے
نجانے لاگ سچ ہے یا لگاؤ
ملا ہے آج مجھ سے والہانہ
لگا ہو گا کسی جانب سے گھاؤ

عالیہ عظیم — کراچی
آئینہ ہے تمہارا عکس لیے
بڑھ گیا ہے جمال شیشے کا
تم غلط فہمیاں نہیں پالو
کس سے ملتا ہے بال شیشے کا

صدف — پشاور
سچ ہے کہ تیرے بعد اُداسی کا راج ہے
لیکن تیرے فراق میں مر تو نہیں گیا
منزل نہ مل سکی یہ مقدر کی بات ہے
صد شکر ہم سے ذوقِ سفر تو نہیں گیا

نذرین افتخار — راولپنڈی
پھر سے سویا درد جگانے آ جاتے ہیں
جب بھی میرے یار پرانے آ جاتے ہیں
اب بھی دل کی جھیل میں تیری یادوں کے سب
اُجلے اُجلے ہنس نہانے آ جاتے ہیں

عزیزہ — لاہور
جو سائبان تھا دھوپ میں لوگوں کے واسطے
وہ پیڑ اپنی چھاؤں میں جلتا ہے ان دنوں

سعدیہ عروج — گھارو
وہ تغافل سے لگاتا ہے نئے زخم مگر
دل کے زخموں کو وہ گہرا نہیں ہونے دیتا
میری آنکھوں میں سجا دیتا ہے سپنے لیکن
کوئی سپنا بھی وہ سچا نہیں ہونے دیتا

عارفہ سلیم — کہروڑ پکا
بس ایک ہی خواہش تھی کہ ہم چاند کو چھو لیں
اس ایک ہی خواہش نے ہمیں مار دیا ہے
کس کس سے چھپائیں دلِ بیمار کی حالت
احوال کی پرسش نے ہمیں مار دیا ہے

شہلا مظہر — وہاڑی
بخشا ہے روح کو جس نے زخموں کا پیرہن
محسن وہ شخص کتنا طبیعت شناس تھا

افشاں غلام — کراچی
کتابوں سے دلیلیں دوں یا دل کو سامنے رکھ دوں
وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے ہیں محبت کس کو کہتے ہیں

فوزیہ انیس — کراچی
بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا ہجوم
ہو پیکرِ خلوص تو کافی ہے اک شخص

◆

نادرہ خاتون

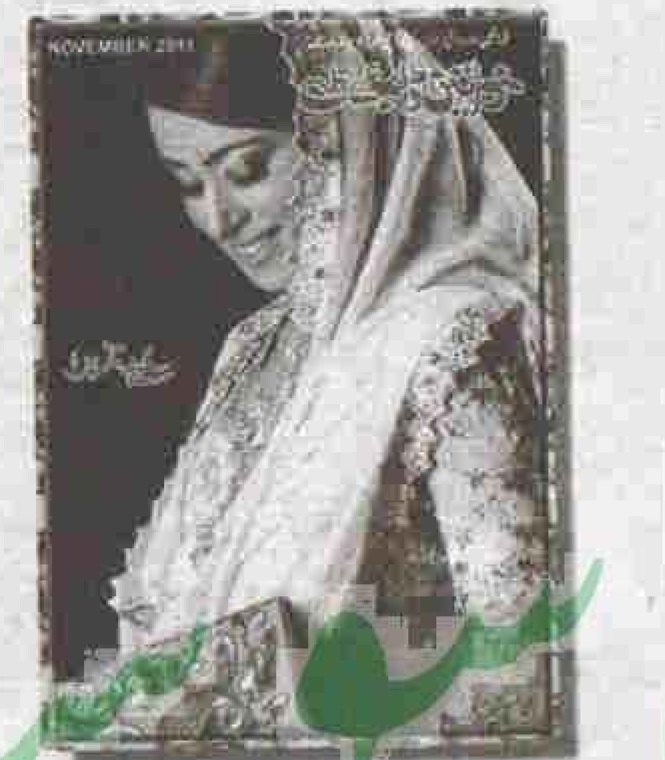

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی.
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

صباحت ارشاد باجوہ...... گوجرانوالہ

سب سے پہلے عید کی ماڈل بہت پیاری لگی۔ اس کے بعد کوکنگ بھی اچھی تھی اور آپ سے فرمائش کرنی ہے کہ ٹرائفل اور کافی کی ترکیب بتائیں اور اس کے بعد ناول اور ناولٹ میں کچھ بھی پسند نہیں آیا۔ "تم میرے ہو" کچھ خاص نہیں تھا۔ ایک عورت جو اتنا کچھ کرتی ہے' اسے اتنی آسانی سے معاف کردیا جاتا ہے۔ "جیسے کچھ ہوا ہی نہیں" شروع کیا تو پتا تھا اینڈ کیا ہونا ہے خواتین ہمارے دکھ سکھ کا ساتھی ہے جب اس کو پڑھتے ہیں تو وقتی طور پر اپنی ہر پریشانی بھول جاتے ہیں اور میرے خیال میں یہ ایک نیکی ہے کہ ہم دوسرے انسان کی پریشانی شیئر کرتے ہیں اور یہ کہنا تو میں بھول ہی گئی کہ "میرے خواب مجھے لوٹا دو" تھم سا گیا ہے' پلیز اس کی رفتار تیز کریں اور میں نے ابرار الحق اور جیو کے مسعود رضا کا انٹرویو کا کہا تھا۔

ج: پیاری صباحت! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو کوئی ناولٹ اور ناول پسند نہیں آیا' ہم پرچے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ بشریٰ سعید اور فرحت اشتیاق تو بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں ابرار الحق کا انٹرویو شعاع اور خواتین دونوں پرچوں میں شائع ہو چکا ہے' شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔

بیناشاہ...... ٹوپی صوابی

ٹائٹل پر ڈیسنٹ سی ماڈل اچھی لگی۔ اب آتے ہیں شمارے کی طرف۔ "جھلملانے لگی عید" سائرہ رضا کی اچھی تحریر تھی۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" انتہائی زبردست جا رہا ہے۔ فرحت باجی سے ذرا پوچھیے کہ کیا وہ روم گھوم کے آئی ہیں۔ کیونکہ بغیر گھومے تو اس طرح کی منظر کشی ہو نہیں سکتی۔ "سفال گر" اس دفعہ بھی اچھا تھا۔ دیکھتے ہیں کہ آئندہ آخری قسط میں بشریٰ جی کیا کرتی ہیں۔ "میرے خواب لوٹا دو" میں یاسمین ماں کے روپ میں کیا کر رہی ہے' سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ وہ تو ماں کے نام کی توہین ہے۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول تو بہت ہی زبردست تھا۔

ج: پیاری بینا! آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا بہت خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

نائلہ ندیم...... اسکاٹ لینڈ (ای میل)

گزشتہ دس سال سے خواتین کی باقاعدہ قاری ہوں۔ نہایت شان دار ڈائجسٹ ہے۔ فرحت اشتیاق' رخسانہ نگار' نمرہ احمد' ثمرہ بخاری' راحت جبیں' نگہت عبداللہ' رفعت سراج' عالیہ بخاری اور دیگر تمام مصنفین بہت عمدہ لکھ رہی ہیں۔ معاشرے کی اصلاح اور بچیوں کی تربیت کے حوالے سے یہ تمام خواتین مصنفین ایک مثبت کردار ادا کر رہی ہیں۔ میں بیاہ کر اسکاٹ لینڈ ہو کے آگئی ہوں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ شعاع اور خواتین کو بذریعہ ڈاک میں کس طرح منگوا سکتی ہوں۔ میں کیسے منی آرڈر کروں...... پلیز میری مدد کریں۔ شکریہ۔

ج: پیاری نائلہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ خواتین ڈائجسٹ اسکاٹ لینڈ میں بذریعہ ڈاک بھجوایا جا سکتا ہے۔ طریق کار معلوم کرنے کے لیے 021-32735021 پر فون کریں۔

اسماء اقبال عمران...... لاہور

آج سے سات آٹھ سال پہلے جب میں خواتین ڈائجسٹ' شعاع اور کرن کی کہانیاں پڑھتی تھی تو سوچتی تھی' یا اللہ! یہ سب رائٹرز کتنا اچھا لکھتی ہیں ان پر ڈرامے یا فلمیں کیوں نہیں بنتی ہیں اور آج یہ دن ہے کہ ہر چینل پر ہماری رائٹرز یعنی ادارے چاند نگر گروپ کی اجارہ داری ہے' کیوں نہ ہو' آخر نام ہی کافی ہے ان رائٹرز کی وجہ سے ہی ان کے ڈرامے کتنے ہٹ ہو رہے ہیں۔

ان سب رائٹرز سے مودبانہ گزارش ہے کہ کامیابیوں کو خواب انجوائے کیجیے مگر کبھی اپنی پہلی سیڑھی کو مت بھولیے' پلیز بہت ڈھیر ساری مصروفیت میں اپنے ادارے کو مت بھولیے گا۔

ماہ اکتوبر کا سارا ڈائجسٹ اچھا تھا مگر جس طرح پہلے رسالہ ہوتا تھا اور کہانیاں ایسی کہ پڑھنے لگو تو جب تک ختم نہیں ہوتی تھیں' چھوڑنے کو دل نہیں کرتا تھا مگر اب یہ احساس ذرا کم ہو گیا ہے' بہرحال کبھی کوئی کہانی بہت اچھی ہوتی ہے اور کبھی عام سی۔ ناول بھی سب ٹھیک تھے۔ فاخرہ جبیں بہت عرصے بعد آئیں لیکن وہی پرانا موضوع' وہی گھسی پٹی کہانی۔

شازیہ عطا بس امریکہ کی اسٹوری' اسٹور' سڑکوں کے نام اور شاپنگ مال وغیرہ۔ پتا نہیں مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر رائٹر (خدارا یہ الزام سب پر نہیں ہے) ہر ناول یا کہانی میں اللہ کے تعلق کو زبردستی شامل کر دیتی ہیں۔ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

وہ میرا ہے' کیا یہ ناولٹ واقعی 'نمرہ احمد' نے لکھا ہے؟ (حیرت انگیز) نہایت فلمی اور امیچور تحریر تھی۔ مصباح خادم کی کاملیت پسند کافی حقیقت لیے ہوئے تحریر تھی ہم صنف نازک بھی کیا چیز ہوتی ہیں اور پھر کیا ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں' ایک ایک لفظ کو سوچنا پھر لکھنا اور پھر چھاپنا' سب کام اپنی اپنی جگہ نہایت اہم ہیں اور ہم آپ کے شکر گزار ہیں اور تعریف کے ساتھ مثبت تنقید بھی ہونی چاہیے تاکہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آسکیں۔

ج: پیاری اسماء! ہم تنقید کا ہرگز برا نہیں مانتے۔ آپ خط شامل اشاعت ہے۔ یہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی خوش نصیبی ہے کہ چینلز کی مصروفیات کے باوجود ہماری مصنفین ہمارے پرچوں کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔

لیکن شازیہ عطا کے ناول میں آپ زیادتی کر گئیں انہوں نے امریکہ کی اسٹوری' اسٹور' سڑکوں اور شاپنگ مال وغیرہ کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن ان کے ناول میں کہانی بھی تھی اور وہ ہمارے پاکستانی مسلمان گھروں کی کہانی تھی۔ جو سوال انہوں نے اٹھائے ان کا تعلق بھی ہمارے معاشرے سے تھا۔

آپ کی تنقید اور تبصرہ متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

ثمرین شفیع اعوان...... شاہدرہ لاہور

ٹائٹل موقع کی مناسبت سے اچھا تھا۔ رفعت ناہید سجاد صاحبہ کے "چراغ آخر شب" سے شروعات کی کہ "کرن کرن روشنی" اور باقی تمام سلسلے ایسے ہیں' جن میں سے بہت کچھ مجھے اپنے پاس محفوظ کرنا ہوتا ہے' لہٰذا پہلے پڑھنے کا کام کرتی ہوں۔ تو جناب جیسے ہی کہانی کا آغاز کیا' ایسا لگا رفعت ناہید اس بار یکسوئی سے لکھ نہیں پائیں وجہ...... اس ماہ آپ کے ناول کے حالات' واقعات اور کرداروں میں ربط تھا نہ سابقہ کیفیت سے تعلق۔

ہماری مصنفین کا ذکر ہو اور فرحت اشتیاق صاحبہ نہ ہوں' ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنے اس ناول میں بھی اس قدر ماہرانہ انداز سے قاری کو حالات و واقعات سے متعارف کروا رہی ہیں کہ بندہ اردگرد کو بھول کر لیزا کے ساتھ روما کی سیر کو نکل جانے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

بہترین کی دوڑ میں ہماری بشریٰ جی بھلا کسی سے کم ہیں کیا؟ "سفال گر" میں ایسا جادوئی اثر تھا کہ بیان سے باہر ہے' یوں لگا جیسے عمر نے صوفیہ کے ساتھ میرے بھی دل و دماغ پر بھی جادو کر دیا۔ لاجواب! آپ کے دماغ اور قلم میں جانے کیسا اثر ہے کہ پڑھنے والا ایمان کی اصل روح کو پا لیتا ہے۔

افسانوں میں سائرہ رضا کا "جھلملانے لگی عید" زبردست تھا پھر "جئیں تو ایسے" راشدہ رفعت کو پڑھا' یہ ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی۔

قراۃ العین نے بھی اچھی کوشش کی۔ "زندگی کے رنگ" سعدیہ جی کے سنگ پڑھ کر دل آپ کو داد دینے کو مچل مچل گیا۔ مکمل ناول میں نایاب جیلانی صاحبہ نے "تم میرے ہو" کے لفظی جال میں الجھائے رکھا اور عجیب سی ٹینشن بھی دماغ کو تنگ کرتی رہی مگر معذرت کے ساتھ کہ آخر میں آپ کی گرفت ڈھیلی پڑتی دکھائی دی۔

سب سے آخر میں آسیہ رزاقی صاحبہ کا ناولٹ "جیسے کچھ ہوا ہی نہیں" میں آپ نے کمال کر دیا جناب! کتنی خوب صورتی اور ماہرانہ انداز میں آپ نے زمانے کی سفاکی اور دلی کدورتوں کو پیش کیا اور یہ بھی کہ کس طرح سے ہم اپنے فیصلوں پر قسمت کا ٹھپہ لگا کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

ج: پیاری ثمرین! آپ نے بڑی خوب صورتی سے خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں کا تجزیہ کیا۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے' آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

مہر شہوار...... گوجرانوالہ (ای میل)

ٹائٹل بے حد عمدہ تھا۔ ناول ناولٹ بہت اچھے جا رہے ہیں۔ نگہت عبداللہ کے ناول کا اسٹارٹ ہے' اس لیے ابھی کرداروں کا تعارف ہی چل رہا ہے۔ فرحت اشتیاق کا ناول بہت زبردست اور معلوماتی ہے۔ نایاب کا ناول بھی اچھا تھا۔ "سفال گر" کی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں ہوتے' حکیم بیگم کا کردار بہت بہترین ہے۔ آسیہ رزاقی کی "دادی اماں" بہت سوئٹ تھیں' حلیمہ پہ بہت ترس آیا۔

افسانوں میں سائرہ رضا کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ راشدہ رفعت نے اپنے افسانے میں بہت عام مگر اہم مسئلہ اٹھایا ہے۔ قراۃ العین کا افسانہ بھی بہت اچھا تھا۔ سعدیہ رئیس کا افسانہ بھی اچھا تھا مگر صرف اتنا بتا دیں کہ اتنی سگھڑ لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں۔ تمام سلسلے اچھے تھے۔ عدنان بھائی کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔

پلیز رفعت سراج کو ڈھونڈ لائیے۔ ساجدہ حبیب سے گزارش ہے کہ وہ "وردی' وعدہ اور وفائیں" جیسی کہانی لے کر پھر تشریف لائیں اور انیسہ سلیم کہاں ہیں؟ ہم آج کل کے حالات پر انی سیانی کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

ج: مہر شہوار ای میل کرنے کا شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے' آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

پارس بلوچ...... ڈہرکی

بھلے ہی میرے الفاظ سادہ اور بے قیمت ہوں لیکن ان لفظوں میں گندھی ہوئی جو محبت ہے وہ سادہ اور بے قیمت نہیں ہے اور ہمیں خواتین ڈائجسٹ سے محبت ہی تو ہے لیکن اگر محبت کا جواب محبت سے نہ دیا جائے تو دل تو دکھتا ہی ہے نا!

عید نمبر کا ٹائٹل شاندار تھا۔ قدرے عجلت اور بے چینی کے ساتھ صفحات الٹتے ہوئے جوں ہی فہرست میں پہنچے تو اپنی تین تین فیورٹ رائٹرز کو بیک وقت ایک ساتھ دیکھ ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے (ارے بھئی خوشی کے مارے) اور اب سب سے پہلے ذکر کروں گی "سفال گر" کی ساحرہ کا! بشریٰ سعید! آپ واقعی مجھے کوئی ساحرہ ہی معلوم ہوتی ہیں کوئی منتر ہے جو کہ ہم پر پڑھ کر پھونک دیا گیا ہے کہ پہلی قسط سے لے کر اب تک ہم کسی فسوں کے حصار میں قید ہیں۔ ایسی نایاب' بے مثال و لازوال تحریریں بہت کم کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے بعد ہم بہت سے قارئین کے دلوں پہ راج کرنے والی بہت ہی پیاری سی یادگار اور خوب صورت ناولوں کی تخلیق کار فرحت اشتیاق کے مکمل ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" پر پہنچے' کہانی نہایت دلکشی و خوب صورتی سے آگے کی جانب رواں دواں ہے۔ ہماری دلچسپی اپنے پورے عروج پر ہے۔

دوسرا مکمل ناول ہماری موسٹ فیورٹ رائٹر نایاب جیلانی کا "تم میرے ہو" ہر طرح سے ایک دلچسپ اور منفرد تحریر تھی۔ موضوع بھی خاصا مختلف تھا۔ کیونکہ آرمی پر تو ہم نے بہت سی تحریریں پڑھی ہیں لیکن ایئر فورس کے متعلق یہ پہلی تحریر تھی جو ہم نے پڑھی۔ ناولٹ میں آسیہ رزاقی صاحبہ کا ناولٹ "جیسے کچھ ہوا ہی نہیں" بہت پسند آیا۔ جلد یا بدیر صبر کا پھل ضرور ملتا ہے۔ جس طرح کہ حلیمہ کو اس کی خاموشی و صبر کا پھل ملا (صارم کی صورت میں)

افسانوں میں قراۃ العین چنا کا افسانہ "اپنے حصے کا" ان کی ایک اچھی اور بہترین کاوش تھی۔ نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" نہایت روانی اور خوب صورت طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔

ج: پارس ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پچھلے چار ماہ سے آپ مسلسل خط لکھ رہی ہیں اور آپ کا ایک بھی خط شامل نہ ہو سکا۔ اچھی بہن! آپ کے لفظ سادہ سہی لیکن بے قیمت ہرگز نہیں اور آپ کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں' خطوط خواہ کتنی ہی تعداد میں موصول ہوں۔ کسی ایک بھی خط کی قدر و قیمت ہرگز کم نہیں ہو سکتی۔ ہمارے دل میں اپنی تمام قارئین کی بے حد قدر اور اہمیت ہے۔ آپ کا دل دکھا' اس کے لیے معذرت۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا' ایک بات نوٹ کر لیں خط کا شائع ہونا اہم نہیں ہے' اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کی رائے ہم تک پہنچ گئی اور اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمام خطوط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

اسماء سعید...... راولپنڈی (ای میل)

میں پانچویں جماعت میں تھی' جب سے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تو اب ایم اے کیے ہوئے بھی مجھے دس سال ہو گئے ہیں اور سرکاری نوکری کر رہی ہوں مگر اتنے عرصہ میں شاید ہی کوئی ڈائجسٹ مس کیا ہو۔

اس ماہ کے پرچے کی میں جتنی تعریف کروں کم ہے۔ یوں تو ہر ماہ ہی رسالا بہت اچھا ہوتا ہے مگر اس ماہ کے رسالے نے تو مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تمام کہانیاں بہت سبق آموز تھیں۔ لیکن "جھلملانے لگی عید" نے تو میری آنکھیں ہی جھلملا دیں۔ "جئیں تو ایسے" آج کل کے زمانے کی سچی تصویر ہے۔ رشتے کے لیے اتنا اعلا معیار بنا کر اپنی خامیوں کو بھلا بیٹھتے ہیں۔

"اپنے حصے کا" نے بہت متاثر کیا۔ سسرال والوں کے معاملے میں لڑکیاں پتا نہیں کیوں' دل چھوٹا کر لیتی ہیں "رنگ زندگی کے" غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ غرض کہ ماہ نومبر کا خواتین پڑھ کر شادی شدہ و غیر شادی شدہ لڑکی اپنی زندگی سنوار سکتی ہے۔ ان شارٹ نومبر کے خواتین کو "بیسٹ رسالا آف دی ایئر" قرار دینا چاہیے۔

ج: پیاری اسماء! آپ کی محبت نے ہماری پلکیں نم کر دیں۔ قارئین کی خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ اتنی طویل رفاقت اس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین ڈائجسٹ اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے' ہر ماہ ہماری یہی کوشش ہوتی ہے کہ پرچے کا معیار برقرار رکھیں بلکہ اسے خوب سے خوب تر بنا کر پیش کریں آپ کی حوصلہ افزائی ہمارے ارادوں کو مزید مستحکم کر دیتی ہے۔

حوصلہ افزائی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے اتنے عرصے بعد آپ نے خط لکھا' بہت اچھا لگا' اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

فائزہ محمود...... بہاول پور

مجھے "خواتین" اور "شعاع" بے حد پسند ہیں۔ اتنے پسند ہیں کہ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود مشکل پڑھائی سے جان بچا کر خریدتی ہوں۔ میں ایف ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مگر جب 7th کلاس میں تھی۔ تب سے یہ پڑھ رہی ہوں مگر باقاعدگی سے 9th کلاس سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ مجھے خواتین ڈائجسٹ کے تمام سلسلے بے حد پسند ہیں۔

ج: پیاری فائزہ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ' لیکن آپ نے نومبر کے شمارے کی کسی تحریر کا تو ذکر ہی کیا۔ آئندہ ہمیں خط لکھیں تو تحریروں کے بارے میں بھی اپنی رائے ضرور لکھیں۔

آمنہ اجالا...... ڈہرکی

نومبر کا شمارہ اس بار قدرے تاخیر سے بارہ نومبر کو ملا۔ بند پلکوں تلے کسی حسین منظر میں کھوئی ہوئی ماڈل بہت پسند آئی۔

کہانیوں میں سب سے پہلے بشریٰ سعید کے ناول "سفال گر" کے دروازے پر دستک دی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا پرنیاں احمد عرف ایڈم گرانٹ کو معاف کر پائے گی؟

مکمل ناولز میں نایاب کا مکمل ناول "تم میرے ہو" بے حد عمدہ اور دلکش تھا۔ رمشا اکرام کا انتقام اور بدلے آگ میں اس حد تک آگے نکل جانا' ہمیں سخت اچنبھے میں ڈال گیا لیکن شکر ہے کہ اسے اینڈ میں عقل آ گئی۔

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

اس کے بعد "چراغ آخر شب" پڑھا۔ نعیم ملک جیسے ملک دشمن عناصر کے اتنے لمبے ہاتھ ہیں کہ پکڑ میں ہی نہیں آتے کہیں۔ ایسے ہی آستین کے سانپوں میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگوں کے لیے کسی شاعر نے کیا خوب شعر کہا ہے کہ۔

گھر پھونکنے میں صرف ہوائیں نہیں شریک
شامل اس میں کچھ گھر کے دیے کا ہنر بھی ہے

فرحت آپی نے بہت انتظار کروایا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کی دوسری قسط پڑھنے کے لیے۔ ماضی اور حال کو ایک ساتھ لے کر کہانی نہایت عمدہ طریقے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔

"میرے خواب لوٹا دو" بہت اچھا جا رہا ہے' بس نگہت عبداللہ سے اتنا کہنا ہے کہ کہانی میں تھوڑی سی تیزی لائیں اور تاجور و شمشیر علی کے کرداروں کو بھی واضح کر کے دکھائیں۔

"جیسے کچھ ہی نہیں" آسیہ رزاقی اپنی پرانی جون میں نظر آئیں۔ اپنوں کی ستم روی کا شکار حلیمہ آزمائش کی بھٹی میں جل کر بالآخر کندن بن ہی گئی۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف' افسانے سب ہی اچھے تھے "اپنے حصے کا" قرۃالعین چنا سب پر بازی لے گئیں۔

عید قرباں کے حوالے سے سلسلہ "عید قرباں کی لذتیں" بھی بہت پسند آیا۔

ج: آمنہ جی! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ پرچا آپ تک لیٹ پہنچا' اس کے باوجود آپ نے اتنی جلد پڑھ کر بھرپور تبصرہ کیا' یہ قابل ستائش ہے۔

اقصیٰ...... احمد نگر چٹھہ

مجھے جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے' وہ ہے فرحت اشتیاق کا ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بہت ہی زبردست ناول ہے اور دوسرا نگہت عبداللہ کا ناول "میرے خواب لوٹا دو" یہ بھی بہت زبردست ہے۔ ہم چاروں بہنیں بڑے ہی شوق سے خواتین اور شعاع پڑھتی ہیں اور ہم نے ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے' موبائل بھی نہیں' ہوسکتا ہے کہ آپ کو یقین نہ آئے لیکن یہ سچ ہے۔ ہماری زندگی یہی رسالے اور ریڈیو سے ہے۔ ہمیں سارے رسالے خواتین' کرن اور شعاع ٹائم پر ہی مل جاتے ہیں۔

آپ سے ایک ریکویسٹ کرنی ہے کہ آپ FM-97 کے ڈی' جے آصف بشیر کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں۔

ج: پیاری اقصیٰ! فرحت اشتیاق اور نگہت عبداللہ تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچ گئی ہے۔ مگر ٹی وی کی کمی کا شکوہ رہنے دیجیے' ٹی وی کے تمام چینلز پر خواتین ڈائجسٹ کے ڈرامے ہی دکھائے جا رہے ہیں۔ آپ خواتین ڈائجسٹ پڑھ لیں یا ٹی وی ڈرامے دیکھ لیں' ایک ہی بات ہے۔ آپ کی فرمائش نوٹ کرلی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فرخ فاطمہ...... حویلی لکھا اوکاڑہ

ٹائٹل پر معصوم الہڑسی دوشیزہ سفید لباس میں چاند کی شہزادی لگ رہی تھی لیکن بیک گراؤنڈ میں بلیک کلر اچھا نہیں لگا۔ سب سے پہلے "سفال گر" سے ملاقات کی۔ اس ناولٹ کی تعریف کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ بشریٰ سعید نے اب کی قسط میں ان لوگوں کے صوفیہ کو بدصورت کہنے کی وضاحت پیش کی۔ بشریٰ! یقین مانئے' اگر آپ ایسا نہ بھی کرتیں تب بھی ان کرداروں کے غیر فطری رویے کے حوالے سے کوئی غیر حقیقی پن نہ ابھرتا۔ کیونکہ مصنفہ نے ناولٹ کا شروع سے ہی ایسا امیج بنایا ہے کہ لفظ لفظ خود اپنے آپ سے بھی بڑھ کر قابل اعتبار لگتا ہے۔ اس ناولٹ میں مصنفہ اگر یہ بھی بیان کریں گی کہ سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے تو میں وہ بھی مان لوں گی۔

آسیہ رزاقی صاحبہ کے ناولٹ کا نام تھوڑا عجیب لگا۔ لیکن آسیہ رزاقی اور بور کریں' ناممکن۔ ناولٹ دل کو چھو گیا۔ حلیمہ کے صبر کا صلہ اس کو مل گیا۔ نگہت عبداللہ کی یہ قسط فنٹاسٹک تھی۔ اریبہ کا کردار بہت اسٹرونگ ہے۔ "جو بچے ہیں سنگ" میں گھر بیٹھے بیٹھے روما کی سیر کر کے سواد آگیا۔ سکندر کے رویے نے اس مکمل ناول میں جان ڈالی ہے۔ اب آگے واضح ہوگا کہ اس کے خود سے نفرت کرنے کی وجہ کیا ہے۔ نایاب جیلانی جی کی کہانی بھی اچھی تھی۔ آخر میں عبد نے رمشاء سے ناراضی جلد ہی ختم کردی بلکہ ختم کیا کردی' میرے خیال میں یہ ہی کہانی کا ویک پوائنٹ تھا۔ راشدہ رفعت کا افسانہ اچھا تھا۔ قرۃالعین چنا کا افسانہ ہمارے معاشرے کی ایک عمومی خرابی کی نشاندہی کرتا

ہے۔ قرۃ العین نے کافی اچھے موضوع پر قلم اٹھا کر دل جیت لیا۔

سائرہ رضا کا افسانہ پہلے تو ٹھیک ہی لگ رہا تھا لیکن مصنفہ کے اس جملے نے "آپ میرا اصلی نام لیجئے گا، میرا نام عمر فاروق ہے۔" اس کو "ٹھیک" سے "اچھا" بنا دیا۔

شاء عسکری کا انٹرویو خاص نہیں لگا۔ وہی پرانے سوالات اور پرانے جوابات "عید قربان کی لذتیں" میں قاری بہنوں سے مل کر مزا آیا۔ "میری خاموشی کو" سلسلے کے سوالات دوبارہ دے دیں۔

خواتین ڈائجسٹ میں ایک محاورہ اکثر کہانیوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض جگہ پر یہ "مرغ کی ایک ٹانگ ہونا" ہوتا ہے اور کہیں یہ "مرغی کی ایک ٹانگ ہونا" ہوتا ہے۔ درست محاورہ کیا ہے؟ مہربانی کر کے ضرور بتایئے گا۔ کیا نبیلہ عزیز شادی شدہ ہیں؟ پلیز جواب ضرور دیجئے گا۔ وہ میری فیورٹ رائٹر ہیں۔"

کافی ماہ ہو گئے ہیں نبیلہ ابر راجہ نے بھی نہیں لکھا۔ نبیلہ جی! جلدی سے ایک مکمل ناول لکھ ماریں۔ دعائیں دیں گے۔ فائزہ افتخار کی تو خواتین ڈائجسٹ میں آمد کی امید ہی فضول ہے۔ جب کبھی دل اداس ہو تو پرانے رسالے نکال کر میں فائزہ کا ناولٹ "کاکی، ننھی اور منا" یار "تقریب کچھ تو بہر ملاقات" پڑھتی ہوں اور اداسی اڑنچھو ہو جاتی ہے۔

ج: فرخ! فائزہ کی تحریریں تو ہمیں بھی بے حد پسند ہیں۔ ٹی وی کی مصروفیات کے باوجود طویل عرصہ بعد انہوں نے شعاع کے لیے ناول لکھا، جسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ اس ماہ کے شعاع میں اس ناول کی آخری قسط شامل ہے۔ فائزہ کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ بے تکلفی اور بے ساختگی سے ہلکے پھلکے جملوں میں بڑی بات کہہ جاتی ہیں۔

ج: صحیح محاورہ مرغ کی ایک ہی ٹانگ ہے۔

نبیلہ عزیز نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ ایک گڑیا سی بیٹی کی والدہ محترمہ بھی ہیں۔

کرن تینو...... میرپور خاص

میں مارچ سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور پھر مجھے جیسے اس کی لت لگ گئی ہے، امی ڈانٹتی ہیں کہ مت پڑھو مگر اب اس ڈائجسٹ کو چھوڑنا مشکل ہے۔ سب تحریریں بہت اچھی ہیں جتنی تعریف کروں کم ہے۔ مجھے سب بہت پسند ہیں۔ بشریٰ سعید کی تحریر "سفال گر" بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ پڑھنے کی شروعات ہی میں "سفال گر" سے کرتی ہوں بے صبری سے۔ ہمارے شہر میں سیلاب آیا ہوا ہے، اس وجہ سے ستمبر کا شمارہ میں خرید نہیں پائی۔

ج: پیاری کرن! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید، آپ نے خط لکھا، بہت اچھا لگا۔ آپ اپنی امی کو خواتین ڈائجسٹ کی کہانیاں پڑھ کر سنائیں، پھر وہ آپ کو نہیں ڈانٹیں گی بلکہ انہیں آپ سے زیادہ خواتین ڈائجسٹ کا انتظار رہے گا۔ ستمبر کا شمارہ بھجوایا جا رہا ہے۔

نیلم مقبول...... اسلام گڑھ میرپور

شاء عسکری کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا اور علیم ڈار کے بارے میں پڑھ کر بہت فخر محسوس ہوا۔

آپ نے ابھی تک کسی نیوز کاسٹر کا انٹرویو شائع نہیں کیا۔ اس بارے میں خاص طور پہ کہنا چاہوں گی کہ پلیز عائشہ بخش اور حامد میر اور شاہ زیب خانزادہ کا انٹرویو شامل کریں۔ نگہت عبداللہ کا ناول "میرے خواب مجھے لوٹا دو" بہت اچھا چل رہا ہے۔ نایاب جیلانی کے مکمل ناول میں عبد جرار اور عناس جرار کا کریکٹر بہت پسند آیا۔ افسانہ جو خاص طور پر پسند آیا وہ سائرہ رضا کا "عید کی شام" تھا۔

آخر میں عمیرہ احمد، نمرہ بخاری اور نمرہ احمد سے کہوں گی کہ پلیز ہمارے لیے وقت نکال کر کچھ لکھیے۔

ج: پیاری نیلم! خواتین کی محفل میں خوش آمدید نیوز کاسٹر کے انٹرویو ہم شائع کرتے رہتے ہیں، حامد میر کا انٹرویو بھی شائع ہو چکا ہے۔ عائشہ بخش اور شاہ زیب کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

دیا زورین...... ڈگری کالج ڈہرکی

ابیا جی! میں ایک کرسچن لڑکی ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ اچھی بات جس کے بھی منہ سے سنو اسے لکھ لو، تو

ہمارے گھر میں آپ کے رسالے پڑھنے پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ یہ رسالے ہر طرح سے معیاری اور بہترین ہیں۔ آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے کہ میں اس رسالے کے ذریعے اپنی سسٹر اور دوستوں کو کرسمس کی مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔ میری طرف سے سسٹر، رشتے داروں اور دوستوں اور تمام کرسچن کمیونٹی کو میری کرسمس عید مبارک باد ہو۔

خواتین کا شمارہ اس بار 10 تاریخ کو ملا۔ دیدہ زیب کڑھائی کے وائٹ سوٹ میں ملبوس نظریں جھکائے دھیمے انداز میں مسکراتی ہوئی ماڈل بے حد دلکش لگی۔ سب سے پہلے تو اپنا موسٹ فیورٹ ناولٹ "سفال گر" پڑھا۔ اختتام کو رواں دواں یہ تحریر بشریٰ صاحبہ کی یقیناً "یاد رہ جانے والی تحریر ہے" جو کہ شاید ہی ہمارے ذہنوں سے محو ہو پائے۔

اس کے بعد "چراغ آخر شب" کی طرف بڑھے۔ رفعت ناہید صاحبہ کی تعریف کرنا تو گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ کہانی کو نہایت خوش اسلوبی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ "میرے خواب لوٹا دو" نگہت آپی کا یہ شاہکار ناول رفتہ رفتہ ہمیں اپنے گرفت میں لے رہا ہے لیکن پلیز اس کی صفحات کو کچھ بڑھا دیں تو کہانی میں کچھ تیزی آجائے۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" فرحت اشتیاق نے تو ہمارا دل ہی جیت لیا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ ہم بھی وہیں کہیں ان کرداروں کے بیچ سانس لے رہے ہیں۔ نایاب آپی کا مکمل ناول بہت پسند آیا۔ "جیسے کچھ ہوا ہی نہیں" آسیہ رزاقی صاحب نے بھی خوب لکھا۔ بالآخر حلیمہ نے اپنے صبر ایثار اور حوصلے سے وہ سب کچھ پا لیا جو اس کی خواہش تھی۔

افسانوں میں "جئیں تو ایسے" راشدہ رفعت اپنے حصے کا قرۃ العین دونوں بے حد پسند آئے "رنگ زندگی" کے سعدیہ نے بھی بہت اچھا لکھا۔

ج: پیاری دیا! ہماری جانب سے بھی کرسمس کی مبارک قبول کیجئے۔ آپ کی بہن اور دوستوں تک بھی آپ کی مبارک باد ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ پر آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی آراء سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

نین تارا مریم...... ڈی جی خان

ٹائٹل پہ دلکش انداز سے مسکراتی ہوئی ماڈل پسند آئی۔ سب سے پہلے "سفال گر" جس کی تعریف کے لیے شاید میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بشریٰ جی اتنا گہرائی کی حد میں لکھے گئے ناولٹ سے لگتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا لمبا عرصہ امریکہ میں گزارا ہے یا پھر آپ کی نالج بہت وسیع ہے۔ خوب صورت لفظوں کی یہ تحریر، انداز بیاں بہت زبردست ہے۔

نمرہ جی! آپ کہاں غائب ہو گئیں۔ آپ کا مکمل ناول "مصحف" جو ابھی تک ہم نہیں بھولے ہیں، پُر تاثر تھا۔ ہمارے معاشرے میں نہ صرف دینی تعلیم کا فقدان ہے بلکہ معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

رفعت ناہید کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ عفت سحر پاشا! آپ کہاں غائب ہو جاتی ہیں اور وہ بھی لمبے عرصے کے لیے۔

پلیز از میر بٹ کے اکھڑے مزاج اور روحہ گل کی بے وقوفیوں کے ساتھ تشریف آوری فرمائیں۔

ج: نین تارا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

فاطمہ چوہدری...... جھنگ صدر

مجھے ڈائجسٹ میں کچھ کمی سی لگی تو خیال آیا کہ بجائے خود سے الجھنے کے آپ سے بات کرنی چاہیے۔ آپی! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے ناولز، ناولٹ کی تعداد کو کم کر کے افسانوں کی بھرمار کر دی ہے اور جو قسط وار ناولز ہیں، ان کے صفحات اتنے کم ہو گئے ہیں کہ ابھی صحیح طرح سے کسی ایک بات کی وضاحت بھی نہیں ہو پاتی اور باقی آئندہ لکھا ہوا نظر آجاتا ہے۔ ڈائجسٹ اب بہت خالی خالی سا لگنے لگا ہے۔ اس دفعہ خواتین ڈائجسٹ میں نمرہ احمد کا نام پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی کہانی پڑھ کر اتنی ہی بوریت محسوس ہوئی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ نمرہ احمد کی لکھی ہوئی کہانی ہے۔ نایاب جیلانی کی کہانیاں حقیقت سے بہت دور لگتی ہیں میں مانتی ہوں کہ ہماری نئی رائٹرز ترقی کی طرف گامزن ہیں مگر ہماری رخسانہ نگار عدنان، عنیزہ سید، راحت جبیں، آسیہ رزاقی، نگہت عبداللہ جیسے زرخیز ذہن، حقیقت سے قریب ترین مواد اور بہترین پلاٹ کی ان کے پاس ابھی کمی ہے۔ باقی میں اتنا ضرور کہوں گی کہ آج کے دور میں اگر دیکھا جائے تو جتنی فحاشی ہمارے ملک میں کیبل کی صورت میں، رومانس اور عریانیت سے بھرے رسالوں کی صورت

میں اور سب سے بڑی بات موبائل نے جو تباہی مچائی ہے، ان سب کی موجودگی میں آپ کا ڈائجسٹ سب ٹین ایجرز کے لیے مشعل راہ ہے۔

میں اپنے اس خط کے ذریعے اپنی سب بہنوں کو یہ پیغام دینا چاہوں گی کہ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹیوں کی تربیت بہت اچھے انداز میں ہو تو انہیں خواتین اور شعاع پڑھنے سے نہ روکیں۔ آپ کی بچیوں کی شخصیت نکھر کر سامنے آئے گی۔ میں نے خود ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اچھائی برائی کی تمیز، بہتر زندگی گزارنے کے اصول، رشتے نبھانا، حالات کا مقابلہ کرنا اور سب سے بڑی بات صبر اور شکریہ۔ یہ سب کچھ میں نے خواتین اور شعاع سے سیکھا ہے۔ آپ سے ایک درخواست ہے پلیز اس کے معیار کو قائم رکھیں۔ سلجھی ہوئی تحریریں سب بچیوں کے لیے ایک اثاثہ ہیں اور کیا کہوں کہ میں اور شعاع، خواتین ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

ج: فاطمہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کو ڈائجسٹ میں کمی محسوس ہوئی پرانی رائٹرز تو ہر ماہ شامل ہوتی ہیں پچھلے ماہ بھی رفعت ناہید سجاد آسیہ رزاقی، نگہت عبداللہ، فرحت اشتیاق راشدہ رفعت اور بشریٰ سعید پرانی رائٹر تھیں۔

انیلا گل، نوشین گل...... ایبٹ آباد

سرورق اچھا لگا۔ سب سے پہلے بشریٰ سعید کے پاس پہنچے۔ "سفال گر" خوب صورت پیراہن میں لکھا گیا خوب صورت ناول، عمر اور حلیم بیگم کے کردار بہت اچھے لکھے ہیں۔ فرحت اشتیاق کے ناول کی قسط بہت شاندار ہے۔ "سینور سکندر" ہمیں بہت پسند آیا۔ زین اور ام مریم کے ساتھ کچھ برا نہ کیجیے گا۔ فرحت اشتیاق کا تعلق کون سے شہر سے ہے؟ نایاب جیلانی کا تو نام ہی کافی ہے۔ ہر ناول پہلے سے بڑھ کے ہوتا ہے۔ "چراغ آخر شب" اور کتنا عرصہ چلے گا؟ افسانوں میں سعدیہ رئیس کا "رنگ زندگی کے" پڑھا اور بہت اچھا لگا۔

آپی پلیز "عازان" نام کا مطلب بتا دیں۔

ج: انیلا اور نوشین! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ فرحت اشتیاق کا تعلق کراچی سے ہے۔

عازان کا مطلب ہمیں نہیں معلوم کسی قاری بہن کو معلوم ہو تو ہمیں خط لکھ کر بتا دیں ہم شائع کر دیں گے۔

سدرہ تحسین عطاریہ...... چوک اعظم لیہ

نگہت عبداللہ کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے اور یہ ہم سب کو بہت پسند ہے اور "سفال گر" تو بشریٰ جی کی بہت اچھی کاوش ہے اس کے علاوہ بھی تمام سلسلے بہت اچھے ہوتے ہیں مگر آپی نمرہ احمد کے ناول مصحف نے تو ہمیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس ناول کو ہم سب ساری زندگی نہیں بھول سکتے۔

ج: پیاری سدرہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید FM 89 کے آر جے طارق مسعود الیانی اور فرزانہ سلطان کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

سحر امبر...... علی پور

آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے، ہم ہر ماہ لیتی ہیں۔ اس بار سارے ناول افسانے اچھے تھے۔ شازیہ ہمایوں کی کہانی بہت پسند آئی ہے۔ میں تو پڑھ کر رو گئی تھی۔ آپی ہمارے گھر ڈائجسٹ پڑھنے نہیں دیتے۔ ہم بہت چھپ کے پڑھتی ہیں۔

ج: سحر اور امبر! آپ کا خط پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ ہماری اکثر بہنیں لکھتی ہیں کہ ان کے گھر میں پڑھنے پر پابندی ہے۔ اس دور میں جبکہ چینلز پر ہر طرح کی آزادی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ ایک صاف ستھری تفریح ہے جو علم و آگہی بھی دیتی ہے اس کے مطالعہ پر — پابندی لگانا کسی طور درست نہیں کہا جا سکتا۔ کم از کم ایک بار پڑھ کر ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ ان ڈائجسٹوں میں کیا لکھا ہے۔ پھر پابندی لگائیں۔

⁂

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

روشن حرف وہ سارے

روشن ہاشم

1 اب کہاں لالہ و گلزار کی باتیں، کہاں وہ دن، کہاں وہ راتیں، اسکول و کالج کے لاابالی دن، عمر رفتہ کو اب کہاں آواز دیں، کتنے ماہ سال بیت گئے۔ پڑھائی، شادی، اپنوں کا ساتھ اور بہت کچھ ملا اور چھوٹ گیا، پر ایک شعر جو آج تک زبان پر رہتا ہے۔

منزل عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

وقت کے ساتھ ساتھ اس شعر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا گیا۔ والد، والدہ، بڑی بہن، بڑے بھائی، شوہر اک اک کر کے سب ساتھی چھوٹتے ہی چلے گئے یہ شعر تو اب حسب حال ہے۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، اب باہر جاؤں کس کے لیے

خوشیوں کا دور بھی آیا، بیت گیا۔ یادیں چاہے سہانی ہوں یا دردناک، وقت کا ظالم دریا سب بہا کر لے جاتا ہے۔

قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہتا ہے
چند لکیریں الجھی سی اور ہاتھوں میں کیا رکھا ہے

2 پسندیدہ شاعر تو بہت سارے ہیں۔

ابن انشاء کی مشہور زمانہ نظم "پھر وہی دشت" کا یہ حصہ بار بار پڑھا ہے اور ازبر ہے۔

اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ اب بھی نہ جاتا لوگو!
راہ تکتے ہوئے پتھرا سی گئی تھیں آنکھیں
آہ بھرتے ہوئے چھلنی ہوا سینہ لوگو!
ہونٹ جلتے تھے جو لیتا تھا کبھی آپ کا نام
اس طرح اور کسی کو نہ ستانا لوگو!

3 ارے یہ کیسا سوال کر دیا، یہ تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہو گئی۔ اب کوئی ہمارے منہ پر تھوڑی ہماری تعریف کرے گا۔ شعر کہنا تو درکنار مجھے نہیں لگتا، کسی دوست، کزن یا رشتہ دار نے کبھی سراہا بھی ہو۔

"نکتہ چیں ہوں لوگ تو کوئی کیا کرے"

اسکول کی ایک ٹیچر یاد ہیں۔ انہوں نے مجھے آٹو گراف دیا تھا۔ ان کے لکھے ہوئے وہ روشن حرف میرے ساتھ ساری عمر روشنی بن کر چلے۔

بیٹیاں پھول ہیں۔۔۔
ایک شاخ سے کٹتی ہیں، مگر سوکھتی ہیں نہ کبھی ٹوٹتی ہیں
ایک نئی شاخ پہ کچھ اور نئے پھول کھلا دیتی ہیں۔

4 گائیکی میں تصور خانم کا اپنا انداز تھا۔ کھلی کھلی مسکان چہرے پہ سجا کر جب وہ غزل گاتیں تو سننے والا اس میں محو ہو جاتا۔ ان کا ایک بہت خاص انداز تھا۔ انہوں نے ناصر کاظمی کی غزل گائی تھی جو بارہا میں نے سنی ہے اور آج تک یاد ہے۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
تو شریک سخن نہیں تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی
یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
اک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

⁂

آپ کا باورچی خانہ

درخشاں علیم

(1) کھانا پکاتے وقت میں ان تمام چیزوں کا بہت خیال رکھتی ہوں غذائیت' گھر والوں کی صحت اور پسند ناپسند شکر الحمدُللہ کہ میرے بچے تمام کھانے اور ہر طرح کی سبزیاں خوش ہو کر کھاتے ہیں اور میرا یعنی ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھانا پسند کرتے ہیں اور اسی طرح ان کے بابا جان بھی یعنی میرے میاں صاحب۔ میں جب بھی کھانا پکاتی ہوں تو دل سے پکاتی ہوں۔

(2) گھر میں بہت کم مہمان اچانک آتے ہیں زیادہ تر مہمان اطلاع دے کر آتے ہیں۔ بہر حال بہت جلد تیار ہونے والی ڈش لکھ رہی ہوں۔

مٹن مسالا ہانڈی

اجزا :

پیاز	2عدد
لہسن	1چائے کا چمچ
ادرک	1چائے کا چمچ
گھی	1/2پیالی
ہری مرچیں	4-3عدد باریک کاٹ لیں
دہی	1پاؤ
نمک	حسب ضرورت
ثابت لال مرچ (کٹی ہوئی)	1/2کھانے والا چمچ
لال مرچ	1چائے کا چمچ
زیرہ پاؤڈر	1چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	1چائے کا چمچ
گوشت	1/2کلو
گرم مسالا	1/2چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	تھوڑا سا

ترکیب :

دیگچی میں گھی ڈالیں۔ پھر پیاز ڈال کر ہلکا سا کچا پکا پکائیں۔ پھر اس میں گوشت ڈال دیں اور خوب بھونیں پھر دہی ـــــ میں تمام چیزیں ملا دیں اور یہ دہی اس میں ڈال دیں اور اس کو پکنے دیں۔ تھوڑا سا پریشر دیں۔ پھر اس کو بھون لیں اور اوپر سے کترا ہوا ہرا دھنیا' ہری مرچیں اس کے اوپر گرم مسالا ڈالیں اب یہ تیار ہے اسے مہمانوں کی خدمت میں پیش کریں نان کے ساتھ۔

(3) واقعی یہ سچ ہے کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ عورت پر ہی منحصر ہے کہ وہ کیسے اپنا کچن چمکا کر رکھتی ہے۔ میں روزانہ اپنا چولہا اچھی طرح صاف کرتی ہوں اور آٹھ سالوں کے بعد بھی وہ نئے کی طرح چمک رہا ہے۔ میرا کچن امریکن ٹائپ کا اوپن کچن ہے۔ میں اس میں ترتیب کا خیال رکھتی ہوں۔ ہفتہ وار صفائی کرتی ہوں۔ نیچے کیبنٹ کی بھی باقاعدہ صفائی کرتی ہوں۔ تب ہی یہ ہمیشہ صاف رہتے ہیں اور اس میں کیڑے مکوڑے بھی نہیں ہوتے ہیں رات کے کھانے کے بعد کچن کی صفائی اور برتن دھو کر لیٹتی ہوں۔

(4) تمام دن کے کھانے میں صبح کے ناشتے کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں پراٹھا بہت پسند کیا جاتا ہے اتوار کو میں پوری' حلوہ اور چنے خود ہی گھر میں تیار کرتی ہوں۔ کبھی کبھار باہر سے آتا ہے۔

پزا پراٹھا

اجزا :

انڈے	2عدد
پیاز	1عدد (چوپ کر لیں)
ہری مرچیں	3عدد (باریک کاٹ لیں)
دھنیا	تھوڑا کاٹ لیں
ٹماٹر	1عدد (چوپ کر لیں)
زیرہ پاؤڈر	1/2چائے کا چمچ
آٹا	پراٹھے بنانے کے لیے
گھی	پراٹھا تلنے کے لیے

ترکیب :

انڈے توڑ کر تمام چیزیں اس میں مکس کر لیں۔ پھر پراٹھا بنائیں۔ اس کو توے پر ڈالیں اور اوپر کے حصے پر انڈا والا مکسچر ڈال دیں اور اوپر گھی ڈال دیں اور پھر الٹ دیں۔ اور پھر الٹی سائیڈ پر گھی لگائیں اور تلیں۔ اس طرح آپ کا پزا پراٹھا تیار ہے جو آپ اپنے میاں صاحب اور بچوں کو لنچ میں دے سکتی ہیں ۔ وہ بہت پسند کریں گے۔

(5) پہلے کافی باہر جانا ہوتا تھا۔ مگر اب باہر کھانا کھانا بہت کم ہو گیا ہے پھر بھی بچوں کے ساتھ کبھی کبھار باہر جانا ہو جاتا ہے۔ شادی کی سالگرہ پر یا بچوں کی سالگرہ وغیرہ پر یا کوئی مدعو کرے تب۔

(6) جی ہاں! موسم کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ جب برسات ہو تو پکوڑے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ بیسن کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم' کھانے حلوہ جات بنائے جاتے ہیں۔

(7) کھانا ہمیشہ دل سے بنائیں ان شاء اللہ سب کو بہت پسند آئے گا۔ رہی بات محنت کی تو کھانا بنانے کے لیے محنت تو ضرور درکار ہوتی ہے۔ تھوڑی سی محنت' اور تھوڑا سا وقت درکار ہوتا ہے۔ مگر کھانا خوش ذائقہ بن جاتا ہے اور آپ کو پتا ہے کہ مزے دار کھانا سب پسند کرتے ہیں۔

(8) کھانا ہمیشہ بسم اللہ پڑھ کر پکانا شروع کریں۔ کھانے میں برکت بھی ہوگی اور اچھا بھی بنے گا۔ کھانا بنانے کے ساتھ ساتھ صفائی بھی کرتی جائیں چولہے کو کھانا بنانے کے بعد فوراً" صاف کر لیں۔ صاف ستھرا بھی رہے گا اور زیادہ محنت بھی نہیں درکار ہوگی۔ اندر کے کیبنٹ کو ہفتہ میں ایک بار صاف ضرور کر لیں کبھی بھی جھینگر یا کاکروچ نہیں ہوں گے۔ رات سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کچن کی صفائی کر کے بند کر دیں۔

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

روغن جوش

اجزا :

گوشت	1کلو
لہسن ٗادرک پیسٹ	2کھانے کے چمچے
سرخ مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	2کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	1کھانے کا چمچہ
زیرہ	1کھانے کا چمچہ
سونف	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
ٹماٹر پیسٹ	تین چوتھائی کپ
پیاز	3عدد بڑی
دہی	1کپ
ہرا دھنیا ٗپودینہ	حسبِ مرضی
ہری مرچ	3عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	تین چوتھائی کپ

ترکیب :

ایک کڑاہی میں تیل گرم کرکے اس میں لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں ٗ پھر اس میں سرخ مرچ ٗ پسا دھنیا ٗ گرم مسالا ٗ زیرہ اور سونف (کوٹ کر) ٗ نمک ٗ ٹماٹو پیسٹ ٗ دہی اور پیاز (براؤن کرکے چورا کر لیں) ڈال کر بھونیں۔ یہاں تک کہ مسالا یکجان ہو جائے۔ گوشت ڈال کر اچھی طرح مکس کریں پھر ڈھکن بند کرکے ہلکی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں۔ اس دوران وقفہ وقفہ سے چمچہ چلاتی رہیں تاکہ گوشت لگنے نہ پائے۔ گوشت گل جائے تو روغن اوپر آنے تک بھونیں ٗ پھر باریک کٹے ہوئے پودینے ٗ ہرے دھنیے اور ہری مرچیں چھڑک کر گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

جاپانی رائس

اجزا :

باسمتی چاول	1کلو
مچھلی	آدھا کلو

انڈے	3عدد
سرکہ	2کھانے کے چمچے
سویا ساس	1کھانے کا چمچہ
ہری پیاز	4عدد
لال اور ہری شملہ مرچ	2عدد
پسی سفید مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1کپ

مچھلی کو صاف کرکے کھال اور کانٹے الگ کرلیں، پھر قتلوں میں کاٹ کر بھاپ میں گلالیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کرکے مچھلی کے قتلے فرائی کرلیں، نمک، سرکہ اور سویا ساس ڈال کر تھوڑا سا پکائیں، پھر شملہ مرچ (بیج نکال کر چوکور کاٹ لیں) اور ہری پیاز (صرف پتے، رنگز میں کاٹ لیں) ڈال کر مکس کریں۔ تھوڑی دیر بعد انڈے پھینٹ کر ڈال دیں اور تیل اوپر آنے تک پکائیں۔

چاولوں کو نمک ڈال کر ابال لیں مگر پیچ نکالنے سے پانچ منٹ قبل اس میں چوکور کٹی ہوئی ہری شملہ مرچ اور رنگز میں کٹی ہوئی ہری پیاز ڈال دیں، پھر نتھار کر دم لگادیں۔ چاول والی ڈش میں چاروں طرف چاول ڈال کر بیچ میں مچھلی کا سالن ڈال دیں۔ منفرد سی ڈش گرم گرم پیش کرکے خوب داد پائیے۔

ویجی ٹیبل میکرونی

اجزا :

میکرونی	1پاؤ
مٹر	1پاؤ
گاجر	2عدد
آلو	1عدد (بڑا)
انڈے	2عدد
پسی سیاہ مرچ	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
تیل	2کھانے کے چمچے

میکرونی کو نمک ڈال کر ابال لیں۔ تمام سبزیوں کو بھی ہلکے پانی میں ابال لیں۔ خیال رکھیے گا کہ زیادہ نہ گل جائیں۔ آلو کو کیوبز کی شکل میں اور گاجر کے گول گول قتلے کاٹ لیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کرکے میکرونی اور سبزیاں ڈال کر ہلکا ہلکا چمچہ چلا کر مکس کریں، پھر انڈے میں ہلکا سا نمک اور پسی ہوئی سیاہ مرچ ڈال کر اتنا پھینٹ لیں کہ جھاگ بن جائے، میکرونی میں ملا کر ہلکے ہاتھ سے اچھی طرح مکس کریں۔ انڈے فرائی ہو جائیں تو اتار لیں۔ مزیدار ویجی ٹیبل میکرونی تیار ہیں۔

دودھ والاری

اجزا :

دودھ	2کلو
کسٹرڈ	4کھانے کے چمچے
جیلی	3پیکٹ (مختلف رنگ کے)
ربڑی	1پاؤ
خشک چم چم	1پاؤ
رنگین سویاں	1چھٹانک
چینی	3کھانے کے چمچے
بادام، پستہ	حسب ضرورت

دودھ کو چینی ڈال کر ابال لیں پھر اس میں کسٹرڈ ملا کر ایک ابال دے لیں اور فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

مختلف رنگوں کی جیلی الگ الگ پکا کر الگ الگ ہی جمالیں۔ فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کرلیں۔ پھر چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔

سویاں ابال لیں، نتھار کر الگ رکھ لیں۔

چم چم کو علیحدہ ایک پیالے میں تھوڑے سے دودھ میں بھگو دیں۔

اب فریج سے کسٹرڈ ملا دودھ نکال کر اس میں ربڑی ملالیں۔ چم چم کو دودھ سمیت اس میں شامل کردیں۔ سویاں اور جیلی کے ٹکڑے بھی اس میں ڈال دیں۔

آپ چاہیں تو اس میں موسمی پھل بھی شامل کرسکتی ہیں لیکن یہ خیال رکھیں کہ پھل رس دار نہ ہوں (یعنی کینو نہ لیں، سیب، انگور، کیلا، پائن ایپل لے لیں) پیش کرتے وقت بادام، پستے بھی شامل کرلیں۔

خبریں وبریں

تبصیر نشاط

مبارکاں!

مبارکاں... مبارکاں! ریما نے ”اسی سال“ شادی کرہی لی۔ ریما کے دولہا کا نام ڈاکٹر طارق شہاب ہے۔ ان کا تعلق کراچی سے ہے، مگر وہ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں، سو شادی کی تقریب بھی امریکہ میں ہی ہوئی۔ فلم ”دولہا لے کر جاؤں گی“ میں ریما گھوڑے پر چڑھ کر دولہا کو رخصت کرانے پہنچی تھیں، تاہم حقیقی زندگی میں ریما ہوائی جہاز پر سوار ہو کر شادی کرنے امریکہ پہنچیں۔ ویزا نہ ملنے کے سبب ریما کے والد اس شادی میں شریک نہ ہوسکے۔ (ہاں بھئی! شادی میں صرف دولہا، دلہن کی موجودگی ہی ضروری ہے نا۔) ریما کے والد کو تو ویزا ملا نہیں، مگر اداکارہ میرا اس تقریب میں بن بلائے پہنچ گئیں۔ (بن بلائے بھارت جا جا کر عادت پڑ گئی ہوگی نا۔) اور اپنی ساتھی اداکارہ کو اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔ (براہ کرام! اسے ”دعائیں“ ہی سمجھا جائے ”کوسنے“ نہیں۔)

ریما کی ساس نے انہیں ایک ملین ڈالرز کی مالیت کا مکان تحفے میں دیا ہے۔ (جسے ساس چاہے، وہی بہو۔) جبکہ ڈاکٹر طارق شہاب نے انہیں منہ دکھائی میں ایک بی ایم ڈبلیو کار اور بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی دی ہے۔ (ریما نے تحفے میں اپنی فلم ”لو میں گم“ پیش کی ہوگی۔)

ریما کی دیکھا دیکھی کئی اداکاراؤں نے اعلان کیا ہے کہ وہ بھی بہت جلد شادی کرلیں گی۔ ان میں اداکارہ مدیحہ شاہ، حنا شاہین، صلہ حسین شامل ہیں، جبکہ کئی لوگوں کے خیال میں اب ریشم، زما اور میرا کو بھی شادی کرہی لینی چاہیے۔

تبدیلی

گئے دنوں کی بات ہے کہ پاکستان فلم انڈسٹری کی رابطہ کمیٹی کے تحت منعقدہ ایک سیمینار میں معروف ہدایت کار و مصنف سید نور نے اپنی جذباتی تقریر میں اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ہم بھارتی فلموں کی نمائش بند کرا کے ہی دم لیں گے۔ یہی نہیں، انہوں نے اس سلسلے میں ارباب اختیار سے کئی ملاقاتیں بھی کی تھیں، مگر جناب! دن، وقت اور خیالات بدلتے دیر کہاں لگتی ہے بھلا۔

خبر آئی ہے کہ سید نور ایک بھارتی فلم کی ہدایات دے رہے ہیں۔ فلم کے پروڈیوسر بھارتی گلوکار دلیر مہدی ہیں۔ سنا ہے دلیر مہدی اپنے بیٹے کو بطور ہیرو متعارف کرانے کے لیے یہ فلم بنا رہے ہیں۔ سید نور ان دنوں اس فلم کی شوٹنگ کے لیے دبئی میں مقیم ہیں۔ (شاہ جی! اس بھارتی فلم کی نمائش کہاں ہوگی؟)

اس خبر کی تصدیق کے لیے جب اداکارہ صائمہ سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ۔

"شاہ جی نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پتا نہیں وہ انڈین فلم ہے بھی یا نہیں۔ یہ تو شاہ جی دبئی سے واپس آکر ہی بتائیں گے۔ میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔"

(جی ہاں! شاہ جی کی پرانی عادت ہے کہ وہ اپنی بیرونی مصروفیات سے اپنی "گھر والی" کو لاعلم ہی رکھتے ہیں۔)

گود بھرائی

ہالی ووڈ کے اداکار خبروں میں رہنے کے گر سے اچھی طرح واقف ہیں، سو وہ اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی انوکھی اور حیران کن حرکتیں کرتے رہتے ہیں، مگر جناب! ہماری وینا ملک بھی ان سے کچھ کم نہیں۔ وہ بھی آئے دن کوئی نہ کوئی "وکھری ٹائپ کی" حرکتیں کرتی رہتی ہیں۔

ہالی ووڈ میں بچے گود لینے کا فیشن ہے۔ اکثر اداکاروں نے اپنے بچے ہونے کے باوجود بھی کئی بچے گود لیے ہوئے ہیں۔ جیسے خبر آئی ہے کہ انجلینا جولی اور بریڈپٹ ساتواں بچہ گود لینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی تقلید میں وینا ملک نے بھی ایک بچی گود لی ہے۔ یہ ان کی دوسری بچی ہے۔ (بھئی! گود لی ہوئی) اس سے قبل وینا ملک نے پاکستان میں ایک بچہ بھی گود لے رکھا ہے۔ (اس سے پہلے وہ پاکستان میں تھیں نا!)

وینا نے ابھی جو بچی گود لی ہے، اس کا نام پائل کملے ہے۔ پائل کا تعلق بھارت سے ہے اور اس کی

عمر سات سال ہے۔ (کچھ یاد نہیں آرہا کہ وینا کے پہلے بھارت یاترا کو گزرے کتنے برس ہو گئے۔)

وینا کے بارے میں یہ اطلاعات بھی ہیں کہ وہ بھارت میں مستقل قیام کے لیے بھارتی حکام کو درخواست دینے کی تیاریاں بھی کر رہی ہیں۔ (وینا جی! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، لیکن عدنان سمیع اور راحت فتح علی خان کا انجام ذہن میں رکھیے گا، انڈیا والے ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس بھی لے لیتے ہیں۔)

جوڑ

اسٹیج اداکار افتخار ٹھاکر مزاحیہ اداکاری کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی فنی زندگی طویل جدوجہد سے عبارت ہے۔ تاہم اب ڈھلتی عمر میں قسمت اچانک ان پر مہربان ہو گئی ہے۔

ہوا کچھ یوں کہ سید نور نے انہیں اپنی فلم "وہٹی لے کے جانی اے" میں صائمہ کے مقابل ہیرو کاسٹ کر لیا۔ ٹھاکر کی خوش قسمتی سے فلم کامیاب ہو گئی، سو اب انہیں ایک کے بعد ایک فلموں کی آفرز ہو رہی ہیں۔ اپنی دوسری فلم "ٹھاکر 420" میں وہ نرگس کے مقابل ہیرو آ رہے ہیں۔ (مبارک ہو! فلم انڈسٹری کو بالآخر نرگس اور صائمہ کے جوڑ کا ہیرو مل ہی گیا۔)

* * *

[illegible]

عدنانہ

کیا آپ اپنی شکل و صورت کے بارے میں اکثر کڑھتی رہتی ہیں؟ اور بڑی حسرت آپ کو ہوتی ہے کہ اے کاش ممکن ہوتا کہ فلاں حسین عورت کی صورت سے اپنی صورت بدل لیتی؟ اگر ایسا ہے تو کڑھنا بند کر دیجیے۔ اور تاسف ان لوگوں پر کیجیے جن پر آپ کو رشک آیا کرتا ہے۔ کیونکہ اس خوب صورتی اور خوش روئی ہی کی بدولت ان کی زندگی زیادہ ابتلا و آلام کی زد میں ہے۔

یہ سچ ہے کہ خوب صورتی کی بدولت کسی کو "فتح یابی" کے فوائد اور خراج تحسین حاصل کرنے کے فوری مواقع بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن خوب صورت لڑکیوں کی زندگی ان کی جوانی میں اتنی تن آسانیوں، سہل انگاریوں کا مجموعہ بنا دی جاتی ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے ذوق و شوق سے تقریباً محروم ہو کر رہ جاتی ہیں اور نتیجتاً ان کا خاتمہ اکثر و بیشتر بے اثر یا ٹوٹی مری ہوئی سی شخصیتوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ زندگی کے شدید جھٹکوں اور جھگڑوں کو سنبھالنے کے لیے باطنی ذرائع اور سہارے ان میں کم ہی ہوتے ہیں۔

والدین کا رجحان یہ ہے کہ وہ اپنے سب سے زیادہ قبول صورت بچوں کو خزانہ بنا بنا کر رکھتے ہیں لیکن انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ خوش نصیبی کے ساتھ ساتھ ان پر یہ ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے کہ ان کے بچے اپنی ظاہری چمک دمک کی وجہ سے مقبول و محبوب ہونے کے بجائے اپنی شخصیتوں کی نمائش کے لیے طبعی مواقع حاصل کریں۔

ایک سمجھ دار اور ذہین عورت کا دھیان اچھی بیوی بننے کی طرف زیادہ رہے گا۔ خوشگوار اور پائیدار ازدواجی زندگی قائم کرنے کے اتفاقات، فطری حسن کے لیے اوسط سے پچیس فیصد کم ہی ہوتے ہیں۔ طلاق کی عدالتیں بیشتر حسن والوں ہی سے آباد رہتی ہیں اور تناسب آبادی کے لحاظ سے ان کی تعداد بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔

روزمرہ کے میل جول اور ربط و ضبط میں بھی حسن والوں کی راہیں کچھ بند سی رہتی ہیں۔ کسی خوب صورت عورت کی موجودگی میں مرد اکثر بے قراری سی محسوس کرتے ہیں کہ ان کو اپنی ان محرکات طبعی کی نشوونما کا موقع ہی بہت کم نصیب ہوتا ہے۔

* * *

کم ہمتی، تنک مزاجی، غصہ، خوف اور دل شکستگی بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہے۔ ان میں غصہ اور تنک مزاجی زیادہ ڈپریشن کے زمرے میں نہیں آتے۔ لیکن پھر بھی بعض دوسری باتیں مل کر یعنی اپنی کم ہمتی کی وجہ سے زبردستی کا غصہ، بات بات پر تلخی اور تنک مزاجی کو بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہی سمجھنا چاہیے۔ اس سے نجات حاصل کرنا قطعی طور پر آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ارادے باندھنا، ہمت کرنا اور اس پر عمل کرنا ڈپریشن کو شکست دینا ہے اور ایک واضح شکست دینے کا مطلب ہے کہ آپ نے ڈپریشن پر فتح حاصل کر لی اور اپنی زندگی کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کر لیا۔

ڈپریشن سے نجات کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ خود کو مصروف رکھیں۔ دوسروں میں دلچسپی لیں۔ ان سے محبت کریں، محبت کرنے والے لوگوں کو اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ دوسروں کی خوشیوں میں اپنی خوشیاں تلاش کرتے ہیں اور ان کے دل ہمیشہ سچی خوشی سے سرشار رہتے ہیں۔

ف۔ز

عزیز بہن! آپ کی دوست کا مسئلہ پڑھ کر دل کانپ اٹھا ہے۔ جس طرح مذہب کو مذاق بنایا گیا۔ اسے کسی طور جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے طلاق دینا، پھر حلالہ کرانے کے لیے نکاح کرانا۔ پھر طلاق اور شادی۔ اب یہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے کہ دیور سے حلالہ کیوں نہیں کیا گیا۔

صرف آپ کی سہیلی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی دوسری بڑی بہو کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا ہے۔ آپ کی سہیلی کا شوہر اب پھر طلاق کی دھمکیاں دیتا ہے، اسے اپنے بچوں کا بھی احساس نہیں ہے کہ ان پر برا اثر پڑتا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا مثبت حل بتائیں نہایت افسوس کے ساتھ کہ اس مسئلہ کا کوئی مثبت حل ممکن نہیں ہے۔ آپ کی سہیلی جن لوگوں میں بیاہ کر گئی ہے وہاں عزت غیرت کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

آپ کی سہیلی کو سوچنا چاہیے کہ اگر شوہر طلاق دے دے تو اسے کیا کرنا ہے۔ اندازہ تو یہی ہے کہ وہ صرف دھمکیاں دیتا ہے طلاق نہیں دے گا لیکن بالفرض محال ایسی کوئی صورت پیش آ جائے تو دوبارہ کسی حال میں بھی حلالہ یا شوہر سے رجوع کرنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔

ا۔

اچھی بہن! آپ کے والد کی خواہش ہے کہ آپ ڈاکٹر بنیں، ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آپ نے سائنس لی اور اپنی طرف سے پوری محنت بھی کی لیکن رزلٹ حسب توقع نہ آ سکا۔ اس کی وجہ سے آپ پریشانی کا شکار ہوئیں اور ہر وقت پڑھنے اور پریشان رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے ذہن پر اس کے اثرات ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ آپ بلاوجہ خوف کا شکار ہو گئیں۔ کسی نے آپ سے غلط کہا ہے کہ جانوروں اور پرندوں سے ڈرنے والے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ایک نارمل آدمی بھی جانوروں سے ڈرتا ہے۔ خصوصاً لڑکیاں تو کاکروچ اور چھپکلی سے بھی ڈرتی ہیں۔ کوئی کاکروچ قریب سے گزر جائے تو بے ہوش ہونے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ بات اپنے ذہن سے نکال دیں کہ آپ نفسیاتی مریض ہیں۔ آپ کو جو جسم پر کچھ رینگنے کا احساس ہوتا ہے وہ بھی ہر وقت پریشان کن سوچوں میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے ہے۔

دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ڈاکٹر بننے والے ہی ذہین ہوں۔ جس سبجیکٹ یا مضمون میں دلچسپی نہ ہو اس کو جبر کر کے پڑھا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ سائنس میں آپ کے اچھے نمبر نہیں آئے تو آرٹس لے لیں، آپ نے خود لکھا ہے کہ جب چھوٹی تھیں تو ہر کلاس میں پوزیشن لیتی تھیں۔ جب آپ آرٹس میں اچھے نمبر لیں گی تو جو لوگ آپ کی انسلٹ کرتے ہیں۔ وہ تعریف کریں گے۔

س ش۔ ملتان

آپ اس سے بدلہ لینے کے لیے جس چکر میں پڑ گئی ہیں اس سے باز آ جائیں۔ یہ سراسر تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔ آپ نے اسے گھر بلا کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ بچ گئیں، آئندہ ایسی غلطی نہ کریں۔ ضمیر کو مطمئن کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ آئندہ کے لیے توبہ کریں اور خدا سے دعا کریں کہ آپ کو راہ مستقیم پر چلائے۔

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

امت الصبور

بیوٹی بکس

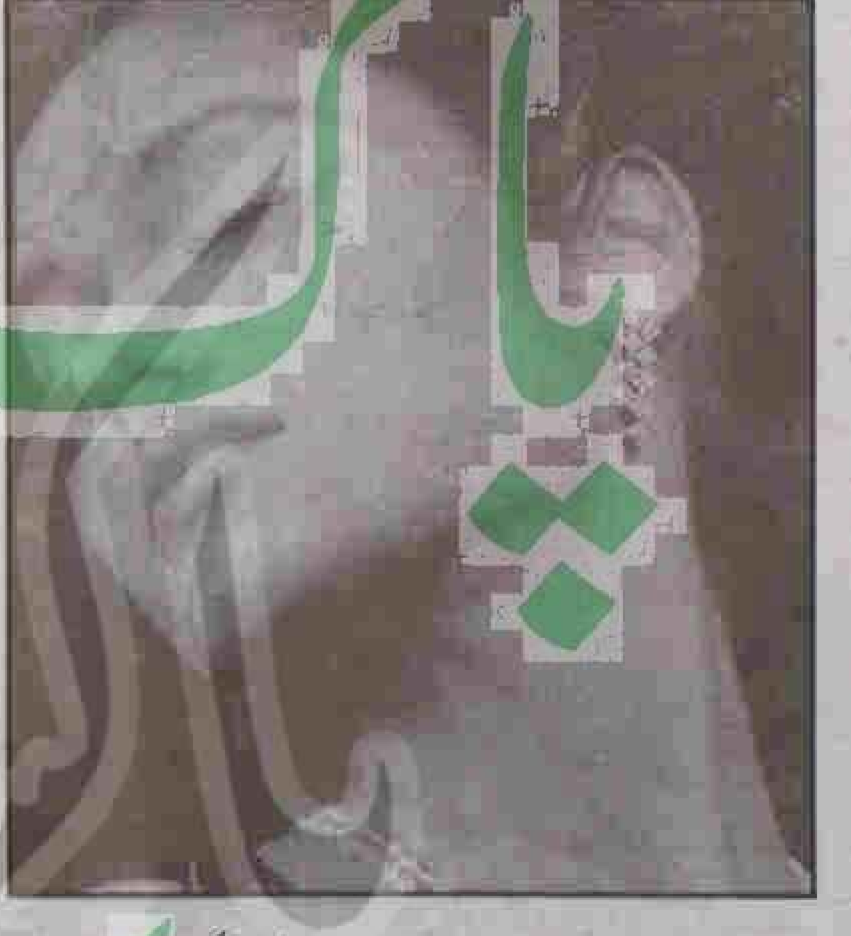

ہانیہ سعید... نامعلوم جگہ

س : میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بالوں میں بہت لیکھیں ہیں اور اس کے لیے میں نے بہت سے ٹوٹکے کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میری شادی ہونے والی ہے پلیز مجھے کوئی اچھا سا ٹوٹکا بتا دیں۔

ج : فنائل کی گولیاں باریک پیس کر سرسوں کے تیل میں ملائیں اور رات کو سونے سے پہلے اچھی طرح لگالیں۔ صبح سر دھولیں۔ بال سلجھا کر باریک کنگھی کریں۔ یہ عمل ہفتے میں دوبارہ کریں۔ ان شاء اللہ دو سے تین ہفتوں میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات مل جائے گی۔

نازیہ ارم... گوجرہ

س : باجی! میرے منہ پر بلیک ہیڈز بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ پھنسیاں بنتی ہیں اور نشان چھوڑ جاتی ہیں اور میرے چہرے پر بال بھی کافی ہیں۔ پلیز مجھے ان سب مسئلوں کے لیے کچھ بتائیں اور رنگت نکھارنے کے لیے بھی۔ میری جلد چکنی ہے میں بازار کی بنی ہوئی مصنوعات استعمال کر کے تنگ آچکی ہوں پلیز آپ کوئی سادہ سا نسخہ بتائیے۔ پلیز مجھے ان سب مسئلوں سے نجات دلا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میں بلیک ہیڈز کو جہاں سے دبا کر نکالتی ہوں وہاں پھنسی بن جاتی ہے۔ پلیز کچھ ایسا بتائیں کہ ان مسئلوں سے چھٹکارا مل جائے۔

ج : بلیک ہیڈز کے لیے ایک سخت ٹماٹر کاٹ کر پورے چہرے پر رگڑیں۔ ایک گھنٹے بعد منہ دھولیں۔

دانوں اور پھنسیوں یا رنگت نکھارنے کے لیے غیر معیاری کریمیں یا ادویات استعمال کرنے کے بجائے پھلوں اور سبزیوں سے علاج کریں۔

پھنسیاں عموماً" چکنی جلد پر نکلتی ہیں۔ آپ روزانہ دو مرتبہ بیسن سے منہ دھوئیں۔ بیسن جلد کی چکنائی جذب کر لیتا ہے۔ اس سے دانے نکلنا آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں۔ دانوں کو ہرگز مت چھیڑیں اور نہ ہی دبا کر ان کا مواد نکالنے کی کوشش کریں۔ ہاتھوں پر جراثیم ہوتے ہیں جو دانوں میں مزید انفیکشن پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں اور اسی وجہ سے دانے اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لیے دانے نکلنے اور ختم ہونے کے عمل میں مداخلت نہ کریں۔

رات کو سوتے وقت کچے دودھ میں ایک چٹکی نمک ملا کر روئی کے پھاہے سے چہرے پر مساج کریں۔ ایک مہینہ مسلسل یہ عمل کرنے سے چہرے کا رواں جھڑ جاتا ہے۔

یاد رکھیے! کوئی بھی چیز مستقل استعمال سے ہی فائدہ دیتی ہے۔ اس لیے اگر بہترین نتائج چاہتی ہیں تو کوئی بھی نسخہ کچھ عرصہ مسلسل استعمال کریں۔